

APPROVED

By WWW.ATTABLIG.COM at 8:56 am, Oct 26, 2010

تاریخ دعوت و عزیمت

حصہ اول

”یعنی پہلی صدی ہجری سے لے کر ساتویں صدی ہجری تک عالم اسلام کی اصلاحی و تجدیدی کوششوں کا تاریخی جائزہ، نامور صحابین اور ممتاز اصحاب دعوت و عزیمت کا مفصل تعارف، ان کے علمی کارناموں کی روداد اور ان کے اثرات و نتائج کا تذکرہ۔“

مولانا سید ابوالحسن علی حسینی ندوی

مجلس تحقیقات و نشریات اسلامیہ

APPROVED

By WWW.ATTABLIG.COM at 8:57 am, Oct 26, 2010

تاریخ دعوت و عزیمت

حصہ اوّل

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ



مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ

APPROVED

By WWW.ATTABLIG.COM at 8:57 am, Oct 26, 2010

تاریخ دعوت و عزیمت

حصہ اول

عربی کویت و بیروت متعدد ایڈیشن
انگریزی لکھنؤ دوسرا ایڈیشن
اردو لکھنؤ ۶ واں ایڈیشن
اردو کراچی متعدد ایڈیشن

اسی طرح ترکی اور فرنیچ زبانوں میں اشاعت ہو چکی ہے۔

جملہ حقوق محفوظ

جمادی الاولیٰ ۱۴۲۷ھ — جولائی ۲۰۰۶ء

نام کتاب — تاریخ دعوت و عزیمت (حصہ اول)

نام مصنف — مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی

صفحات — ۴۳۶

تعداد — ایک ہزار

قیمت — RS.100/-

طابع — کاوزی آفسیٹ پریس، لکھنؤ

ناشر — مجلس تحقیقات و نشریات اسلام

Post Box No. 119

Nadwatul Ulama

Lucknow.

Tel : 0522-2740539

Fax : 0522-2740806

e-mail : info@airpindia.com

فہرست

تاریخ دعوت و عزیمت

حصہ اول

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۳۴	حضرت عمر بن عبدالعزیز کی جانشینی	۹	دیباچہ طبع دوم
۳۵	خلافت کے بعد ان کی زندگی	۱۱-۱۶	پیش لفظ
۳۷	ان کی انقلابی اصلاحات		مقدمہ
۳۸	اعمال و اخلاق کی طرف توجہ		اصلاح و تجدید کی ضرورت اور تاریخ اسلام میں ان کا تسلسل
۳۹	تدوین علوم اور اجائے سنن	۱۷-۳۰	
۴۰	چند خطوط و فرامین		زندگی متحرک اور غیر پذیر ہے
۴۸	تبلیغ و اشاعت اسلام کی طرف توجہ	۱۸	امت اسلامیہ کا زمانہ سب سے زیادہ پُر از تغیرات ہے
۴۹	ان کی اصلاحات کے اثرات اور ان کا رد عمل	۱۸	اسلام کے بقا اور تسلسل کے لئے عیسوی انتظامات
۵۰	ان کی زندگی کا جوہر	۱۹	اسلام کے قلب و جگر پر حملے
۵۱	حضرت عمر بن عبدالعزیز کی وفات	۲۰	دوسرے مذاہب کی تاریخ میں تجدیدی شخصیتوں کی کمی
		۲۶	مذہب کو زندہ اشخاص کی ضرورت
		۲۷	ہرنے فتنے اور نئے خطرے کے لئے نئی شخصیت و طاقت
		۲۸	تاریخ کے گم شدہ مآخذ
		۲۹	اسلام کی میراث
			پہلی صدی کی اصلاحی کوششیں اور حضرت عمر بن عبدالعزیز
		۳۱	عہد اموی میں جاہلی رجحانات و اثرات
		۳۲	عہد اموی کی دینی شخصیتیں اور ان کا اخلاقی اثر
		۳۳	انقلاب حکومت کی ضرورت اس کی مشکلات
			دوسری صدی کی اصلاحی کوششیں اور حضرت حسن بصری
		۵۳	امت میں اخلاقی انحطاط اور ایمانی ضعف
		۵۴	تابعین کی دعوت ایمانی
		۵۵	حضرت حسن بصری
		۵۵	حسن بصری کی شخصیت ان کی داعیانہ صلاحیتیں
		۵۷	حسن بصری کے مواعظ
		۶۳	ان کی حق گوئی و میاکی
		۶۳	اسلامی حکومت میں "نفاق" اور منافقین

۶۵	نفاق و منافقین کی نشاندہی	۶۵	واقعہ کی تفصیلات امام احمد کی زبان سے
۶۷	حسن بصری کی وفات اور ان کی مقبولیت	۶۷	بے نظیر عمر، ہمت و استقامت
۶۷	انقلاب حکومت کی کوششیں	۶۷	امام احمد کا کارنامہ اور اس کا صلہ
			فتنہ الاعتزال اور ابوالحسن اشعری اور ان کے پیرو
			۶۹-۷۲
۶۹	خلافت عباسیہ اور دینی دعوت و تذکیر	۶۹	معتزلہ کا علمی اقتدار اور اس کے اثرات
		۷۰	سنت کے وقار کے لئے ایک بلند شخصیت کی ضرورت
			امام ابوالحسن اشعری
			امام ابوالحسن اشعری کا جذبہ تبلیغ و احتیاق حق
			ان کی ذہنی صلاحیتیں اور علمی کمالات
			ان کا مسلک اور ان کی خدمات
			ان کی تصنیفات
			عبادت و تقویٰ
			وفات
			امام ابو منصور ماتریدی
			اشعری حلقہ کے علماء اور ان کا علمی اثر
			علم کلام کا انحطاط فلسفہ اور باطنیت کا فروغ
			اور
			ایک نئے منظم کی ضرورت
			۱۱۹-۱۲۹
			علم کلام کا انحطاط و انحراف
			فلسفہ کا رواج
			فلسفہ یونان کے عرب ناقل و شارح
			جماعت اخوان الصفا اور اس کے رسائل
			معتزلہ و فلاسفہ کا فرق
			باطنیت کا فتنہ
			ظاہر و باطن کا مغالطہ
			نبوت مجددی کے خلاف بغاوت
			فلسفہ الہیات اور ذات و صفات کی بحثیں
			معتزلہ کا عروج
			امام احمد بن حنبل
			فتنہ خلق قرآن اور امام احمد بن حنبل
			۸۲-۱۰۲
			فلسفہ الہیات اور ذات و صفات کی بحثیں
			معتزلہ کا عروج
			امام احمد بن حنبل
			فتنہ خلق قرآن
			امام احمد ابتلاہ و امتحان میں

۱۹۶	بغداد کے دوداعی	۱۲۸	ایک نئی شخصیت کی ضرورت
حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی ^{رح} ۱۹۷-۲۲۲		امام غزالی ^{رح} ۱۳۰-۱۹۶	
۱۹۷	تعلیم و تکمیل	۱۳۰	تعلیم اور علمی عروج
۱۹۸	اصلاح و ارشاد اور رجوع عام	۱۳۱	گیارہ سال کی عمر نور دی اور اس کے تجربات
۱۹۸	محامد و اخلاق	۱۳۷	خلوت سے جلوت کی طرف
۲۰۱	مردہ دلوں کی مسیحائی	۱۴۱	امام غزالی کا تجدیدی کام
۲۰۲	تعلیمی مشاغل و خدمات	۱۴۱	فلسفہ پر عمل جراحی
۲۰۳	استقامت و تحقیق	۱۴۵	تہافت الفلاسفہ کا اثر
۲۰۴	تفویض و توجید	۱۴۵	باطنیت پر حملہ
۲۰۵	خلق خدا پر شفقت	۱۴۶	زندگی اور معاشرت کا اسلامی جائزہ
۲۰۶	حضرت شیخ کا عہد اور ماحول	۱۴۶	احیاء علوم الدین
۲۰۸	مواعظ و خطبات	۱۴۸	تعمیر و احتساب
۲۰۸	توحید خالص اور غیر اللہ کی بے حقیقتی	۱۴۹	علماء و اہل دین
۲۱۲	شکستہ دلوں کی تسکین	۱۵۶	حکام و سلاطین
۲۱۴	دنیا کی صحیح حیثیت	۱۶۲	مسلمانوں کے دوسرے طبقے
۲۱۵	خلفاء اور حکام وقت پر تنقید	۱۶۷	ایک اصلاحی و تربیتی کتاب
۲۱۷	دین کے لئے دل سوزی اور فکر مندی	۱۶۸	احیاء العلوم اور فلسفہ اخلاق
۲۱۸	بیعت و تربیت	۱۶۸	حب جاہ
۲۲۱	زمانہ پراثر	۱۷۷	محاسبہ نفس
۲۲۱	وفات	۱۸۲	احیاء کے ناقد
علامہ ابن جوزی ^{رح} ۲۲۵-۲۵۱		۱۸۴	امام غزالی اور علم کلام
		۱۸۷	تدریس کے لئے دوبارہ اصرار اور امام غزالی کی محدث
۲۲۵	ابتدائی حالات اور تحصیل علم	۱۸۹	بقیہ زندگی اور وفات
۲۲۶	کتابت حدیث میں انہماک	۱۹۰	امام غزالی کی دو ممتاز خصوصیتیں
۲۲۶	ذوق مطالعہ	۱۹۴	امام غزالی کا عالم اسلام پراثر
۲۲۷	تصنیف و تالیف اور تبحر علمی	۱۹۴	عمومی دعوت و تذکیر کی ضرورت و اصلاح عام اور بخدا کے الہی الہام
۲۲۷	تقویٰ اور ذوق عبادت	۱۹۵	داعی کی علمی صلاحیتیں

۲۲۹	فتح بیت المقدس	۲۲۹	ظاہری محاسن و اوصاف
۲۲۸	اسلامی اخلاق کا مظاہرہ	۲۲۹	بلند ہمتی اور جامعیت کا شوق
۲۲۹	صلیبی سیلاب	۲۳۲	محاسن و عطا و تاثیر
۲۳۰	صلح اور سلطان کے کام کی تکمیل	۲۳۳	ان کی ناقذانہ تصانیف
۲۳۳	وفات	۲۳۳	کتاب الموصوعات
۲۳۴	درویش سیرت سلطان	۲۳۴	تلبیس ابلیس
۲۳۷	محاسن اخلاق	۲۳۴	مختلف طبقات پر تنقید
۲۳۹	مردانہ اوصاف	۲۳۹	صید الخاطر
۲۸۱	علم و فضیلت	۲۴۰	عام واقعات سے بڑے بڑے نتائج
۲۸۲	فاطمی حکومت کا زوال اور سلطان صلاح الدین کا دوسرا کارنامہ	۲۴۲	واقعات زندگی اور نفس سے مکالمہ
شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام ^{رح} ۲۸۷-۳۰۲		۲۴۶	سلف صالحین کے حالات کے مطالعہ کی ضرورت
		۲۴۷	صلحی امت کی سیرت
		۲۴۷	تاریخ کی اہمیت
۲۸۷	علمی عظمت	۲۴۹	تاریخی تصنیفات
۲۸۹	سلاطین کو صلاح نیک اور مسلمانوں کی ضرورت	۲۵۰	ادبیت و خطابت
۲۹۱	بادشاہ شام کے مقابلہ میں جرأت و استقامت	۲۵۱	وفات
شیخ عزالدین مصر میں		نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی ^{رح} ۲۵۲-۲۸۶	
۲۹۳	شیخ کی حق گوئی و بیباکی	۲۵۲	صلیبی حملے اور عالم اسلام کے لئے نیا خطرہ
۲۹۵	فرنگیوں سے جہاد	۲۵۴	آتابک عماد الدین زنگی
۲۹۵	مصارف جہاد کے لئے شیخ کا انتظام	۲۵۵	الملك العادل نور الدین زنگی
۲۹۶	امراء سلطنت کا نیلام	۲۵۶	نور الدین کے محامد و اوصاف
۲۹۷	شیخ عزالدین اور سلاطین مصر	۲۵۹	شوق جہاد اور ایمان و یقین
۲۹۸	سکام اخلاق	۲۶۱	سلطان صلاح الدین ایوبی
۲۹۹	امراء المعروف اور نہی عن المنکر اور شیخ کا مسلک	۲۶۲	زندگی میں تبدیلی
۳۰۱	شیخ کی تصنیفات	۲۶۳	جہاد کا عشق
۳۰۲	شیخ کی وفات	۲۶۴	حطین کی فیصلہ کن جنگ
فقہ تاتار اور اسلام کی ایک نئی آزمائش ۳۰۳-۳۳۴		۲۶۵	سلطان کی دینی حیثیت
۳۰۳	تاتاری حملے اور اس کے اسباب		

دینا چہ طبع دوم

"تاریخ دعوت و عزیمت" حصہ اول کے دوسرے ایڈیشن پر نیا چیز مصنف کتاب اللہ تبارک و تعالیٰ کے حضور میں بہ ہزار زبان ثنا خواں اور پاس گزار ہے۔

اس حصہ کے دوسرے ایڈیشن کی نوبت کئی سال کے وقفہ کے بعد آ رہی ہے، لیکن اس کی وجہ کاتبوں کی نایابی، طباعت کی دشواریوں اور مصنف کی بڑھتی ہوئی مصروفیت کے سوا کچھ نہیں، ورنہ یہ کتاب برصغیر ہند کے علمی و دینی حلقوں میں جس طرح مقبول ہوئی، اور جس طرح اہل علم، اور اہل قلوب نے اس پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا، اور اس کے پہلے ایڈیشن کے ختم میں جتنا طویل عرصہ گزر چکا ہے، اس سب کا قدرتی تقاضا تھا کہ اس وقت تک اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہوتے، لیکن اردو کتابوں کی طباعت میں اب جو دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں، اور جن کا اندازہ کچھ مصنفین ہی کو ہے، انہوں نے اس کتاب کی اشاعت دوم میں غیر معمولی تاخیر پیدا کر دی، اس کے لئے مصنف کتاب متأسف بھی ہے، اور معذرت خواہ بھی۔

کتاب کے مضامین و مواد میں تعداد و عنوانات کے لحاظ سے کوئی بڑا اضافہ نہیں ہوا، لیکن جو کچھ ہوا وہ قسح اور قابل لحاظ ہے، اور اس سے کتاب کی قیمت و افادیت میں ضرور اضافہ ہوتا ہے، ان میں دو اضافے ضرور قابل ذکر ہیں، ایک عنوان "فتنہ تاتار اور اسلام کی ایک نئی آزمائش" کے تحت تاریخی حوالہ اور اس کے اسباب کے مضمون

کا اضافہ کیا گیا ہے، اس میں (مصنف کی معلومات کی حد تک) اس وقت کے عالم اسلام کے اخلاقی معاشرتی

۳۵۴	رفقار کے انتخاب کا سبب	۳۱۴	اسلام کے مشرقی ممالک تاتاریوں کی زد میں
۳۵۵	مولانا کی وفات	۳۱۴	بخدا کی تباہی
۳۵۷	اخلاق و خصوصیات	۳۲۲	تاتاریوں میں اسلام کی اشاعت
۳۵۷	ریاضت و مجاہدہ	مولانا جلال الدین رومیؒ ۳۳۵ - ۴۰۰	
۳۵۸	نماز کی کیفیت		
۳۵۹	زہد و قناعت	۳۳۵	علم کلام و عقلیت کا بحران
۳۵۹	قیاضی و ایثار	۳۳۷	صاحبِ دل حکم کی ضرورت
۳۵۹	بے نفسی اور قناعت	۳۳۷	مختصر حالات
۳۶۰	کسبِ حال	۳۳۸	خاندان اور والدین
۳۶۰	اہل دنیا سے کیسوی	۳۳۸	مولانا کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم
۳۶۰	مثنوی معنوی اور اس کا علمی اور اصلاحی مقام و پریشاں	۳۳۹	والد کی بلج سے ہجرت
۳۶۰	مثنوی معنوی	۳۴۰	مولانا قونیہ میں
۳۶۲	عقلیت و ظاہر پرستی پر تنقید	۳۴۱	آپ کے تعلیمی سفر اور مشاغل
۳۶۸	دعوتِ عشق	۳۴۳	انقلابِ حال
۳۷۳	جہانِ دل	۳۴۳	شمس تبریزی
۳۷۵	مقامِ انسانیت	۳۴۴	مولانا کی ملاقات اور تغیرِ عظیم
۳۷۹	دعوتِ عمل	۳۴۶	شورشِ عام
۳۸۲	عقائد و علم کلام	۳۴۶	شمس کی غیبت
۳۸۳	وجود باری	۳۴۷	مولانا کی بیقراری اور شمس کی واپسی
۳۸۶	نبوت اور انبیاء	۳۴۸	شمس کی دوبارہ غیبت
۳۸۹	معاد	۳۴۹	مولانا کی بیٹابی
۳۹۲	جبر و اختیار	۳۵۱	سفر شام اور سکونِ خاطر
۳۹۳	علت و معلول	۳۵۱	شیخ صلاح الدین زرکوب
۳۹۷	مثنوی کا اثر	۳۵۳	چلی حسام الدین
۴۰۱	اشاریہ (انڈکس) از محمد غیاث الدین ندوی	۳۵۴	مثنوی کی تحریک

دینی، روحانی اور سیاسی حالات کا پہلی مرتبہ جائزہ لیا گیا ہے اور اس فتنہ عالم آشوب اور طوفان بلاخیز کے

باطنی اور غیبی اسباب کو قرآن مجید کی مشعل ہدایت لے کر اور الہی قانون مجازاۃ کی مدد سے معلوم کرنے اور ان کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مواد اور وقت دونوں کی کمی اور مصنف کی بعض محدودیوں کی بنا پر اس باب میں اضافہ اور ترقی کی بڑی گنجائش ہے، لیکن یہ ایک ابتدائی کوشش اور ایسا ہی فکر و نظر کا ایک نمونہ ہے جس کو بہت آگے بڑھایا جاسکتا ہے، بایں ہمہ وہ اس موجودہ حالت میں بھی عبرت و بصیرت اور درس و موعظت سے خالی نہیں، دوسرا اضافہ مقدمہ کتاب میں دوسرے مذاہب کی تاریخ میں تجدیدی شخصیتوں کی کمی کے زیر عنوان کیا گیا ہے جس میں مسیحیت اور ہندومت کی اصلاح و تجدید کے بارے میں کچھ نئے معلومات کا اضافہ کیا گیا ہے، ان دو اضافوں کے علاوہ اس ایڈیشن میں صرف پہلے ایڈیشن کے اغلاط کی تصحیح اور قلیل التعداد جزوی ترمیمات ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مصنف کی یہ سعی مقبول ہو، اس سلسلہ کی ترتیب میں جو مقاصد پیش نظر رہے ہیں اور جن کا تذکرہ پیش لفظ میں کیا گیا ہے، ان کی تکمیل ہو۔

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ۔

الواکسن علی ندوی

دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی

۳۰ صفر المظفر ۱۳۸۹ھ
۲۱ اپریل ۱۹۶۹ء دو شنبہ

پیش لفظ

محرم ۱۳۷۲ھ میں لکھنؤ میں جماعت دعوت اصلاح و تبلیغ کی طرف سے انتظام کیا گیا کونفعا کے سامنے ضروری عنوانات اور پہلوؤں پر تقریریں کی جائیں اور ان کی واقفیت اور ذہنی تربیت کا سامان بہم پہنچایا جائے، ان تقریروں اور مضامین کا سلسلہ ایک ہفتہ جاری رہا، اس ترمیمی ہفتہ میں ایک طویل اور مسلسل عنوان اصلاح و تجدید کی تاریخ اور اس کی اہم شخصیتیں، تھا، یہ عنوان راقم سطور کے حصہ میں آیا تھا، اور تقریباً ایک ہفتہ اس موضوع پر عرض کیا جاتا رہا، اس وقت صرف ایک مختصر یادداشت سامنے ہوتی تھی جس میں کچھ عنوانات اور اشارے ہوتے تھے، اجاب اس کا خلاصہ اپنے طور پر محفوظ کر لیتے تھے۔

بعد میں اشاعت کی نیت سے جب اس پر نظر ڈالی تو محسوس ہوا کہ یہ کام بڑی توجہ اور اطمینان سے کرنے کا ہے اور یہ ایک اہم تاریخی موضوع ہے جس پر ہمارے محدود علم کے مطابق کوئی مفصل اور مکمل چیز موجود نہیں، اور یہ تاریخ اسلام اور ادبیات اسلامیہ کا ایک بڑا خلا ہے جس کو جلد پر ہونا چاہیے، اس خلا کے موجود ہونے کی وجہ سے اچھے اچھے سنجیدہ حلقوں میں یہ خیال قائم ہو چکا ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ میں اصلاح و تجدید اور انقلاب حال کی کوشش مسلسل اور غیر منقطع طور پر نہیں پائی جاتی، بلکہ اس میں بڑے طویل طویل خلا ہیں، جو صدیوں پر پھیلے ہوئے ہیں، کئی کئی سو برس کے بعد کچھ شخصیتیں ابھرتی رہی ہیں، جنہوں نے حالات سے کشمکش کی اور

جو فکری اور عملی حیثیت سے کوئی ممتاز مقام رکھتی ہیں، ورنہ عام طور پر متوسط درجہ کے لوگ نظر آتے ہیں، جو فکری اور عملی

حقیقت سے عمدانخطاط کی عام سطح سے بلند نہیں تھے اور جن کے علمی و عملی کارناموں میں کوئی جدت اور ندرت نہیں پائی جاتی صرف چند گئی چنی شخصیتیں (جن کی تعداد ۷-۸ سے زیادہ نہیں سمجھی جاتی) اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں۔

یہ بات دیکھنے میں بڑی معمولی معلوم ہوتی ہے، مگر اس کے نتائج بڑے اہم اور دور رس ہیں، یہ اسلام کی اندرونی طاقت و صلاحیت سے ایک طرح کی بدگمانی اور بالواسطہ ہے جو ہر زمانہ میں ضرورت کے آدمی اور اہل دعوت و غربت کو پیدا کرتی رہی ہے اور جس کی نظیر کسی دوسرے مذہب اور قوم میں نہیں ملتی، یہ ایک حساس کہتری اور ذہنی شکست خوردگی ہے جس کی کوئی علمی بنیاد نہیں۔

لیکن یہ نتیجہ بے سبب نہیں بدقسمتی سے تاریخ اسلام کے وسیع ذخیرہ میں یا تو وہ کتابیں ملتی ہیں، جن کو واقعات کی "فہرست" کہنا صحیح ہے اور جن کی مرکزی شخصیت بادشاہوں کی ذات ہے یا چند نمایاں شخصیتوں کی سوانح (تراجم و تذکرے) مگر اسلام اور مسلمانوں کی کوئی مسلسل فکری اور اصلاحی تاریخ نہیں، جن میں ان تمام شخصیتوں کی تحریکوں کا تعارف ہو، جنہوں نے عالم اسلام پر گہرا اثر ڈالا ہے اور اسلام کی بروقت حفاظت یا تجدید و تقویت کی خدمت انجام دی ہے، غلط رجحانات کی اصلاح اور فتنوں کا سدباب کیا ہے اور اسلام کے فکری اور علمی ذخیرہ میں کوئی قابل قدر اضافہ کیا ہے، درحقیقت اسلام کے سلسلہ دعوت و اصلاح میں خلا نہیں، تاریخ اسلام کی ترتیب و تالیف میں خلا ہے، اس خلا کا پر کرنا وقت کا ایک ضروری کام اور ایک اہم دینی و علمی خدمت ہے۔

اس کام کی تکمیل سے نہ صرف اصلاح و دعوت کی تاریخ مرتب ہو جائے گی، بلکہ ضمناً مسلمانوں کی فکری و علمی انخطاط و ارتقاء کی تاریخ بھی وجود میں آجائے گی۔

لیکن جب اس موضوع پر قلم اٹھایا گیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک مقالہ یا رسالہ کا مضمون نہیں ہے، یہ ایک اہم اور ضخیم تصنیف کا موضوع ہے، اس کے لئے تاریخ کو دوبارہ پڑھنا ہوگا، اور اس کو ایک خاص انداز سے مرتب کرنا ہوگا، اس کے لئے صرف تاریخ عام کا جائزہ لینا کافی نہ ہوگا، بلکہ مذاہب و فرق، علوم و فنون کی تاریخ اور تراجم و تذکرے

کی کتابوں کو اس نظر سے دیکھنا ہوگا، واقعہ یہ ہے کہ یہ مضمون جس سکون و اطمینان اور فرصت کا طالب ہے، وہ اس

پریشان اوقات کی زندگی میں بہت کیاب ہے، پھر بھی ضرورت کے احساس نے اس موضوع پر قلم اٹھانے پر مجبور کیا اور طبیعت کی افتاد سرسری طور پر گزرنے سے مانع ہوئی۔

یہ بات ناظرین کرام کے پیش نظر رہے کہ اس کتاب میں ہمیں اصطلاحی تجدید سے بچنا نہیں ہے، نہ ان اشخاص کا تعین کرنا ہے، جو اس منصب کے اہل ہو سکتے ہیں، اور جن کی واحد ذات نے دینی انقلاب برپا کر دیا، اور تجدید کے شرائط پورے کئے، یہاں ہمیں اسلام کی تیرہ سو برس کی تاریخ میں اصلاح و انقلاب حال کی کوششوں کے تسلسل کو دکھانا ہے اور ممتاز شخصیتوں اور تحریکوں کی نشان دہی کرنی ہے، جنہوں نے اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق دین کے احیاء اور تجدید اور اسلام اور مسلمانوں کی حفاظت کے کام میں حصہ لیا ہے اور جن کی مجموعی کوششوں سے اسلام زندہ اور محفوظ شکل میں اس وقت موجود ہے، اور مسلمان اس وقت ایک ممتاز امت کی حیثیت سے نظر آتے ہیں، اس مضمون میں متعدد ایسے اشخاص کا تذکرہ آئے گا، جو انفرادی طور پر تو مجدد نہیں کہے جاسکتے، مگر دین کی تجدید و احیاء اور اصلاح و انقلاب کے مجموعہ میں ان کا ضرور حصہ ہے، اور مسلمان ان کے احسان سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

اس کتاب کی تالیف کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے:-

(۱) کسی دعوت یا شخصیت کے حالات و مقاصد معلوم کرنے کے لئے عموماً خود اس کی تصنیفات، تحریروں اور اقوال سے مدد لی گئی ہے، اگر اس میں پوری کامیابی نہیں ہوئی، اور خلا رہ گیا، تو اس کے رفقاء و تلامذہ اور معاصرین کی تصنیفات و بیانات کو ترجیح دی گئی ہے، آخری صورت میں بعد کے مستند ماخذوں پر اعتماد کیا گیا ہے، اس بارے میں کسی زبان یا زمانہ کی تخصیص نہیں، جہاں کوئی کام کی بات دیکھی گئی، اخذ کی گئی، اور اس کا حوالہ دے دیا گیا۔

(۲) شخصیتوں کی سیرت اور تذکرہ کے سلسلہ میں ان کے گرد و پیش، اس زمانہ کی علمی و فکری سطح، اور کام کے میدان کی وسعتوں کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی گئی ہے، تاکہ ان شخصیتوں کی صحیح عظمت اور ان کی کامیابی کی مقدار کا تعین ہو سکے، اور اس دور اور ماحول کی کامیابی کے امکانات کا صحیح اندازہ کر کے ان کو تاریخ میں صحیح مقام دیا جاسکے، کسی شخصیت کو اس کے ماحول سے نکال کر اپنے ماحول میں لاکر اپنے زمانہ کے سپانوں اور تقاضوں اور اپنے

ذاتی رجحانات اور خواہشات کے معیار سے جانچنا پھر اس معیار کے لحاظ سے اس کی کوتاہیوں اور فرورگذاشتوں کو نمایاں کرنا ظاہری نگاہ میں ایک بڑا تنقیدی کارنامہ معلوم ہوتا ہے جس سے کتاب سطحی النظر لوگوں کی نگاہ میں وزنی اور وقیح بن جاتی ہے، لیکن اہل نظر سمجھتے ہیں کہ یہ ایک بڑی نا انصافی اور کوتاہ نظری ہے، اس لئے کہ آدمی اپنے زمانہ کی ضرورتوں اور تقاضوں اور اس عہد کے میدان عمل کے حدود کے لحاظ سے کامیاب و ناکامیاب کہا جاسکتا ہے، ورنہ عظیم سے عظیم شخصیت دوسرے زمانہ اور ماحول کے لحاظ سے اور مورخ کے رجحانات اور خیالات کے پیمانہ سے سخت ناکام ثابت کی جاسکتی ہے، اور نہ صرف اسلامی تاریخ، بلکہ انسانی تاریخ کی بھی کوئی شخصیت کامل اور معیاری قرار نہیں دی جاسکتی۔

(۳) کسی صاحب دعوت یا مصنف اور مفکر کی کتابوں کے چند مختصر اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا نہیں کی گئی کہ اس سے اس کے مقاصد، اس کے علمی مرتبہ اور اس کے ذہن کا اندازہ صحیح طور پر نہیں ہو سکتا، اور قارئین اس کا لطف صحبت اور شرف ملازمت حاصل نہیں کر سکتے، اس کتاب میں ممتاز صاحب دعوت، مصلحین، مصنفین اور اصحاب فکر کی تصنیفات و خطابات کے اتنے مختلف اور مبسوط اقتباسات دیئے گئے ہیں کہ پڑھنے والا محسوس کرے گا کہ اس کا کچھ وقت ان کی صحبت میں گزرا، اور اس کو اطمینان کے ساتھ "دید و شنید" کا موقع ملا ہے، اس کے لئے خود مولف کتاب نے اپنے وقت کا ایک معتدبہ حصہ ان حضرات کی تصنیفات و مواعظ، اور ان کے علمی و فکری آثار کے ماحول میں گزارا اور کوشش کی ہے کہ ان کا تذکرہ اور تعارف کرنے کے زمانہ میں وہ اپنا وقت خالص اسی ماحول میں گزارے اور ان اثرات و کیفیات کو اپنے اوپر طاری ہونے کا موقع دے، جو ان کے معاصرین اور ہمنشینوں پر طاری ہوتی تھیں، اسی کا نتیجہ ہے کہ قارئین مختلف شخصیتوں کے بارے میں مولف کتاب کا قلبی رجحان صاف معلوم کر سکیں گے، اور ان کو زبان میں بھی تغیر اور صاحب ترجمہ کی زبان و ادب سے مناسبت نظر آئے گی، یہ بات اگر کسی نقاد کی نگاہ میں قابل اعتراض اور کتاب کی کمزوری شمار کئے جانے کے قابل ہے، اور اس کے نزدیک مورخ کو اپنے قلم کی طرح "چوب خشک" اور ناقل بے ضمیر ہونا چاہئے تو مصنف اس کمزوری کا اعتراف کرتا ہے، اور اس کے لئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

(۴) تاریخی شخصیتوں کے صرف علمی کمالات، تحقیقات اور تصنیفات کے اقتباسات پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ ان کی زندگی کے باطنی پہلو، تعلق مع اللہ اور اخلاقی خصوصیات کو بھی نمایاں کیا گیا ہے کہ اولاً تو یہ تقدیر اہل دعوت و اہل فکر کی مشترک خصوصیت ہے کہ وہ اپنے علمی کمالات اور عملی انہماک کے ساتھ عبادت و انابت الی اللہ کا ذوق خاص رکھتے تھے، اور ان کی کامیابی و مقبولیت میں اس کو خاص دخل ہے، اور اس کے تذکرہ کے بغیر ان کا تذکرہ نامکمل رہتا ہے، دوسرے اس ضخیم تصنیف اور تاریخ کے اس وسیع دفتر کے پڑھنے والے کا یہ حق اور اس کی محنت اور دقت کا یہ خاموش مطالبہ ہے کہ وہ اس سے صرف تاریخی معلومات ہی اخذ نہ کرے، بلکہ قلب و روح کی تازگی اور ذوق عمل کا حصہ بھی پائے۔

(۵) کسی شخصیت کے تعارف کے سلسلہ میں صرف اس کے فضائل و کمالات بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اگر اس کے منصف و محتاط معاصرین یا صاحب نظر متاخرین نے اس پر یا اس کی تصنیفات و افکار پر تنقید کی ہے، تو اس کا بھی تذکرہ کر دیا گیا ہے، اور اگر اس کا جواب دیا گیا ہے، اور اس کی طرف سے دفاع کیا گیا ہے، تو اس کو بھی پیش کر دیا گیا ہے، لیکن تاریخ کو ناقدانہ تالیف ثابت کرنے کے لئے بے ضرورت تنقید نقل کرنے کا اہتمام نہیں کیا گیا۔

یہ کتاب کی پہلی جلد ہے، پہلے خیال تھا کہ یہ جلد شیخ الاسلام ابن تیمیہ پر تمام ہوگی، اس طرح اس حصہ میں پہلی صدی ہجری سے لے کر آٹھویں صدی ہجری تک کی تاریخ دعوت و عزیمت اور اصلاح و تجدید کی روداد آجاتی لیکن ابن تیمیہ کا تذکرہ (ان کے زمانہ کی اہمیت اور ان کے کام کی وسعت کی بنا پر) اتنا مبسوط ہو گیا کہ اس کو کتاب کا ایک مستقل حصہ بنا نا پڑا، جو اس سلسلہ کی دوسری جلد ہوگی، کتاب کا تیسرا حصہ (اور شاید چوتھا بھی) ہندوستان کے اہل دعوت و عزیمت کے ساتھ مخصوص ہوگا، جو پچھلی صدیوں میں عالم اسلام میں اصلاح و تجدید کے علمبردار اور فکر و تحقیق کا منبع و سرچشمہ تھے۔

آخر میں مولف کو صاف اعتراف ہے کہ اس کتاب کے لئے جتنی طویل مدت تصنیف، جیسا سکون خاطر،

جتنا وسیع و عمیق مطالعہ اور جیسا وسیع اور متنوع علم درکار ہے، مصنف اس سے بہرہ مند نہیں، لیکن جو کچھ بھی اس عرصہ اور ان حالات میں ہو سکا، اور جو ناظرین کے سامنے ہے، وہ مصنف کی پریشان خاطرگی، انتشار ذہنی اور علمی بے بضاعتی کے پیش نظر محض تائید الہی اور توفیق خداوندی ہے، وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ۔

ابواکھسن علی ندوی

داۓرہ حضرت شاہ علم الترائے بریلی

۲۴ ربیع الاول ۱۳۷۵ھ

مقدمہ

اصلاح و تجدید کی ضرورت اور تاریخ اسلام میں ان کا تسلسل

زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے

اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام ہے اور کامل و مکمل طور پر دنیا کے سامنے آچکا ہے اور اعلان کیا جا چکا ہے کہ

الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَمَّمْتُ عَلَيْكُمْ

نِعْمَتِي وَرَضَيْتُ لَكُمْ الْإِسْلَامَ دِينًا

آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور دین کی حیثیت سے اسلام کو تمہارے لئے پسند کر چکا۔ (المائدہ - ۳)

ایک طرف تو اللہ کا دین مکمل ہے، دوسری طرف حقیقت ہے کہ زندگی متحرک اور تغیر پذیر ہے اور اس کا

شباب ہر وقت قائم ہے۔ ع

جاوداں پیہم دواں ہر دم جواں ہے زندگی

اس رواں دواں اور سداجواں زندگی کا ساتھ دینے اور اس کی رہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے آخری طور پر

جس دین کو بھیجا ہے، اس کی بنیاد اگرچہ "ابدی عقائد و حقائق" پر ہے، مگر وہ زندگی سے پڑھے اور حرکت اس کی

رگ و پے میں بھری ہوئی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ ہر حال میں دنیا کی رہنمائی کر سکے، اور

ہر منزل میں تغیر پذیر انسانیت کا ساتھ دے سکے، وہ کسی خاص عہد کی تہذیب یا کسی خاص دور کا فن تعمیر نہیں ہے، جو

اس دور کی یادگاروں کے اندر محفوظ ہوا اور اپنی زندگی کھو چکا ہو، بلکہ ایک زندہ دین ہے، جو عظیم و حکیم صلح کی صنعت کا

APPROVED

By WWW.ATTABLIG.COM at 8:58 am, Oct 26, 2010

ذَلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ (الانعام ۱۲) یہ ہے اندازہ غالب اور علم رکھنے والے کا۔

صُنِعَ اللَّهُ الَّذِي اَتَقَفَّ كُلَّ شَيْءٍ (النمل ۸۸) کارگیری اللہ کی جس نے ہر چیز کو محکم کیا۔

اُمّتِ اسلامیہ کا زمانہ سب سے زیادہ پُر از تغیرات ہے

یہ دین چونکہ آخری اور عالمگیر دین ہے، اور یہ امتِ آخری اور عالمگیر اُمّت ہے، اس لئے یہ بالکل قدرتی بات ہے کہ دنیا کے مختلف انسانوں اور مختلف زمانوں سے اس امت کا واسطہ ہے گا، اور ایسی کشمکش کا اس کو مقابلہ کرنا ہوگا جو کسی دوسری امت کو دنیا کی تاریخ میں پیش نہیں آئی، اس امت کو جو زمانہ دیا گیا ہے، وہ سب سے زیادہ پُر از تغیرات اور پُر از انقلابات ہے، اور اس کے حالات میں جتنا تنوع ہے، وہ تاریخ کے کسی گذشتہ دور میں نظر نہیں آتا۔

اسلام کے بقا اور تسلسل کے لئے غیبی انتظامات

ماحول کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لئے اور مکان و زمان کی تبدیلیوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لئے دو انتظامات فرمائے ہیں، ایک تو یہ کہ اس نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسی کامل و مکمل اور زندہ تعلیمات عطا فرمائی ہیں، جو ہر کشمکش اور ہر تبدیلی کا باآسانی مقابلہ کر سکتی ہیں، اور ان میں ہر زمانہ کے مسائل و مشکلات کو حل کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے، دوسرے اس نے اس کا ذمہ لیا ہے، (اور اس وقت کی تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے) کہ وہ اس دین کو ہر دور میں ایسے زندہ اشخاص عطا فرماتا ہے، جو ان تعلیمات کو زندگی میں منتقل کرتے رہیں گے، اور مجموعاً یا انفراداً اس دین کو تازہ اور اس امت کو سرگرم عمل رکھیں گے، اس دین میں ایسے اشخاص کے پیدا کرنے کی جو صلاحیت و طاقت ہے، اس کا اس سے پہلے کسی دین سے اظہار نہیں ہوا، اور یہ امت تاریخ عالم میں

(جیسی "مردم خیز" ثابت ہوئی ہے، دنیا کی قوموں اور امتوں میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، یہ خاص اتفاقی بات نہیں ہے)

بلکہ انتظامِ خداوندی ہے کہ جس دور میں جس صلاحیت و قوت کے آدمی کی ضرورت تھی اور زہر کو جس "تربیاق" کی حاجت تھی، وہ اس امت کو عطا ہوا۔

اسلام کے قلب و جگر پر حملے

شروع ہی سے اسلام کے قلب و جگر اور اس کے اعصاب پر ایسے حملے ہوئے ہیں کہ دوسرا مذہب ان کی تاب نہیں لاسکتا، دنیا کے دوسرے مذاہب جنہوں نے اپنے اپنے وقت میں دنیا فتح کر لی تھی، اس سے کم درجہ کے حملوں کو سہارہ سکے، اور انہوں نے اپنی ہستی کو گم کر دیا، لیکن اسلام نے اپنے ان سب حریفوں کو شکست دی، اور اپنی اصلی شکل میں قائم رہا، ایک طرف باطنیت اور اس کی شاخیں، اسلامی روح، اور اس کے نظام عقائد کے لئے سخت خطرہ تھیں، دوسری طرف مسلمانوں کو زندگی سے بے دخل کرنے کے لئے صلیبیوں کی یورش اور تاتاریوں کا حملہ بالکل کافی تھا، دنیا کا کوئی دوسرا مذہب ہوتا تو وہ اس موقع پر اپنے سارے امتیازات کھودیتا، اور ایک تاریخی داستان بن کر رہ جاتا، لیکن اسلام ان سب داخلی و خارجی حملوں کو برداشت کر لے گیا، اور اس نے نہ صرف اپنی ہستی قائم رکھی بلکہ زندگی کے میدان میں نئی نئی فتوحات حاصل کیں، تحریفات، تاویلات، بدعات، عجمی اثرات، مشرکانہ اعمال و رسوم، مادیت، نفس پرستی، تعیشات، الحاد و لادینیت اور عقلیت پرستی کا اسلام پر بار بار حملہ ہوا، اور کبھی کبھی محسوس ہونے لگا کہ شاید اسلام ان حملوں کی تاب نہ لاسکے، اور ان کے سامنے سپردال دے، لیکن امت مسلمہ کے ضمیر نے صلح کرنے سے انکار کر دیا، اور اسلام کی روح نے شکست نہیں کھائی، ہر دور میں ایسے افراد پیدا ہوئے، جنہوں نے تحریفات و تاویلات کا پرہ چاک کر دیا، اور حقیقت اسلام اور دینِ خالص کو اجاگر کیا، بدعات اور عجمی اثرات کے خلاف آواز بلند کی، سنت کی پُر زور حمایت کی، عقائدِ باطلہ کی بے باکانہ تردید اور مشرکانہ اعمال و رسوم کے خلاف علانیہ جہاد کیا، مادیت اور نفس پرستی پر کاری ضرب لگائی، تعیشات اور اپنے زمانہ کے "مترفین" کی سخت مذمت کی، اور جاہر سلاطین کے سامنے

اپنے منکر دو ہتھکڑوں اور مستغنی آسودہ حال اور فلان ابال لوگوں کو قرآن مجید "مترفین" کے لفظ سے یاد کرتا ہے۔

تکڑی بلندی، عقلمندی پرستی کا طلسم توڑا، اور اسلام میں نئی قوت و حرکت اور مسلمانوں میں نیا ایمان اور نئی زندگی پیدا کر دی۔ یہ افراد داعی علمی، اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اپنے زمانہ کے ممتاز ترین افراد تھے اور طاقتور اور دلآویز شخصیتوں کے مالک تھے، جاہلیت اور ضلالت کی ہر نئی ظلمت کے لئے ان کے پاس کوئی نہ کوئی "یدربضیا" تھا جس سے انھوں نے تاریکی کا پردہ چاک کر دیا، اور حق روشن ہو گیا، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس دین کی حفاظت اور بقا منظور ہے اور دنیا کی رہنمائی کا کام اسی دین اور اسی امت سے لینا ہے اور جو کام وہ پہلے تازہ نبوت اور انبیاء سے لیتا تھا اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نائبین اور امت کے مجددین و مصلحین سے لے گا۔

دوسرے مذاہب کی تاریخ میں تجدیدی شخصیتوں کی کمی

اس کے برخلاف دنیا کے دوسرے مذاہب میں ایسی ہستیوں کی نمایاں کمی نظر آتی ہے، جو ان مذاہب میں نئی روح اور ان کے ماننے والوں میں نئی زندگی پیدا کر دیں، ان کی تاریخ میں صدیوں اور ہزاروں برس کے ایسے خلا نظر آتے ہیں جن میں اس دین کا کوئی مجدد دکھائی نہیں دیتا، جو اس دین کو تحریفات و بدعات کے زرعہ سے نکالے، اس کی حقیقت واضح کرے، اصل دین اور حقیقت ایمان کی طرف پوری قوت سے دعوت دے، رسوم کے خلاف پُر زور صدائے احتجاج بلند کرے، مادیت و نفس پرستی کی تحریک و رجحانات کے خلاف جہاد کرنے کے لئے کمر بستہ ہو کر میدان میں آجائے اور اپنے یقین، سچی روحانیت اور قربانیوں سے اس مذہب کے پیروؤں میں نئی روح اور نئی زندگی پیدا کر دے۔

اس کی سب سے بڑی مثال مسیحیت ہے، وہ اپنے عہد کے آغاز یعنی پہلی صدی مسیحی کے نصف ہی میں ایسی تحریف کا شکار ہوئی، جس کی نظر اس دور کی تاریخ مذاہب میں کہیں نہیں ملتی، وہ ایک صاف اور سادہ توحیدی مذہب سے ایک ایسے مشرک مذہب میں تبدیل ہو گئی، جس کو یونانی اور بودھ افکار و خیالات کا مجموعہ کہا جاسکتا ہے، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس کے سب سے بڑے داعی اور پیرو سینٹ پال (۱۰-۶۵ء) کے ہاتھوں ہوا، یہ تبدیلی دراصل ایک روح سے

دوسری روح، ایک شکل سے دوسری شکل اور ایک نظام سے دوسرے نظام کی طرف ایسی جست یا چھلانگ کے مترادف تھی، جس میں

پہلی شکل سے صرف نام اور بعض رسوم کا اشتراک باقی رہ گیا تھا، ایک مسیحی فاضل (ERUSET DE BUNSEN) اس تغیر و انقلاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"جس عقیدہ اور نظام کا ذکر ہمیں انجیل میں ملتا ہے، اس کی دعوت حضرت مسیح نے اپنے قول و عمل سے کبھی نہیں ہی تھی اس وقت عیسائیوں اور یہودیوں و مسلمانوں کے درمیان جو نزاع قائم ہے اس کی ذمہ داری حضرت مسیح کے سر نہیں ہے بلکہ یہ سب اس یہودی عیسائی بے دین پال کا کرشمہ ہے، نیز صحیح مفہوم کی تشکیل جو مسیح کے طریقہ پر تشریح اور ان صحیفوں کو پیش گوئیوں اور مثالوں سے بھر دینے کا نتیجہ ہے، پال نے اسٹیفن (STEPHEN) کی تقلید میں جو مذہب یسانی (ESSENI) کا داعی ہے، حضرت مسیح کے ساتھ بہت سی بودھ رسوم و البتہ کر دیں، آج انجیل میں جو متضاد کہانیاں اور واقعات ملتے ہیں، اور جو حضرت مسیح کو ان کے مرتبہ سے بہت فروتر شکل میں پیش کرتے ہیں، وہ سب پال کے وضع کئے ہوئے ہیں، حضرت مسیح نے نہیں، بلکہ پال اور ان کے بعد آنے والے پادریوں اور راہبوں نے اس سارے عقیدہ و نظام کو مرتب کیا ہے، جس کو آرتھوڈوکس مسیحی دنیا نے اٹھارہ صدیوں سے اپنے عقیدہ کی اساس قرار سے رکھا ہے!"

مسیحیت نے طویل صدیوں تک اور آج بھی پال کی اس روح اور اس کے ورثہ کو سینہ سے لگائے رکھا، اور اس پوری مدت میں مسیحی دنیا میں کوئی ایسا آدمی پیدا نہیں ہوا، جو مسیحیت کے اس بیرونی مستعار اور غیر حقیقی نظام کے خلاف علم بغاوت بلند کرے، اور اس لفظ کی طرف واپسی کی کوشش کرے، جس نقطہ پر حضرت مسیح اور ان کے مخلص خلفاء اور تبعین چھوڑ کر گئے تھے، صدیوں پر صدیاں بیت گئیں، اور کوئی ایسا شخص پیدا نہ ہوا، جو مسیحیت کے ان نئے اور بیرونی اجزاء کو علیحدہ کر سکے، آخر کار پندرہویں صدی مسیحی میں مارٹن لوتھر (M. LUTHER) جرمنی میں پیدا ہوا، اور اس نے بعض جزئی مسائل میں کچھ محدود قسم کی اصلاح کی، یہ کوئی جوہری یا عمومی اصلاح نہ تھی، اور نہ مسیحیت کے غلطی اور اس کے انحراف کے خلاف کوئی بغاوت، گویا مسیحیت کی تاریخ کی تقریباً پندرہ صدیاں انقلاب انگیز بنیادی اور کامیاب اصلاح مذہب کی تحریکوں سے خالی رہیں اور اس عرصہ میں کوئی کوشش بھی پورے طور پر بار آور اور نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی، مسیحی

فضلاً کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ اس طویل مدت میں سچی دنیا میں کوئی شخصیت یا تحریک رونما نہیں ہوئی جو مسیحیت کی اصلاح یا تجدید میں نمایاں کامیابی حاصل کر سکے۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار (J. BASSMULLINGER) لکھتا ہے :-

”اگر ہم اس کے اسباب تلاش کریں کہ سوہویں صدی سے قبل اصلاح مذہب (ریفارمیشن) کی کوششوں میں تیزی

کامیابی کیوں نہ ہوئی تو باکسی دشواری کے کہہ سکتے ہیں کہ سب سے بڑا سبب قرون وسطیٰ کے ذہن کی ماضی کی مثالوں کی غلامی تھی“

دوسری جگہ لکھتا ہے :-

”یہ سچ کے اصلاح کی کوئی جامع تجویز دینے کا رولنے کی ان کی مسلسل کوششوں کی ناکامی یورپین تاریخ کی ایک جانی بوجھی

حقیقت ہے“

یہی مقالہ نگار آگے لکھتا ہے :-

”سوہویں صدی سے قبل اصلاح مذہب کی چند نہیں متعدد اور بعض بہت یادگار قسم کی کوششیں کی جا چکی تھیں،

لیکن بلا استثناء ان سب کو کلیسا کی لعنت و ملامت کا شکار ہو جانا پڑا تھا“

اس کے بعد کوئی دوسرا شخص ایسا پیدا نہیں ہوا جو کلیسا کے خرافات و اوہام اور اس کی زبردستیوں کے

خلاف اپنی آواز بلند کرتا، اور کم از کم اتنا ہی کرتا جتنا لو تھر نے (اپنے مخصوص دائرہ عمل اور کمزوری کے باوجود) کیا تھا۔

غرض اس طرح مسیحیت اس راستہ پر مسلسل چلتی رہی جس کو اس نے اپنے لئے انتخاب کیا تھا، یا زیادہ صحیح الفاظ

میں اس کے سرخو پ دیا گیا تھا، کلیسا کا اثر کم بڑ گیا، اور بعد میں اس کا اقتدار بالکل ختم ہو گیا، یورپ میں مادیت کی

حکومت قائم ہوئی، اور اس نے اس اصل مذہب کی جگہ لے لی، اور مغرب کے ہر مذہب کو اس نے اپنے پیچھے چھوڑ دیا، اور

مسیحیت میں کوئی ایسا انسان پیدا نہ ہو سکا، جو اس مادیت کا مقابلہ کرتا، اور اس کو اپنے صحیح مرکز پر واپس لاتا، یا

عیسائیوں میں اپنے مذہب پر اعتماد کو بحال کرتا، ان سب میں وہ روحانی و اخلاقی قوت پیدا کرتا جو ان کو مادیت کے

ان زبردست تھپیڑوں اور ایمان سوز ترغیبات کے سامنے ثابت قدم رکھ سکے، اور ان کو ایسی زندگی گزارنے پر

مجبور کر سکے، جو علم و اخلاق اور صحیح عیسائی عقائد پر قائم ہو، اور جہاں نئے زمانہ کے سوالات، عصر جدید کے مسائل

کا حل اس کی روشنی میں ممکن ہو، اس کے برعکس یہ ہوا کہ عیسائی مفکرین، مصنفین مسیحیت کے مستقبل سے خود مایوس

ہو گئے، اور لادینی مادیت کے مقابلہ میں ان کے اندر احساس کہتری پیدا ہو گیا۔

یہی قصہ مشرق کے مذاہب کے ساتھ بھی پیش آیا، ہندو مذہب بھی اپنی اصل راہ سے بالکل ہٹ گیا، اس نے

اپنی سادگی اور خالق کائنات سے براہ راست روحانی نسبت بالکل کھودی، اخلاقی قوت بھی مفقود ہو گئی، اور اپنی

پیچیدگی کی وجہ سے وہ محض ایک دقیق اور غیر عملی فلسفہ بن کر رہ گیا، اور رفتہ رفتہ عقائد میں توجید خالص اور معاملات

میں مساوات دونوں اہم چیزوں کا سرشتہ اس کے ہاتھ سے بالکل چھوٹ گیا، اور یہی وہ دو اہم بنیادیں تھیں جن پر

کوئی ایسا مذہب قائم ہو سکتا ہے جس کی جڑیں باطن میں مضبوط ہوں، اور شاخیں ظاہر میں پھیلی ہوئی ہوں۔

اپنی شکر کے مصنفین نے بہت کوشش کی کہ اس فساد کا تدارک کریں، چنانچہ انھوں نے ان رسوم کو جو ہندو مذہب

اور ہندو سماج پر پوری طرح چھا گئی تھیں، مسترد کر دیا، اور اس کی جگہ ایک ایسے فلسفیانہ اور تصوراتی نظام کو پیش کیا، جو

کثرت میں وحدت کے نظریہ پر قائم تھا، یہ نئی تصویر ہندو مذہب کے علمی حلقوں میں توجہ و پسند کی گئی، اس لئے کہ ان کا

رجحان شروع ہی سے وحدۃ الوجود ہمہ اوست کی طرف تھا، لیکن عوام نے جن کی فکری سطح پست تھی، اور جو علمی نظام اور

عملی تعلیمات کے خواہشمند تھے، اس بات کو قبول نہ کیا، اور اس طرح ہندو مذہب رفتہ رفتہ اپنی قوت و تاثیر کھوتا رہا،

اس کی طرف سے بے اعتمادی اور بے اطمینانی روز بروز بڑھنے لگی، ہندو سماج کی یہی بے اطمینانی اور بے یقینی تھی جس نے

آگے چل کر بودھ کی شخصیت میں جنم لیا، یہ مرحلہ چھٹی صدی قبل مسیح میں سامنے آیا۔

بودھ نے ایک نیا فکر یا ایک نیا مذہب (اگر اس موقع پر لفظ مذہب کا استعمال درست ہو) پیش کیا جو ترک

یونیا، تہذیب نفس، خواہشات سے مقابلہ، رحم دلی و ہمدردی، خدمت و عمل اور رسوم و عادات اور طبقاتی کشمکش

کی تردید و مخالفت پر قائم تھا، جو ہندو سماج میں آخر زمانہ میں بہت نمایاں ہو گئی تھی، یہ فکر یا یہ مذہب بہت سرعت کے ساتھ پھیلا اور ایشیا کے جنوبی اور شرقی حصہ پر جو بکر ہند اور بکر الکابل کے درمیان واقع ہے، اس کا تسلط قائم ہو گیا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد یہ زبردست مذہبی تحریک بھی اپنے راستے سے ہٹ گئی، اور تحریف کا شکار ہو گئی، موزنیا اور رسوم وغیرہ جن کے خلاف اس مذہب نے علم بغاوت بلند کیا تھا، اس پر پھر سے حملہ آور ہوئے، یہاں تک کہ اس کے آخر دور میں وہ بھی شرک اور مورتی پوجا کا مذہب بن کر رہ گیا، جو اپنے پیشرو ہندو مذہب سے مورتیوں کی اقسام اور ان کی تعداد کے سوا کسی اور چیز میں مختلف اور بہتر نہ تھا، اس کی اخلاقیات کو بھی زوال ہوا، افکار و خیالات میں سچیدگی اور بڑھ گئی، نئے نئے فرقے اور مذہبی گروہ قائم ہو گئے، پروفیسر ایشوراٹو اپنی کتاب "ہندوستانی تمدن" میں لکھتے ہیں:-

"بودھ مت کے سایہ میں ایسی حکومت قائم ہوئی جس میں اوتاروں کی بھرا مار اور مورت پرستی کا دور دورہ دکھلانی دینے لگا، سنگھوں کی فضا بدل رہی تھی، اس میں بدعتیں اور بدعتیں کے بعد دیگرے نظر آرہی تھیں۔"

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب "تلاش ہند" (DISCOVERY OF INDIA) میں بودھ مت کے بگاڑ اور تدریجی زوال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"برہمنیت نے بودھ کو اوتار بنایا، اور بودھ مت نے بھی یہی کیا، سنگھ بہت دوہمند ہو گئے، اور ایک خاص عبادت کے مفاد کے مرکز بن کر رہ گئے، اور ان میں ضبط و قاعدہ بالکل نہیں رہا، عبادت کے طریقوں میں سحر اور اوہام داخل ہو گئے، اور ہندوستان میں ایک ہزار سال تک باقاعدہ رائج رہنے کے بعد بودھ مت کا تزلزل شروع ہو گیا، اس عہد میں اس کی جو مریضانہ کیفیت تھی، (MRS. RHYS DAYIS) نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:-

"ان مریضانہ خیالات کے گہرے سایہ میں اگر گوتم کی اخلاقی تعلیم نظر سے اوجھل ہو گئی، ایک نظر یہ پیدا ہوا اور اس نے فروغ پایا، اس کی جگہ دوسرے نے لی اور ہر ایک قدم پر ایک نیا نظریہ پیدا ہونے لگا، یہاں تک کہ ساری فضائیں

لے بودھ مت کے لئے لفظ مذہب کے استعمال میں مجھے تردید اس لئے ہے کہ اس میں خالق اور مبداء و معاد کے سلسلے میں کوئی عقیدہ یا نظریہ نہیں ملتا، اور اکثر مصنفین و مؤرخین کی یہی رائے ہے، دیکھئے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا لفظ بودھ (BUDDHA)۔

ذہن کی ان پُر فریب تخلیقوں سے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا اور بانی مذہب کے سادہ اور بلند اخلاقی درس ان الہیاتی مویشکافیوں کے انبار کے نیچے دب کر رہ گئے۔"

مجموعی حیثیت سے بودھ مت اور برہمنیت دونوں میں گراؤٹ پیدا ہو گئی، اور ان کے اکثر بتدریجی رسم داخل ہو گئیں، دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہو گیا، اس وسیع بودھ دنیا میں اور اس کی حکمرانی کی اس دور میں کوئی ایسا مصلح سامنے نہ آیا، جو حقیقی بودھ مت کی طرف دعوت دے اور اس جدید اور منحرف مذہب کا پوری قوت کے ساتھ مقابلہ کرے، اور اس کا گذشتہ دور شباب اور اس کی گم شدہ سادگی اور صفائی پھر سے واپس لے آئے۔"

غرض قدیم ہندو مذہب بودھ مت کے سامنے بالکل پنیپ نہ سکا، یہاں تک کہ آٹھویں صدی مسیحی میں شکر آچاریہ نے بودھ مت کی مخالفت اور قدیم ہندو مذہب کی اشاعت کا علم بلند کیا، اور آخر کار اس کو اس ملک سے تقریباً باہر ہی کر دیا، یا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی حیثیت ہندوستان کے بہت سے مذاہب میں ایک قدیم رُو بزوال اور محدود مذہب کی رہ گئی، شکر آچاریہ نے اپنی ذہانت مذہبی جرات اور جوش عمل سے یہ تو کیا کہ بودھ مت کو بالکل زندگی سے بے دخل کر دیا، لیکن وہ اس باب میں کامیاب نہ ہوئے (بلکہ شاید اس کا انھوں نے سرے سے ارادہ ہی نہیں کیا تھا) کہ قدیم ہندو مذہب کو اس کی پہلی اور حقیقی شکل پر واپس لے آئیں، اس میں توحید کا عقیدہ، خالق کائنات براہ راست اتصال، بندہ اور خدا کے درمیان واسطوں کی نفی، اجتماعی انصاف اور طبقاتی مساوات کی رُوح پیدا کریں، چنانچہ آج تک یہ دونوں ہندوستانی مذاہب اپنی بدلی ہوئی ہئیت پر قائم ہیں، اور دور انحطاط کی میراث رسوم و عادات اور مورتیوں کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں، مذاہب و اخلاق کے انسائیکلو پیڈیا (ENCYCLOPAEDIA OF RELIGION AND ETHICS) کے مقالہ نگار (V.S. GHATE) جو الفسٹن کا بھائی ہیں سنسکرت کے پروفیسر تھے اور ہندوستان کے قدیم مذاہب و فلسفوں پر گہری نظر رکھتے ہیں، شکر آچاریہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد اس نظام مذہب اور فلسفہ کا زندہ کرنا تھا، جس کی "اوپنیشید" میں تعلیم دی گئی ہے،

تلاش ہندس ۲۰۳، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱

اس نے مطلق وحدۃ الوجود کے عقیدہ کو رائج کر دیا، اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ وہ یہ بتائے کہ "اوپنشیڈ" اور جگوت گیتا میں قانون پیش نہیں کیا گیا ہے، بلکہ مکمل وحدۃ الوجود کی تعلیم ہے، شکر آچاریہ نے بت پرستی کی زخما لغت کی اور نہ حملہ کیا، اس کے نزدیک بت ایک رمز اور مظہر ہیں، شکر آچاریہ نے رسمیت (RITUALISM) اور کرما کی مذمت کی، لیکن مقبول عام دیوتاؤں کی پرستش کی طرف سے مدافعت کی، اپنے نشوونما کی ایک خاص منزل میں بت پرستی ہماری فطرت کی ایک ضرورت ہے، جب مذہبی روح پختہ اور بالغ ہو جاتی ہے تو پھر بت پرستی کی ضرورت نہیں رہتی ہے، علامتوں اور رموز کو ترک کر دینا چاہئے، جب مذہبی روح پختہ اور بالغ ہو جاتی ہے، شکر نے بتوں کی اجازت دی، بحیثیت ایک علامت کے ان لوگوں کے لئے جو ایسے برہمنوں کے مرتبے تک نہیں پہنچ سکے، جو صفات سے آزاد اور ناقابل تبدیل ہوں۔

بہر حال وہ تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں، جو شکر آچاریہ سے لے کر دیانند سرسوتی اور گاندھی جی تک کی گئیں، اور جن کا مقصد اس مذہب کا اس کی ان صحیح بنیادوں پر اچھا بنانا، جو نبوت کی دعوت انسان کی فطرت سلیم اور تعزیر پذیر عہد رس کے ساتھ ہم آہنگ ہو، ان دونوں مذاہب نے آخر کار مادیت و لادینیت کے سامنے بالکل سپردال دی ہے اور زندگی سے کنارہ کش ہو کر عبادت گاہوں اور تیرتھ گاہوں میں پناہ لی ہے، اور رسوم و عادات اور ظاہری اشکال میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں، ہندوستان میں اس وقت کوئی ایسی طاقتور دعوت نہیں جس کا نعرہ اور جس کا منشور یہ ہو (پھر سے مذہب کی طرف آؤ) اس کے برعکس ایسی تحریکیں بہت بیدار اور طاقتور ہیں، جن کا نعرہ اور اصول یہ ہے کہ اپنی پرانی تہذیب کو زندہ کرو، اور ہندوستان کی قدیم تاریخی زبان "سنسکرت" کو پھر سے ملک میں رائج کرو۔

مذہب کو زندہ انشخاص کی ضرورت

دراصل کوئی مذہب اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتا، ان خصوصیات کو زیادہ دنوں تک برقرار نہیں

لے ماخوذ از مقالہ شکر آچاریہ باختصار و انتخاب ملاحظہ ہو۔

رکھ سکتا، اور بدلتی ہوئی زندگی پر اثر نہیں ڈال سکتا، جب تک وقتاً فوقتاً اس میں ایسے انشخاص نہ پیدا ہوتے رہیں جو اپنے غیر معمولی یقین، روحانیت، بے غرضی و ایثار اور اپنی اعلیٰ داعی اور قلبی صلاحیتوں سے اس کے تن مردہ میں زندگی کی نئی روح بھونک دیں، اور اس کے ماننے والوں میں نیا اعتماد اور جوش اور قوت عمل پیدا کر دیں، زندگی کے تقاضے ہر وقت جواں ہیں، مادیت کا درخت سدا بہار ہے، نفس پرستی کی تحریک اور اس کے مذہب کو حقیقتہً کسی تجدید کی ضرورت نہیں کہ اس کی ترغیبات اور اس کے محرکات قدم قدم پر موجود ہیں، پھر بھی اس کی تاریخ اس کے پرجوش داعیوں اور کامیاب مجددوں سے کبھی خالی نہیں رہی، جنہوں نے اس کی جواں کو قائم اور اس کی دعوت کو اس وقت تک زندہ رکھا ہے۔ ع

اگرچہ پیرے مومن جواں ہیں لات و منات

اس کا مقابل جب ایک نئی زندگی اور نئی طاقت کے ساتھ میدان میں نہیں آئے گا، اور وقتاً فوقتاً اس کی تجدید نہیں ہوتی ہے، تازہ دم مادیت کے مقابلہ میں اس کا زندہ رہنا مشکل ہے۔

ہرنے، فتنہ اور نئے خطرے کے لئے نئی شخصیت و طاقت

اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اسلام کے اس طویل اور پُر آشوب تاریخ میں کوئی قلیل سے قلیل مدت ایسی نہیں پائی جاتی، جب اسلام کی حقیقی دعوت بالکل بند ہو گئی، حقیقت اسلام بالکل پردہ میں چھپ گئی ہو، امت اسلام کا ضمیر بالکل بے حس ہو گیا ہو، اور تمام عالم اسلام پر اندھیرا چھا گیا ہو، یہ تاریخی واقعہ ہے کہ جب کبھی اسلام کے لئے کوئی فتنہ نمودار ہوا، اس کی تحریک اور اس کو مسخ کرنے کی کوششیں کی گئی، یا اس کو غلط طریقہ پر پیش کیا گیا، مادیت کا کوئی سخت حملہ ہوا، کوئی طاقتور شخصیت ایسی ضرور میدان میں آگئی جس نے اس فتنہ کا پوری طاقت سے مقابلہ کیا، اور اس کو میدان سے ہٹا دیا، بہت سی دعوتیں اور تحریکیں ایسی ہیں، جو اپنے وقت میں بڑی طاقتور تھیں، لیکن آج ان کا وجود صرف کتابوں میں رہ گیا ہے، ان کی حقیقت کا سمجھنا بھی آج مشکل ہے، کتنے آدمی ہیں، جو قدرت، جہیت، اعتراف، خلق قرآن

وحدۃ الوجود اور اکبر کے دین الہی کی حقیقت اور تفصیلات سے واقف ہیں، حالانکہ یہ اپنے اپنے وقت کے بڑے اہم عقائد و مذاہب تھے، ان میں سے بعض کی پشت پر بڑی بڑی سلطنتیں تھیں، اور اپنے زمانہ کے بعض بڑے ذہین اور لائق اشخاص ان کے داعی اور علمبردار تھے، لیکن بالآخر حقیقت اسلام نے ان پر فتح پائی، اور کچھ عرصہ کے بعد یہ زندہ تحریکیں اور سرکاری مذہب علمی مباحث بن کر رہ گئے، جو صرف علم کلام اور تاریخ عقائد کی کتابوں میں محفوظ ہیں، دین کی حفاظت کی یہ جدوجہد، تجدید و انقلاب کی کوشش اور دعوت و اصلاح کا یہ سلسلہ اتنا ہی پرانا ہے، جتنی اسلام کی تاریخ، اور ایسا ہی سلسلہ ہے، جیسی مسلمانوں کی زندگی۔

تاریخ کے گم شدہ مآخذ

لیکن اس کی ذمہ داری صرف مورخین پر عائد نہیں ہوتی، اس کے ذمہ دار وہ تمام لوگ ہیں، جو تاریخ کی اصطلاحی اور سرکاری حیثیت کے سوا کوئی اور حیثیت ماننے پر تیار نہیں، اور کسی ایسی کتاب کو لائق اعتبار نہیں سمجھتے جو کسی کتب خانہ میں تاریخ کی الماری کے اندر نہ ہو، یا فن تاریخ کے تحت درج نہ ہو، حالانکہ ایسی بہت سی کتابیں اپنے اندر تاریخ کا بہت قیمتی ذخیرہ رکھتی ہیں، اور ان کو بہت اہم مآخذ قرار دیا جاسکتا ہے، یہ وہ ادبی اور دینی کتابیں ہیں، جن میں ان داعیوں اور مصلحین امت نے اپنی دلی احساسات و کیفیات کو بے نقاب کیا ہے، اور اپنی زندگی کے اہم واقعات اور تجربے درج کئے ہیں، یہ وہ کتابیں ہیں جن میں شاگردوں اور مریدوں نے اپنے اساتذہ و شیوخ کے نصائح و ملفوظات اور حقائق و معارف قلم بند کئے ہیں، اور ان کی پڑاؤ اور بابرکت مجلسوں کی روکدائش کی ہے، یہ مکتوبات اور مواظبات کے وہ مجموعے ہیں جن سے ان کے خیالات و افکار اور جذبات و کیفیات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، یا وہ کتابیں جو احتساب سوسائٹی پر تنقید اور بدعات و منکرات کے رد و ابطال میں لکھی گئی ہیں، اگر ہمارا مطالعہ اپنی مقرر کردہ حدود سے آگے بڑھ کر ان اہم اور گم شدہ تاریخی مآخذ تک وسیع ہو سکتا اور کوئی وسیع النظر نگاہ رس اور باہمت محقق اس موضوع پر جم کر کام کر سکتا تو ایک مربوط و مکمل تاریخ اصلاح و تجدید پیش کرنے میں کامیاب ہو جاتا، اور ہمیں صاف نظر آتا کہ

دعوت و عزیمت دونوں چیزیں اس امت کے ہر دور اور ہر مرحلہ میں اس کا ساتھ دیتی رہیں، اور انہوں نے کبھی اس کو مایوس اور محروم نہیں کیا۔

اسلام کی میراث

یہ میراث جو ہمارے ہاتھ میں پہنچی (اور جس کو ہم میراث) کے معنی میں نہیں بول رہے ہیں، جو اہل مغرب کا مفہوم ہے، اس لئے کہ اسلام ایک زندہ جاوید دین ہے، ہم میراث سے وہ دولت اور ثروت مراد لیتے ہیں، جو ہمارے اسلاف سے ہماری طرف منتقل ہوئی ہے، علم راسخ، محفوظ و مضبوط عقائد، طاقتور ایمان، سنت سنیت، اخلاق عالیہ، فقہ و شریعت اور شاندار اسلامی ادب کی ثروت، اس میراث میں ہر اس فرد کا پورا حصہ ہے، جس نے اسلام کے کسی دور میں کبھی منہاج خلافت پر حکومت قائم کی، جاہلیت اور مادیت کا مقابلہ کیا، اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی، اسلام کے خصائص مٹ گئے، تھے، ان کو اجاگر کیا، امت میں ایمانی روح پیدا کی، اس لازوال ثروت میں ہر اس شخص کا اضافہ تسلیم کیا جائے گا، جس نے اس دین پر اس کے مآخذ اور اس کی تعبیرات پر اعتماد کو از سر نو استوار کیا، نوادہ فلسفوں کا ابطال کیا، اسلام کی حقیقی فکر کی حفاظت کی، اور اس... امت کو کسی نئے فتنہ میں پڑنے سے باز رکھا، جس نے اس امت کے لئے اس کے دین اور مصادر دین کی حفاظت کی، حدیث و فقہ کی تدوین جدید کا کام انجام دیا، اجتہاد کا دروازہ کھولا، اور امت کو تشریح کا خزانہ عامہ اور زندگی و معاشرہ کا منظم قانون عطا کیا، جس نے معاشرہ میں احتساب کا فرض ادا کیا، اور اس کے انحراف اور کج روی پر کھل کر تنقید کی، اور صحیح حقیقی اسلام کی بر ملا و آشکارا دعوت دی، جس نے شکوک و شبہات کے دور اور اضطراب عقائد کے زمانہ میں علمی طرز استدلال اختیار کر کے دماغوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی، اور ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی، جس نے دعوت و تذکیر اور انذار و تبشیر میں انبیاء علیہم السلام کی نیابت کی، اور ایمان کی دلی ہوئی چنگاریوں کو شعلہ جوالہ کی حرارت و حرکت بخشی، جس نے مادہ پرستی کے تند و تیز دھار کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی تیزی و بلاخیزی کم کی، اور خدا کی مخلوق کو اس دھارے میں بہ جانے یا اس میں دب جانے

سے محفوظ رکھا جس نے اس امت کی سیاسی قوت کی حفاظت کی اور اس کو پے در پے خارجی حملوں کو سہار لینے کی قوت عطا کی جس نے اپنی حکیمانہ دعوت اور اپنے دامِ محبت سے اس دشمن کو شکا کر کیا، جو زورِ شمشیر اور نوکِ خنجر سے بھی زیر نہ ہو سکا تھا، اور جس نے عالمِ اسلام کو اس سرے سے اس سرے تک زیر و زبر کر کے رکھ دیا تھا جس نے اپنے طاقتور ایمان اور اپنی روحانی قوت سے ایسے دشمنوں کو حظیرہٴ اسلام میں داخل کیا اور محمد عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی غلامی کا شرف بخشا، جس نے اپنے طاقتور ادب اور دل گداز و مبلغِ اشعار سے ان ذہنوں کو اسیرِ دام کیا، جو علمی جہت اور مذہبی فلسفوں سے مطمئن ہونے والے نہیں تھے، یہ پورا ایک سلسلہ ہے اور اس میں ہر شخصیت کا ایک خاص حصہ اور مرتبہ ہے، تاریخِ دراصل امانت کی ادائیگی اور حق شناسی اور اعترافِ حقیقت کا نام ہے، ان میں ہر شخص اسلام کی کسی نہ کسی سرحد کا محافظ اور اسلام کے ترکش کا ایک قیمتی تیر تھا، اگر ان لوگوں کی مخلصانہ کوششیں نہ ہوتیں، جن کو آج ہم تاریخ کی دور میں سے دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں، تو ہم تک یہ مجبوعہ نہ پہنچ پاتا، جس میں ہمارے لئے عزت، عبرت اور عظمت کا وافر سامان موجود ہے، اور جس کی موجودگی میں ہم اقوامِ عالم کے سامنے بجا طور پر اپنا سر بلند رکھ سکتے ہیں۔

اس مسلک اور ان خطوط پر جو مصنف کے نزدیک منصفانہ اور عادلانہ مسلک ہے، اس نے آئندہ صفحہ میں ان اہم شخصیتوں کی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جنہوں نے دعوت و عزیمت اور اصلاح و تجدید کے میدان میں کوئی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ **وَبِيَدِ اللَّهِ التَّوْفِيقُ**



پہلی صدی کی اصلاحی کوششیں

اور
عمر بن عبدالعزیز

عہدِ اموی میں جاہلی رجحانات و اثرات

خلافتِ راشدہ کے اختتام، اور بنی امیہ کی حکومت کے استحکام نے (جو اسلامی سے زیادہ عربی تھی) تجدید و انقلاب کی فوری ضرورت پیدا کر دی، قدیم جاہلی رجحانات جو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صحبت و تربیت اور خلافتِ راشدہ کے اثر سے دب گئے تھے، نیم تربیت یافتہ مسلمانوں اور نئی عربی نسل میں ابھر آئے، حکومت کا محور جس پر اس کا پورا نظام گردش کرتا تھا، کتابِ سنت نہیں رہا، بلکہ عربی سیاست اور مصالحِ ملکی، بن گیا، تفاخر اور عربی عصبیت کی روح جس کو اسلام نے شہر بدر کر دیا تھا، اور جو بادیہ عرب میں پناہ گزین تھی، پھر واپس آ گئی، قبائلی غرور، خاندانی جنبہ داری، اعزہ پروری جو خلافتِ راشدہ میں سخت عیب اور معصیت شمار ہوتی تھی، ہمزاد محاسن بن گئے، اعمال و اخلاق کے محرکات (بجائے اجر و ثواب کے) جاہلی ناموری، مدح و تعریف اور تفوق ہو گئے،

لہٰذا اس سلسلہ میں جاہلیت کا جذبہ، مسابقت اور شہرت و عزت پورے طور پر زندہ اور بیدار ہو گیا تھا، اس ذہنیت کا اندازہ اس دیکھنے سے ہو سکتا ہے جو ابوالفرج اصفہانی نے افغانی میں نقل کیا ہے کہ عہدِ اموی کے دو عرب سرداروں جو شہر اور عکرمہ کے درمیان عرصہ سے اس بات کا مقابلہ تھا کہ کس کے یہاں کھانا زیادہ تیار ہوتا ہے، اور زمان زیادہ ہوتے ہیں، اس سلسلہ میں جو شہر کا پیرا اکثر تجارتی رہتا، ایک عرصہ بعد عکرمہ نے اپنے حریت کو زکِ ذینے کے لئے یہ تدبیر کی کہ صدر ہا بوریان آئے کی خریدیں اور اپنے قبیلہ میں تقسیم کر دیں کہ آٹا گوندہ لیا جائے اس گندہ ہوئے آئے کو اس نے ایک بڑے گڑھے میں بھر دیا اور اوپر سے گھاس ڈال دی اور اس کا انتظام کیا کہ جو شہر کا گھوڑا اس گڑھے میں گر جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ گھوڑا گندہ ہوئے آئے کی اس خندق میں جا پڑا اور آٹے میں لت پت ہو گیا، اور دھوم مچ گئی کہ عکرمہ کے یہاں اس مقدار میں آٹا گندہ تھا ہے کہ گھوڑا اس میں گر گیا، لوگ تماشہ دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے دیکھا تو گھوڑے کا سر اور گردن باہر تھی، اور سارا جسم (باقی صفحہ پر)

بیت المال (جو مسلمانوں کے پیسے سے جمع ہوتا تھا) خلیفہ کی ذاتی ملکیت اور خاندانی جاگیر بن گیا تھا، پیشہ ور شعرا، خوشامدی درباریوں اور آبرو باختہ مصاحبین کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا جس پر مسلمانوں کی دولت بیدارگی صرف ہوتی تھی اور ان کی بے عنوانیوں سے شہم پوشی کی جاتی تھی، گانا سننے کا ذوق اور موسیقی کا انہماک حد کو پہنچ گیا تھا، حکومت کی غلط روی اور اہل حکومت کی بے دین زندگی سے پوری اسلامی سوسائٹی متاثر ہو رہی تھی، اور مترفین کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس کے اخلاق قدیم مترفین سے ملتے جلتے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے زخم خوردہ جاہلیت اپنے فاتح حریف سے انتقام لینے پر تلی ہوئی ہے، اور چالیس برس کا حساب ایک دن میں پورا کرنا چاہتی ہے۔

عہد اموی کی دینی شخصیتیں اور ان کا اخلاقی اثر

بنی امیہ کے اس مادی اقتدار اور اس کے قدرتی اثرات کے باوجود اس عہد تک بن کا وقار اور اس کا اخلاقی اثر کسی حد تک مسلمانوں کی زندگی میں قائم تھا، یہ دینی وقار اور اخلاقی اثر ان اشخاص کی بدولت تھا، جو دینی و علمی حیثیت سے بلند مقام رکھتے تھے، اور اپنی لٹہیت، اخلاص، پاکیزہ نفسی اور علم و تفقہ میں مشہور و معروف تھے، حکومت و انتظام کے دائرہ سے باہر انہی حضرات کا اثر و اقتدار تھا، اس اثر اور قلبی احترام کی وجہ سے مسلمان بہت سی خرابیوں اور گمراہیوں سے محفوظ تھے، اور مادیت کے سیلاب میں بالکل بہ جانے سے رکے ہوئے تھے، ان دینی شخصیتوں میں سب سے بااثر اور محبوب شخصیت حضرت علی بن الحسین (زین العابدین علیہ وعلیٰ آباءہ السلام) کی تھی، جو عبادت و تقویٰ اور زہد و تواضع میں اپنی نظیر نہیں

(باقی صفحہ کا) ڈوبا ہوا تھا، رسیوں اور بیلیوں سے اس کو بڑی مشکل سے نکالا گیا، عام طور پر اس واقعہ کی شہرت ہوئی، اور شعرا نے اشعار کہے، اس طرح عکرم نے اپنے حریف کے مقابل میں فتح حاصل کرنی، اور اپنا تقویٰ تسلیم کروایا (ازرنات الثالث جلد ۱ ص ۱۳۹-۱۴۰)

لے اموی عہد کا مشہور عیسائی شاعر (م ۹۵ھ) خلیفہ عبد الملک بن مروان کی مجلس میں اس شان سے آنا کہ گلے میں سونے کی صلیب تھی اور دائرہ کے بالوں سے شراب کے قطرے چمکتے، اور کوئی اس کو ٹوکنے والا نہ ہوتا (افغانی ج ۷ ص ۱۷۸)

۱۷ھ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو گا کہ ایک مرتبہ عراق کا مشہور مغنی حنین اپنے ہم پیشہ لوگوں کی دعوت پر مدینہ منورہ آیا، اور ایک مکان میں اس نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا، سننے والوں کا اس قدر ہجوم ہوا کہ چھت بیٹھ گئی، اور خود حنین دب کر مر گیا۔

(افغانی ج ۲ ص ۱۲۲، ۱۲۳)

رکھتے تھے، مسلمانوں کو ان کے ساتھ جو تعلق تھا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ ایک مرتبہ ہشام بن عبد الملک

اپنی ولی عہدی کے زمانہ میں طواف کے لئے آیا، شدتِ ہجوم کی وجہ سے وہ حجرِ اسود تک نہیں پہنچ سکا، اور اس انتظار میں بیٹھ گیا کہ مجمع کچھ کم ہو تو وہ استلام کرے، اس درمیان میں حضرت علی بن الحسین آئے، ان کا آنا تھا کہ مجمع کافی کی طرح چھٹ گیا، اور انھوں نے باسانی طواف و استلام کیا، وہ جدھر سے گزرتے، لوگ حتر امارتہ چھوڑ دیتے تھے، ہشام نے انجان بن کر پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ عہد اموی کے مشہور شاعر فرزدق نے برجستہ اشعار میں اس کے تجاہل عارفانہ کا جواب دیا، اور ان کا شایانِ شان تعارف کرایا۔

اسی طرح دوسرے فضلاء اہل بیت حضرت حسن المثنیٰ اور ان کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ المحض نیز دوسرے فضلاء تابعین حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر، حضرت قاسم بن محمد بن ابی بکر، حضرت سعید بن المسیب حضرت عروہ بن الزبیر مسلمانوں کے لئے دینی نمونہ (آئیڈیل) تھے، انھوں نے اپنی خودداری، حکومت سے بے تعلقی، حق گوئی، اور بے باکی، علمی انہماک اور بے غرض خدمتِ دین سے اپنی اخلاقی برتری کا نقش قائم کر دیا تھا، حکومت کے بڑھتے ہوئے ہمہ گیر اثرات کے مقابلہ میں یہ اخلاقی اثر اگرچہ کافی نہ تھا، مگر اس میں شبہ نہیں کہ وہ بے قیمت اور بے نتیجہ نہ تھا، اس سے مسلمانوں کی زندگی میں کسی حد تک اعتدال و توازن اور دین کا احترام قائم تھا، اور کبھی کبھی عین دنیاوی انہماک میں بھی اصلاحِ حال کا جذبہ ابھرتا تھا۔

انقلابِ حکومت کی ضرورت اس کی مشکلات

رفتہ رفتہ سیاسی انقلاب کے اثرات وسیع اور گہرے ہوتے چلے گئے، ان دینی شخصیتوں میں بھی کمی آنے لگی، جو اسلام

لے حجرِ اسود کو بوسہ دینا یا ہاتھ سے چھونا، ۱۲۰ھ یہ قصیدہ اب بھی عربی ادب میں یادگار ہے، اس کا مطلع ہے۔

هَذَا الَّذِي تَعْرِفُ الْبَطْءَ وَطَأْتِ وَالْبَيْتَ يَمْرُقُ وَالْحِجْلَ وَالْحَرَمَ

تحققین کا خیال ہے کہ اس قصیدہ میں بہت سے اشعار بعد میں اصناف ہوئے ہیں۔

سبہ مفصل حالات و تراجم کے لئے ملاحظہ ہو تذکرۃ الحفاظ للذہبی، صفحہ ۱۷۰ لابن الجوزی اور تاریخ ابن خلکان۔

کے اصلی اخلاق و اوصاف کی محافظ اور قرن اول کی یادگار تھیں، حکومت کا دائرہ اثر وسیع اور مستحکم ہو گیا، اب

اخلاقی و دینی انقلاب اس کے بغیر مشکل تھا کہ خود حکومت میں کوئی خوشگوار انقلاب ہو۔

اموی حکومت ایسی مستحکم فوجی بنیادوں پر قائم تھی کہ آسانی سے ہلائی نہیں جاسکتی تھی، اس وقت کوئی بیرونی یا اندرونی طاقت ایسی نہ تھی، جو اس کو میدان جنگ میں شکست دے سکے، ماضی قریب میں دو بڑی کوششیں

ایک سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا مخلصانہ و سرفروشانہ اقدام، دوسرے حضرت عبداللہ بن زبیر کا دلیرانہ و

منظم مقابلہ نام کام ہو چکا تھا، کسی فوجی انقلاب کی کامیابی کے قریبی امکانات و آثار نہ تھے، شخصی و موروثی حکومت نے

اصلاح و تبدیلی کے دروازے بند کر دیئے تھے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صدیوں کے لئے مسلمانوں کی قسمت پر ہم لگ چکی

ہے، اس وقت اسلام کو غالب ہونے اور حالات کو بدل دینے کے لئے ایک معجزہ کی ضرورت تھی اور وہ معجزہ ظاہر ہوا۔

عمر بن عبدالعزیز کی جانشینی

یہ معجزہ حضرت سیدنا عمر بن عبدالعزیز کی ذات ہے، جو خود بانی خاندان (مروان) کے پوتے اور ان کی ماں

(ام عاصم) فاروق اعظم کی پوتی تھیں، فاروقیت اور امویت کا یہ سنجوگ اسی لئے ہوا تھا، کہ بنی امیہ کے خاندان میں

ایک خلیفہ راشد پیدا ہو، جو حالات میں انقلاب برپا کرے۔

عمر بن عبدالعزیز ۱۳۱ھ میں پیدا ہوئے، وہ خلیفہ وقت سلیمان بن عبدالملک کے چچا زاد بھائی تھے اور اس کے

پیشرو ولید بن عبدالملک کے اور اس کے زمانہ میں مدینہ منورہ کے حاکم (گورنر) تھے، ان کی جوانی اور امارت کو ان کی خلافت

لے اس رشتہ کا تاریخ یہ ہے کہ حضرت عمر نے منادی کر والی تھی کہ دودھ میں پانی نہ ملایا جائے، اسی زمانہ میں ایک رات وہ گشت پر تھے کہ ایک گھر سے آواز

آئی کہ کوئی عورت کہہ رہی ہے، مٹی مسج ہو رہی ہے، دودھ میں پانی ملائے، لڑکی نے جواب دیا کہ ماں آپ کو معلوم نہیں کہ امیر المؤمنین نے اس کی مانعت

کی ہے؟ عورت نے کہا کہ امیر المؤمنین اس وقت کہاں ہیں، ان کو کیا خبر؟ لڑکی نے جواب دیا کہ امیر المؤمنین کو خبر نہیں تو خزانہ دیکھ رہا ہے، حضرت عمر

نے اس گھر کو نظر میں رکھ لیا، اور اپنے صاحبزادہ عاصم سے کہا کہ تم اس لڑکی کو پیام دو، مجھے امید ہے کہ اس کے بطن سے ایسا جو امر پیدا ہوگا جو اسے

عرب پر حکومت کرے گا، عاصم نے اس سے نکاح کر لیا، عمر بن عبدالعزیز اس کے نواسے ہیں۔ (سیرت عمر بن عبدالعزیز ص ۱۸۱، ۱۷)

کے بعد کی زندگی سے کوئی مناسبت نہیں، وہ ایک صاحب ذوق امیرانہ مزاج اور نفیس طبع نوجوان تھے، وہ جس

راستہ سے گزرتے تھے، دیر تک اس کی مہک بتلاتی تھی کہ ادھر سے عمر گزرے ہیں، ان کی چال مشہور اور نوجوانوں کا فیشن

تھی، سولے طبیعت کی سلامتی، حق پسندی اور فطری نیک مزاجی کے ان میں کوئی ایسی علامت نہ تھی جس سے

ثابت ہو کہ وہ تاریخ اسلام میں اتنا اہم کام انجام دینے والے ہیں۔

لیکن ان کی ذات سرتاپا اسلام کا اعجاز تھی، اور وہ جس طرح منصب خلافت پر آئے، وہ بھی خدا کی قدرت

کی ایک نشانی تھی، موروثی نظام حکومت میں ان کی خلافت کا کوئی موقع نہ تھا، اگر حالات اپنی طبعی رفتار سے چلتے

رہتے، تو امارت سے زیادہ ان کا کوئی حصہ نہ تھا، مگر خدا کو کچھ اور منظور تھا، سلیمان بن عبدالملک بیمار ہوا، اس کے بچے

چھوٹے چھوٹے تھے، اس نے ان کو لابی لابی قبائیں پہنائیں اور ہتھیار باندھے کہ وہ کچھ بڑے معلوم ہوں، مگر وہ آنکھوں

میں جینچے، اس نے بڑی حسرت سے ان کی طرف دیکھا، اور کہا کہ وہ بڑا خوش قسمت ہے، جس کے لڑکے بڑے بڑے ہوں،

وَجَاءَ بِنِ حَيُّوۃَ نے جو اسی انتظار میں تھے، حضرت عمر بن عبدالعزیز کی جانشینی کا مشورہ دیا، جو منظور ہوا، رجا کا یہ

کارنامہ (جو دینی انقلاب کا ذریعہ بنا) بڑے بڑے مجاہدات اور سالہا سال کی عبادت پر بھاری ہے۔

خلافت کے بعد ان کی زندگی

عمر بن عبدالعزیز نے زمام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی بلاتاخیران چند عمال حکومت کو معزول کیا، جو سخت

ظالم اور ناخدا ترس تھے، ان کے سامنے شاہی تزک و احتشام اور جانشینی کا جو سامان پیش کیا گیا، اس کو بیت المال

میں داخل کیا، اور اسی گھڑی سے ان کی سیرت کیس بدل گئی، اب وہ سلیمان کے جانشین نہ تھے، بلکہ امیر المؤمنین عمر بن الخطاب

رضی اللہ عنہ کے جانشین تھے، جو اسی اوبانڈیوں کو تحقیق کے بعد ان کے خاندانوں اور شہروں کو واپس کر دیا، مظالم کا تصفیہ

کیا، اور اپنی مجلس کو جس نے کسری و قیصر کے دربار کی حیثیت اختیار کر لی تھی، سنت اور خلافت راشدہ کے نمونہ پر سادہ اور

(مطابق سنت بنا دیا، اپنی جاگیر مسلمانوں کو واپس کر دی، بیوی کا زیور بیت المال میں داخل کیا، انھوں نے ایسی زاہدانہ

زندگی اختیار کی، جن کی نظیر بادشاہوں میں تو کیا مل سکتی ہے، درویشوں اور فقرا میں بھی ملنی مشکل ہے، لباس میں ایسی کمی

کی کہ بعض اوقات کرتا سو کھنے کے انتظار میں جمعہ میں تاخیر سے پہنچنا ہوتا، بنی امیہ جو ساری سلطنت کو اپنی جاگیر اور بیت المال کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے، اب اپنا نپاٹنا حصہ پاتے، خود ان کے گھر کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ اپنی بچیوں سے ملنے گئے تو دیکھا جو بچی ان سے بات کرتی ہے، وہ منہ پر ہاتھ رکھ لیتی ہے، سبب دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ان بچیوں نے آج صرف دال اور پیاز کھائی ہے، رو کر فرمایا کہ کیا تم اس پر راضی ہو کہ تم انواع و اقسام کے کھانے کھاؤ اور تمہارا باپ جہنم میں جائے؟ یہ سن کر وہ بھی رو پڑیں، اس وقت جبکہ وہ روتے زمین کی سب سے بڑی سلطنت کے حکمران تھے، ان کی ذاتی ملکیت کا یہ حال تھا کہ باوجود شوق کے حج کا خرچ ان کے پاس نہ تھا، نوکر سے جو ان کا سچا رفیق تھا، پوچھا کہ تمہارے پاس کچھ ہے؟ اس نے کہا کہ دس بارہ دینار کہا کہ اس میں حج کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کے بعد ایک بڑی خاندانی مالیت آئی تو خادم نے مبارک باد دی اور کہا کہ حج کا سامان آگیا، فرمایا ہم نے اس مال سے بہت دنوں فائدہ اٹھایا ہے، اب یہ مسلمانوں کا حق ہے، یہ کہہ کر اس کو بیت المال میں داخل کر دیا۔

ان کے دو وقت کھانے کا حساب دو درہم یومیہ سے زیادہ نہ تھا، احتیاط کا یہ عالم تھا کہ اگر سرکاری شمع جل رہی ہوتی اور کوئی ان کی خیریت دریافت کرنے لگتا، یا ذاتی بات چیت شروع کر دیتا تو فوراً اس کو گل کر دیتے، اور اپنی ذاتی شمع منگوانے، بیت المال کے باورچی خانہ میں گرم کئے ہوئے پانی سے غسل کرنے سے بھی ان کو احتراز تھا، بیت المال کے کٹنگ کو سونگھنا بھی گوارا نہ تھا۔ ان کی احتیاط تنہا اپنی ذات تک محدود نہ تھی، بلکہ وہ اپنے عمال حکومت کو بھی احتیاط کا سبق دیتے تھے، اور ان سے توقع کرتے تھے کہ وہ بھی حکومت کے معاملہ میں اسی قدر محتاط اور جرس ہوں گے، والی مدینہ ابو بکر بن حزم نے سلیمان بن عبد الملک کو درخواست دی تھی کہ حسب دستور سابق ان کو سرکاری موم بتیاں اور قند ملیں ملنی چاہئیں، سلیمان کے انتقال کے بعد یہ پرچہ عمر بن عبد العزیز کے ملاحظہ میں آیا، آپ نے لکھا کہ ابو بکر مجھے یاد ہے کہ تم اس عہدے سے پہلے جاٹے کی اندھیری راتوں میں بے شمع و موم بتی کے نکلتے تھے، تمہاری وہ حالت اس حالت سے بہتر تھی، میرے خیال میں تمہارے گھر کی موم بتیاں

اور قند ملیں کافی ہیں، انہی سے تم کو کام لینا چاہئے، اسی طرح کی ایک درخواست جس میں سرکاری کام کے لئے کاغذ طلب کیا گیا تھا، لکھا کہ۔

”قلم باریک کر دو اور گٹھا ہوا لکھو، اور ایک پرچہ میں بہت سی ضرورتیں لکھ دیا کرو، اس لئے کہ مسلمانوں کو ایسی لمبی چوڑی بات کی ضرورت نہیں جس سے خواخواہ بیت المال پر بار پڑے۔“

ان کی انقلابی اصلاحات

اس زاہدانہ زندگی اور تقویٰ و احتیاط کے ماسوا انہوں نے حکومت کی روح ہی بدل دی، پہلا اور بنیادی انقلاب یہ تھا کہ انہوں نے حکومت کا نقطہ نظر بدلا، اس وقت تک حکومت محاصل و خراج وصول کرنے اور صرف کرنے کا ایک انتظامی ادارہ تھا، جس کو جمہور کے اخلاق و عقائد، سیرت و تربیت اور ضلالت و ہدایت سے کچھ بھٹ نہ تھی، اسی نقطہ کے گرد اس کا سارا نظام گردش کرتا تھا، انہوں نے اپنے اس مشہور تاریخی فقرے سے کہ:

”محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دنیا میں ہادی بنا کر بھیجے گئے تھے، تحصیلدار بنا کر نہیں بھیجے گئے تھے۔“

حکومت کا مزاج اور نقطہ نظر ہی تبدیل کر دیا، اور اس کو دنیاوی حکومت کے بجائے خلافت نبوت بنا دیا، ان کی ساری مدت خلافت اسی ایک جملہ کی عملی تفسیر تھی، انہوں نے ملکی مصالح و منافع کے مقابلہ میں ہمیشہ دین و اصول و اخلاق کو ترجیح دی، اور دینی نفع کے مقابلہ میں حکومت کے مالی نقصان کی کبھی پروا نہیں کی، ان کے زمانہ خلافت میں اسلامی حکومت کے غیر مسلم باشندے (ذمتی) بڑی تعداد میں مسلمان ہو رہے تھے، جس کا نتیجہ یہ تھا کہ جزیرہ کی رقم جو حکومت کی آمدنی کا ایک اہم عنصر تھی، روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی، اور حکومت کے مالی توازن پر اس کا زبردست اثر پڑ رہا تھا، انکار سلطنت نے ان کو اس خطرہ کی طرف توجہ دلائی، اور تشویش کا اظہار کیا، انہوں نے فرمایا کہ یہ تو آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بخت کا عین مقصد ہے، ایک دوسرے عہدہ دار کو لکھا کہ مجھے اس سے بڑی فوشی ہوگی کہ سب غیر مسلم مسلمان ہو جائیں اور (جزیرہ کی

بڑے عالم تھے، ان کو حدیث کی تدوین کی طرف توجہ دلائی اور لکھا:۔

انظر ما كان من حدیث رسول الله
صلی الله علیه وسلم فالتی فاتی حقت
آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جو کچھ حدیثیں تم کو ملیں
ان کو تحریری شکل میں لے آؤ اس لئے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ
علماء رخصت ہو جائیں گے اور علم مٹ جائے گا۔

انہوں نے تعیین کے ساتھ عمرہ بنت عبد الرحمن انصاریہ اور قاسم بن محمد بن ابی بکر کے ذخیرہ روایات کی طرف توجہ دلائی کہ جلد اس کو قلم بند کر لیا جائے، پھر صرف ابو بکر بن حزم ہی پر اکتفا نہیں کی، بلکہ عمال سلطنت اور شاہیہ علماء کو بالعموم اس ضرورت کی طرف متوجہ کیا، اور گشتی فرمان جاری کیا کہ:۔

انظر والی حدیث رسول الله (صلی الله
علیه وسلم) فاجمعوا لہ
رسول اللہ علیہ وسلم کی احادیث ڈھونڈ ڈھونڈ کر
جمع کرو۔

اسی کے ساتھ علماء کے وظائف مقرر کئے کہ وہ کیسوی اور انہماک کے ساتھ علم کی اشاعت اور تعلیم کا کام کر سکیں۔ وہ خود بڑے عالم تھے انہوں نے بنفس نفیس فرائض و سنن کی تشریح کی طرف توجہ کی، خلافت کے ابتدائی دنوں میں ایک گشتی فرمان جاری کیا جس میں فرماتے ہیں کہ:۔

”اسلام کے کچھ حدود و قوانین و سنن ہیں جو ان پر عمل کرے گا، اس کے ایمان کی تکمیل ہوگی، اور جو عمل نہیں کرے گا، اس کا ایمان نامکمل رہ جائے گا، اگر زندگی نے وفا کی، تو میں تمہیں اس کی تعلیم دوں گا، اور تمہیں ان پر چلاؤں گا، اگر اس سے پہلے میرا وقت آگیا، تو میں تمہارے درمیان رہنے پر کچھ ایسا کر لیں بھی نہیں ہوں!“

چند خطوط و فرامین

بید نام عمر بن عبد العزیز کے قالب میں جو خالص اسلامی ذہن اور اسلامی روح کا فرما تھی (اور جو بالآخر ان کے

لئے تاریخ اصحابان (البنیم) ۱۷۷ ۱۷۸ ۱۷۹ ۱۸۰ ۱۸۱ ۱۸۲ ۱۸۳ ۱۸۴ ۱۸۵ ۱۸۶ ۱۸۷ ۱۸۸ ۱۸۹ ۱۹۰ ۱۹۱ ۱۹۲ ۱۹۳ ۱۹۴ ۱۹۵ ۱۹۶ ۱۹۷ ۱۹۸ ۱۹۹ ۲۰۰ ۲۰۱ ۲۰۲ ۲۰۳ ۲۰۴ ۲۰۵ ۲۰۶ ۲۰۷ ۲۰۸ ۲۰۹ ۲۱۰ ۲۱۱ ۲۱۲ ۲۱۳ ۲۱۴ ۲۱۵ ۲۱۶ ۲۱۷ ۲۱۸ ۲۱۹ ۲۲۰ ۲۲۱ ۲۲۲ ۲۲۳ ۲۲۴ ۲۲۵ ۲۲۶ ۲۲۷ ۲۲۸ ۲۲۹ ۲۳۰ ۲۳۱ ۲۳۲ ۲۳۳ ۲۳۴ ۲۳۵ ۲۳۶ ۲۳۷ ۲۳۸ ۲۳۹ ۲۴۰ ۲۴۱ ۲۴۲ ۲۴۳ ۲۴۴ ۲۴۵ ۲۴۶ ۲۴۷ ۲۴۸ ۲۴۹ ۲۵۰ ۲۵۱ ۲۵۲ ۲۵۳ ۲۵۴ ۲۵۵ ۲۵۶ ۲۵۷ ۲۵۸ ۲۵۹ ۲۶۰ ۲۶۱ ۲۶۲ ۲۶۳ ۲۶۴ ۲۶۵ ۲۶۶ ۲۶۷ ۲۶۸ ۲۶۹ ۲۷۰ ۲۷۱ ۲۷۲ ۲۷۳ ۲۷۴ ۲۷۵ ۲۷۶ ۲۷۷ ۲۷۸ ۲۷۹ ۲۸۰ ۲۸۱ ۲۸۲ ۲۸۳ ۲۸۴ ۲۸۵ ۲۸۶ ۲۸۷ ۲۸۸ ۲۸۹ ۲۹۰ ۲۹۱ ۲۹۲ ۲۹۳ ۲۹۴ ۲۹۵ ۲۹۶ ۲۹۷ ۲۹۸ ۲۹۹ ۳۰۰ ۳۰۱ ۳۰۲ ۳۰۳ ۳۰۴ ۳۰۵ ۳۰۶ ۳۰۷ ۳۰۸ ۳۰۹ ۳۱۰ ۳۱۱ ۳۱۲ ۳۱۳ ۳۱۴ ۳۱۵ ۳۱۶ ۳۱۷ ۳۱۸ ۳۱۹ ۳۲۰ ۳۲۱ ۳۲۲ ۳۲۳ ۳۲۴ ۳۲۵ ۳۲۶ ۳۲۷ ۳۲۸ ۳۲۹ ۳۳۰ ۳۳۱ ۳۳۲ ۳۳۳ ۳۳۴ ۳۳۵ ۳۳۶ ۳۳۷ ۳۳۸ ۳۳۹ ۳۴۰ ۳۴۱ ۳۴۲ ۳۴۳ ۳۴۴ ۳۴۵ ۳۴۶ ۳۴۷ ۳۴۸ ۳۴۹ ۳۵۰ ۳۵۱ ۳۵۲ ۳۵۳ ۳۵۴ ۳۵۵ ۳۵۶ ۳۵۷ ۳۵۸ ۳۵۹ ۳۶۰ ۳۶۱ ۳۶۲ ۳۶۳ ۳۶۴ ۳۶۵ ۳۶۶ ۳۶۷ ۳۶۸ ۳۶۹ ۳۷۰ ۳۷۱ ۳۷۲ ۳۷۳ ۳۷۴ ۳۷۵ ۳۷۶ ۳۷۷ ۳۷۸ ۳۷۹ ۳۸۰ ۳۸۱ ۳۸۲ ۳۸۳ ۳۸۴ ۳۸۵ ۳۸۶ ۳۸۷ ۳۸۸ ۳۸۹ ۳۹۰ ۳۹۱ ۳۹۲ ۳۹۳ ۳۹۴ ۳۹۵ ۳۹۶ ۳۹۷ ۳۹۸ ۳۹۹ ۴۰۰ ۴۰۱ ۴۰۲ ۴۰۳ ۴۰۴ ۴۰۵ ۴۰۶ ۴۰۷ ۴۰۸ ۴۰۹ ۴۱۰ ۴۱۱ ۴۱۲ ۴۱۳ ۴۱۴ ۴۱۵ ۴۱۶ ۴۱۷ ۴۱۸ ۴۱۹ ۴۲۰ ۴۲۱ ۴۲۲ ۴۲۳ ۴۲۴ ۴۲۵ ۴۲۶ ۴۲۷ ۴۲۸ ۴۲۹ ۴۳۰ ۴۳۱ ۴۳۲ ۴۳۳ ۴۳۴ ۴۳۵ ۴۳۶ ۴۳۷ ۴۳۸ ۴۳۹ ۴۴۰ ۴۴۱ ۴۴۲ ۴۴۳ ۴۴۴ ۴۴۵ ۴۴۶ ۴۴۷ ۴۴۸ ۴۴۹ ۴۵۰ ۴۵۱ ۴۵۲ ۴۵۳ ۴۵۴ ۴۵۵ ۴۵۶ ۴۵۷ ۴۵۸ ۴۵۹ ۴۶۰ ۴۶۱ ۴۶۲ ۴۶۳ ۴۶۴ ۴۶۵ ۴۶۶ ۴۶۷ ۴۶۸ ۴۶۹ ۴۷۰ ۴۷۱ ۴۷۲ ۴۷۳ ۴۷۴ ۴۷۵ ۴۷۶ ۴۷۷ ۴۷۸ ۴۷۹ ۴۸۰ ۴۸۱ ۴۸۲ ۴۸۳ ۴۸۴ ۴۸۵ ۴۸۶ ۴۸۷ ۴۸۸ ۴۸۹ ۴۹۰ ۴۹۱ ۴۹۲ ۴۹۳ ۴۹۴ ۴۹۵ ۴۹۶ ۴۹۷ ۴۹۸ ۴۹۹ ۵۰۰ ۵۰۱ ۵۰۲ ۵۰۳ ۵۰۴ ۵۰۵ ۵۰۶ ۵۰۷ ۵۰۸ ۵۰۹ ۵۱۰ ۵۱۱ ۵۱۲ ۵۱۳ ۵۱۴ ۵۱۵ ۵۱۶ ۵۱۷ ۵۱۸ ۵۱۹ ۵۲۰ ۵۲۱ ۵۲۲ ۵۲۳ ۵۲۴ ۵۲۵ ۵۲۶ ۵۲۷ ۵۲۸ ۵۲۹ ۵۳۰ ۵۳۱ ۵۳۲ ۵۳۳ ۵۳۴ ۵۳۵ ۵۳۶ ۵۳۷ ۵۳۸ ۵۳۹ ۵۴۰ ۵۴۱ ۵۴۲ ۵۴۳ ۵۴۴ ۵۴۵ ۵۴۶ ۵۴۷ ۵۴۸ ۵۴۹ ۵۵۰ ۵۵۱ ۵۵۲ ۵۵۳ ۵۵۴ ۵۵۵ ۵۵۶ ۵۵۷ ۵۵۸ ۵۵۹ ۵۶۰ ۵۶۱ ۵۶۲ ۵۶۳ ۵۶۴ ۵۶۵ ۵۶۶ ۵۶۷ ۵۶۸ ۵۶۹ ۵۷۰ ۵۷۱ ۵۷۲ ۵۷۳ ۵۷۴ ۵۷۵ ۵۷۶ ۵۷۷ ۵۷۸ ۵۷۹ ۵۸۰ ۵۸۱ ۵۸۲ ۵۸۳ ۵۸۴ ۵۸۵ ۵۸۶ ۵۸۷ ۵۸۸ ۵۸۹ ۵۹۰ ۵۹۱ ۵۹۲ ۵۹۳ ۵۹۴ ۵۹۵ ۵۹۶ ۵۹۷ ۵۹۸ ۵۹۹ ۶۰۰ ۶۰۱ ۶۰۲ ۶۰۳ ۶۰۴ ۶۰۵ ۶۰۶ ۶۰۷ ۶۰۸ ۶۰۹ ۶۱۰ ۶۱۱ ۶۱۲ ۶۱۳ ۶۱۴ ۶۱۵ ۶۱۶ ۶۱۷ ۶۱۸ ۶۱۹ ۶۲۰ ۶۲۱ ۶۲۲ ۶۲۳ ۶۲۴ ۶۲۵ ۶۲۶ ۶۲۷ ۶۲۸ ۶۲۹ ۶۳۰ ۶۳۱ ۶۳۲ ۶۳۳ ۶۳۴ ۶۳۵ ۶۳۶ ۶۳۷ ۶۳۸ ۶۳۹ ۶۴۰ ۶۴۱ ۶۴۲ ۶۴۳ ۶۴۴ ۶۴۵ ۶۴۶ ۶۴۷ ۶۴۸ ۶۴۹ ۶۵۰ ۶۵۱ ۶۵۲ ۶۵۳ ۶۵۴ ۶۵۵ ۶۵۶ ۶۵۷ ۶۵۸ ۶۵۹ ۶۶۰ ۶۶۱ ۶۶۲ ۶۶۳ ۶۶۴ ۶۶۵ ۶۶۶ ۶۶۷ ۶۶۸ ۶۶۹ ۶۷۰ ۶۷۱ ۶۷۲ ۶۷۳ ۶۷۴ ۶۷۵ ۶۷۶ ۶۷۷ ۶۷۸ ۶۷۹ ۶۸۰ ۶۸۱ ۶۸۲ ۶۸۳ ۶۸۴ ۶۸۵ ۶۸۶ ۶۸۷ ۶۸۸ ۶۸۹ ۶۹۰ ۶۹۱ ۶۹۲ ۶۹۳ ۶۹۴ ۶۹۵ ۶۹۶ ۶۹۷ ۶۹۸ ۶۹۹ ۷۰۰ ۷۰۱ ۷۰۲ ۷۰۳ ۷۰۴ ۷۰۵ ۷۰۶ ۷۰۷ ۷۰۸ ۷۰۹ ۷۱۰ ۷۱۱ ۷۱۲ ۷۱۳ ۷۱۴ ۷۱۵ ۷۱۶ ۷۱۷ ۷۱۸ ۷۱۹ ۷۲۰ ۷۲۱ ۷۲۲ ۷۲۳ ۷۲۴ ۷۲۵ ۷۲۶ ۷۲۷ ۷۲۸ ۷۲۹ ۷۳۰ ۷۳۱ ۷۳۲ ۷۳۳ ۷۳۴ ۷۳۵ ۷۳۶ ۷۳۷ ۷۳۸ ۷۳۹ ۷۴۰ ۷۴۱ ۷۴۲ ۷۴۳ ۷۴۴ ۷۴۵ ۷۴۶ ۷۴۷ ۷۴۸ ۷۴۹ ۷۵۰ ۷۵۱ ۷۵۲ ۷۵۳ ۷۵۴ ۷۵۵ ۷۵۶ ۷۵۷ ۷۵۸ ۷۵۹ ۷۶۰ ۷۶۱ ۷۶۲ ۷۶۳ ۷۶۴ ۷۶۵ ۷۶۶ ۷۶۷ ۷۶۸ ۷۶۹ ۷۷۰ ۷۷۱ ۷۷۲ ۷۷۳ ۷۷۴ ۷۷۵ ۷۷۶ ۷۷۷ ۷۷۸ ۷۷۹ ۷۸۰ ۷۸۱ ۷۸۲ ۷۸۳ ۷۸۴ ۷۸۵ ۷۸۶ ۷۸۷ ۷۸۸ ۷۸۹ ۷۹۰ ۷۹۱ ۷۹۲ ۷۹۳ ۷۹۴ ۷۹۵ ۷۹۶ ۷۹۷ ۷۹۸ ۷۹۹ ۸۰۰ ۸۰۱ ۸۰۲ ۸۰۳ ۸۰۴ ۸۰۵ ۸۰۶ ۸۰۷ ۸۰۸ ۸۰۹ ۸۱۰ ۸۱۱ ۸۱۲ ۸۱۳ ۸۱۴ ۸۱۵ ۸۱۶ ۸۱۷ ۸۱۸ ۸۱۹ ۸۲۰ ۸۲۱ ۸۲۲ ۸۲۳ ۸۲۴ ۸۲۵ ۸۲۶ ۸۲۷ ۸۲۸ ۸۲۹ ۸۳۰ ۸۳۱ ۸۳۲ ۸۳۳ ۸۳۴ ۸۳۵ ۸۳۶ ۸۳۷ ۸۳۸ ۸۳۹ ۸۴۰ ۸۴۱ ۸۴۲ ۸۴۳ ۸۴۴ ۸۴۵ ۸۴۶ ۸۴۷ ۸۴۸ ۸۴۹ ۸۵۰ ۸۵۱ ۸۵۲ ۸۵۳ ۸۵۴ ۸۵۵ ۸۵۶ ۸۵۷ ۸۵۸ ۸۵۹ ۸۶۰ ۸۶۱ ۸۶۲ ۸۶۳ ۸۶۴ ۸۶۵ ۸۶۶ ۸۶۷ ۸۶۸ ۸۶۹ ۸۷۰ ۸۷۱ ۸۷۲ ۸۷۳ ۸۷۴ ۸۷۵ ۸۷۶ ۸۷۷ ۸۷۸ ۸۷۹ ۸۸۰ ۸۸۱ ۸۸۲ ۸۸۳ ۸۸۴ ۸۸۵ ۸۸۶ ۸۸۷ ۸۸۸ ۸۸۹ ۸۹۰ ۸۹۱ ۸۹۲ ۸۹۳ ۸۹۴ ۸۹۵ ۸۹۶ ۸۹۷ ۸۹۸ ۸۹۹ ۹۰۰ ۹۰۱ ۹۰۲ ۹۰۳ ۹۰۴ ۹۰۵ ۹۰۶ ۹۰۷ ۹۰۸ ۹۰۹ ۹۱۰ ۹۱۱ ۹۱۲ ۹۱۳ ۹۱۴ ۹۱۵ ۹۱۶ ۹۱۷ ۹۱۸ ۹۱۹ ۹۲۰ ۹۲۱ ۹۲۲ ۹۲۳ ۹۲۴ ۹۲۵ ۹۲۶ ۹۲۷ ۹۲۸ ۹۲۹ ۹۳۰ ۹۳۱ ۹۳۲ ۹۳۳ ۹۳۴ ۹۳۵ ۹۳۶ ۹۳۷ ۹۳۸ ۹۳۹ ۹۴۰ ۹۴۱ ۹۴۲ ۹۴۳ ۹۴۴ ۹۴۵ ۹۴۶ ۹۴۷ ۹۴۸ ۹۴۹ ۹۵۰ ۹۵۱ ۹۵۲ ۹۵۳ ۹۵۴ ۹۵۵ ۹۵۶ ۹۵۷ ۹۵۸ ۹۵۹ ۹۶۰ ۹۶۱ ۹۶۲ ۹۶۳ ۹۶۴ ۹۶۵ ۹۶۶ ۹۶۷ ۹۶۸ ۹۶۹ ۹۷۰ ۹۷۱ ۹۷۲ ۹۷۳ ۹۷۴ ۹۷۵ ۹۷۶ ۹۷۷ ۹۷۸ ۹۷۹ ۹۸۰ ۹۸۱ ۹۸۲ ۹۸۳ ۹۸۴ ۹۸۵ ۹۸۶ ۹۸۷ ۹۸۸ ۹۸۹ ۹۹۰ ۹۹۱ ۹۹۲ ۹۹۳ ۹۹۴ ۹۹۵ ۹۹۶ ۹۹۷ ۹۹۸ ۹۹۹ ۱۰۰۰

نظام سلطنت میں جلوہ گر ہوئی) اس کا صحیح اندازہ ان کے خطوط اور سرکاری فرامین سے ہوتا ہے، جو انہوں نے وقتاً فوقتاً

سلطنت کے کارپردازوں اور اعلیٰ عہدہ داروں کو لکھے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کیا خالص اسلامی ذہن و دماغ بخشا تھا، جس پر جاہلیت کی کوئی پرچھائیں اور شاہان بنی امیہ کے اخلاق و افکار کا کوئی سایہ بھی نہیں پڑا تھا، یہاں چند خطوط پیش کئے جاتے ہیں۔

ان کو ایک مرتبہ معلوم ہوا کہ بعض قبائلی سردار اور عہدہ اموی کے نو دولت جاہلیت کی رسم حلف و محالفت کو زندہ کر رہے ہیں، اور جنگ و مقابلہ کے موقع پر یا لبی فلاں یا المصخر فلاں قبیلہ کی دہائی ہے، ہاں اے اہل مصر اپنے حلیف کی مدد کرو، کا جاہلی نعرہ لگانے لگے ہیں، یہ اسلام کے رشتہ، اخوت اور نظام اجتماعی کے متوازی ایک جاہلی نظام اور جاہلی رسم کا احیاء تھا، اور بہت سے فتنوں کا پیش خیمہ سابق فرمانروا شاید اس کو بعض ملکی مصالح سے شہ دیتے یا کم از کم اہمیت نہ دیتے، لیکن عمر بن عبد العزیز نے اس خطرہ کو محسوس کیا، اور اس کے بائے میں مستقل فرمان صادر کیا، اپنے ایک بڑے عہدہ دار سخاک ابن عبد الرحمن کو لکھتے ہیں:۔

”حمد و صلوة کے بعد معلوم ہو کہ بیشک اللہ تعالیٰ اس اسلام کے علاوہ جس کو وہ اپنے لئے اور اپنے بندگان خاص کے لئے پسند فرما چکا ہے، کسی دین کو قبول نہیں فرماتا، اللہ تعالیٰ نے اسلام کو اپنی اس کتاب سے عزت بخشی اور اس کے ذریعہ اسلام اور غیر اسلام میں تفریق کر دی ہے، ارشاد فرمایا:۔

قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللَّهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ
يَهْدِي بِيَدِ اللَّهِ مِنَ الضَّلَالَاتِ
سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُم مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى
النُّورِ بِإِذْنِهِ وَيَهْدِيهِمْ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ
تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی، اور ایک کتاب آئی، اس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں کو جو
ضلالتوں کے ظلمتوں میں اسلامی کی راہیں بتلاتے ہیں اور ان کو
توفیق سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتے ہیں اور

ان کو راہ راست پر قائم رکھتے ہیں۔

(المائدہ - ۱۶، ۱۵)

یہ جاہلیت میں ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا اور ایک شخص دوسرے شخص کا حلیف بن جاتا تھا، پھر وہ جاہلیت اس کی پاسداری کرتا تھا، اور حق و باطل میں اس کا ساتھ دیتا تھا۔

نیز ارشاد ہے:-

وَبِالْحَقِّ أَنْزَلْنَاهُ وَبِالْحَقِّ نَزَّلَهُ وَمَا
أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا مَبَشِّرًا وَنَذِيرًا
(اسراء ۱۰۵)

اللہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا، اور آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی، اس وقت تم اے اہل عرب (جیسا کہ تم کو معلوم ہے) ضلالت، جہالت، پریشانی، تنگی اور سخت انتشار میں مبتلا تھے، فقے نہ تھے، درمیان عام تھے، لوگ تم کو دباے ہوئے تھے، اور لوگوں کے پاس جو تھوڑا بہت دین باقی تھا، اس سے بھی تم محروم تھے، اس کے برعکس لوگوں کی گمراہیوں میں سے کوئی گمراہی ایسی نہیں تھی، جس میں تم مبتلا نہ ہو، تم میں سے جو زندہ رہتا تھا وہ جہالت و گمراہی کے ساتھ زندہ رہتا تھا، اور تم میں سے جو مرتا تھا، اس کا انجام جہنم ہوتا تھا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ان برائیوں، بتوں کی پرستش، جنگ و جدال، منافرت اور تعلقات کی خرابیوں سے صاف بچالیا، تم میں سے انکار کرنے والے نے انکار کیا، اور تم میں سے تکذیب کرنے والے نے جھٹلایا، اور اللہ کا پیغمبر اللہ کی کتاب اور اسلام کی دعوت دیتا رہا، پھر تم میں سے بہت کم اور کمزور لوگ اس پر ایمان لائے، ان کو ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا، کہ لوگ انہیں اچک نہ لیں، تو اللہ نے ان کو پناہ دی، اور اپنی مدد سے ان کی تائید کی، اور ان کو وہ لوگ عطا فرمائے جن کا اسلام لانا اس کو منظور ہوا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے جانے والے تھے، اور اللہ کو اپنے رسول سے اس وعدہ کو پورا کرنا تھا، جس میں کوئی تغیر و تبدل ممکن نہیں، اس وعدہ کو تھوڑے سے مسلمانوں کے علاوہ عام طور پر لوگوں نے بعید سمجھا تو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:-

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَ
دِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ
الْمُشْرِكُونَ ۝ (الصفت - ۹)

کرنے، گو شرک کیسے ہی ناخوش ہوں۔

بعض آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے خود مسلمانوں سے وعدہ کیا ہے، ارشاد فرماتا ہے کہ:-

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ كَمَا
اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ
لَهُمْ دِينَهُمُ الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ
مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ أَمْنًا يَعْبُدُونَنِي
لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا (نور ۵۵)

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اور مسلمانوں سے اپنے کئے ہوئے وعدہ کو پورا کر دیا، اے اہل اسلام! یاد رکھو تم کو اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی دیا، اسی اسلام کے صدقہ میں دیا ہے، جس کی بدولت تم اپنے دشمنوں پر فتح پاتے ہو، اور جس کی وجہ سے تم قیامت کے دن گواہ بنو گے، تمہارے لئے دنیا و آخرت میں اس کے علاوہ نہ نجات ہے، اور نہ کوئی حجت نہ کوئی بجاؤ ہے، اور نہ کوئی حفاظت کا سامان اور طاقت، جب اللہ تعالیٰ تم کو وہ بہترین دن نصیب کرے گا، جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے، تو موت کے بعد اللہ کے ثواب کی امید ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:-

يَلَذُّ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْآخِرَةِ لَيَسْتَعْلَمَنَّ الَّذِينَ
لَا يُؤْمِنُونَ عُلُوقَ الْأَرْضِ مِنْهُمْ وَأَقْبَادًا
وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ۝ (سورة القصص ۸۳)

یہ عالم آخرت ہم انہی لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں، جو دنیا میں نہ بڑھانا چاہیں، اور نہ فساد کرنا، اور نہ کج رفتاری، قطعاً لوگوں کو ملتا ہے۔

میں تم لوگوں کو اس قرآن اور اس پر عمل نہ کرنے کے نتائج بد سے ڈراتا ہوں، اس لئے کہ اس پر عمل نہ کرنے کے نتیجے میں جو واقعات پیش آئے ہیں امت میں جو خونریزی، جو غارتگری، جو پرانگندگی اور انتشار برپا ہوا، وہ تمہاری نگاہوں کے سامنے ہے، پس جس چیز سے اللہ نے تم کو اپنی کتاب میں منع کیا ہے، اس سے رک جاؤ، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی وعید سے

زیادہ کوئی چیز خوف اور احتیاط کی مستحق نہیں ہے.....
 جس چیز نے مجھے اس خط کے لکھنے پر مجبور کیا ہے، وہ یہ بات ہے، جو دیہات کے باشندوں کے متعلق مجھ سے
 ذکر کی گئی، اور ان لوگوں کی بابت جو نئے نئے حاکم اور عہدہ دار بنے ہیں، یہ سچا ہے اور جاہل قوم کے لوگ
 ہیں، احکام الہی کا ان کو علم نہیں، وہ اللہ کے معاملہ میں سخت دھوکہ میں مبتلا ہیں، اللہ تعالیٰ کا ان کے ساتھ جو معاملہ
 رہا ہے، اس کو وہ بھول گئے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کی انھوں نے ناشکری اور ناقدری کی ہے،
 جس تک پہنچنے کی ان میں صلاحیت نہیں تھی، مجھے بتایا گیا ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ جنگ میں مضر اور یمن
 والوں کا سہارا لیتے ہیں، اور ان کا خیال ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں ان کے حمایتی اور ولی ہیں، بحان اللہ
 وجمہ، ایسے قدر ناشکر گزار اور کافر نعمت ہیں، ان کو ہلاکت، ذلت و غوری کا کیسا شوق ہے؟ یہ دیکھتے
 نہیں کہ انھوں نے اپنے لئے کون سا مقام پسند کیا، کس امن و امان سے اپنے کو خروم کیا، اور کس گروہ سے اپنا
 تعلق پیدا کیا؟ اب مجھے معلوم ہوا کہ شقی اپنے ارادوں ہی سے شقی ہوتا ہے، اور جہنم بیکار نہیں پیدا کی گئی ہے،
 کیا ان لوگوں نے کلام پاک میں اللہ تعالیٰ کا یہ کلام نہیں سنا۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ
 اَخْوِيكُمْ وَيُؤْتِقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ
 (الحجرات ۱۰)

کیا انھوں نے یہ آیت کبھی نہیں سنی؟ :-
 آج کے دن تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا، اور
 میں نے تم پر اپنا انعام تام کر دیا، اور میں نے اسلام
 کو تمہارا دین بننے کے لئے پسند کر لیا۔
 (المائدہ ۳)

مجھے یہ بتایا گیا ہے کہ کچھ لوگ زمانہ جاہلیت کے طرز کی مخالفت کی دعوت دیتے ہیں، حالانکہ آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مشروط حمایت کے وعدہ سے منع فرمایا ہے، اور ارشاد ہے: "الاحلف فی الاسلام"
 (یعنی اسلام میں غلط دوستیاں اور جتنے بندے نہیں ہے) جاہلیت میں ہر حلیف دوسرے حلیف سے اس کی
 توقع رکھتا تھا کہ وہ اس کے معاہدہ اور رشتہ مخالفت کا حق ادا کرے گا، اور اس کو پورا کرے گا، خواہ وہ
 بالکل ظالمانہ اور فاجرانہ ہو، اور اس میں صریح اللہ اور رسول کی نافرمانی ہوتی ہو.....
 میں ڈراتا ہوں ہر اس شخص کو جو میرا یہ خط سنے، اور جس کو یہ خط پہنچے اس بات سے کہ وہ اسلام کے
 علاوہ کسی قلعہ کو اختیار کرے، اور اللہ و رسول اور مؤمنین کو چھوڑ کر کسی اور کو اپنا دوست بنائے،
 بڑے شد و مد سے اور بار بار اس سے آگاہ اور متنبہ کرتا ہوں، اور میں ان لوگوں پر اس ذات کو گواہ
 بنا رہا ہوں، جس کی قدرت اور تصرف میں تمام جان دار ہیں، اور جو ہر شخص کی شرک سے بھی زیادہ اس کے
 قریب ہے!

انھوں نے اپنے ایک فوجی افسر کو جنگ پر روانہ ہونے کے وقت جو ہدایت نامہ لکھا ہے، اس سے اندازہ
 ہوتا ہے کہ ان کا ذہن قرآن کے سانچے میں کس طرح ڈھل گیا تھا، اور ان کا نقطہ نظر اور طریق فکر دنیا دار
 بادشاہوں اور سیاسی حکمرانوں سے کس قدر مختلف تھا۔

منصور بن غالب کے نام ایک فرمان میں لکھتے ہیں:-

اللہ کے بندے امیر المؤمنین عمر کا یہ ہدایت نامہ منصور بن غالب کے نام جب کہ امیر المؤمنین نے ان کو
 اہل حرب سے اور ان اہل صلح سے جو مقابلہ میں آئیں، جنگ کرنے کے لئے بھیجا ہے، امیر المؤمنین نے ان کو حکم دیا
 ہے کہ ہر حال میں تقویٰ اختیار کریں، کیونکہ اللہ کا تقویٰ بہترین سامان، موثر ترین تدبیر اور حقیقی طاقت ہے،
 امیر المؤمنین ان کو حکم دیتے ہیں کہ وہ اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لئے دشمن سے زیادہ اللہ کی معصیت سے
 ڈریں، کیونکہ گناہ دشمن کی تدبیروں سے بھی زیادہ انسان کے لئے خطرناک ہے، ہم اپنے دشمنوں سے جنگ

لے سیرت عمر بن عبدالعزیز (ابن عبدالحکم) ۱۰۴، ۱۰۵، ترجمہ مولوی ابوالعرفان صاحب ندوی۔

کرتے ہیں اور ان کے گناہوں کی وجہ سے ہم ان پر غالب آجاتے ہیں، کیونکہ اگر یہ بات نہیں ہے تو ان کے دراصل ہم مقابلہ کی قوت نہیں ہے، کیونکہ نہ تو ہماری تعداد ان کی تعداد کے برابر ہے اور نہ ہمارا سامان ان کے سامان کے برابر ہے اگر ہم اور وہ دونوں معصیت میں برابر ہو جائیں تو وہ قوت اور تعداد میں ہم سے بڑھ کر ثابت ہوں گے، یاد رکھو! اگر ہم ان پر اپنے حق کی وجہ سے فتح نہ پاسکیں گے تو اپنی قوت کی وجہ سے بھی ان پر غالب نہ آسکیں گے اور اپنے گناہوں سے زیادہ کسی کی دشمنی سے چوکنانہ ہوں جہاں تک ممکن ہو اپنے گناہوں سے زیادہ کسی چیز کی فکر نہ کریں، سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے تم پر کچھ محافظ مقرر کئے گئے ہیں جو تمہارے سفر و حضر کے افعال کو جانتے ہیں، پس ان سے شرم کرو، اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ حسن سلوک کرو، اور ان کو اللہ کی نافرمانی کر کے ایذا نہ پہنچاؤ، خصوصاً ایسی حالت میں کہ تمہارا دعویٰ ہے کہ تم راہِ خدا میں نکلے ہوئے ہو، اور یہ مت سمجھو کہ ہمارے دشمن ہم سے گئے گئے ہیں، اس لئے گو ہم گناہ کار ہیں، لیکن وہ ہم پر غالب نہیں آسکتے، کیونکہ بہت سی ایسی قومیں ہیں جن پر ان کے گناہوں کی وجہ سے ان سے بدتر لوگوں کو مسلط کر دیا گیا ہے، پس اللہ تعالیٰ سے اپنے نفسوں کے مقابلہ میں مدد چاہو، جیسا کہ اللہ تعالیٰ سے تم اپنے دشمنوں کے مقابلہ میں مدد چاہتے ہو، میں بھی اپنے لئے اور تمہارے لئے اللہ تعالیٰ سے سوال کرتا ہوں۔

اور امیر المؤمنین منصور بن غالب کو حکم دیتے ہیں کہ سفر میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کریں، اور اپنے ساتھیوں کو ایسی قطع مسافت پر مجبور نہ کریں، جو مشقت میں مبتلا کر دے، اور سفر میں کسی ایسی منزل پر پڑاؤ سے گزیر نہ کریں جس سے ان کو آرام ملتا ہو، یہاں تک کہ ان کا دشمنوں سے اس حالت میں سامنا ہو کہ سفر کے تھکان نے ان کی قوتوں کو گھٹانہ دیا ہو، وہ ایسے دشمن کے پاس جا رہے ہیں جو اپنے گھروں میں ہیں، ان کا سامان اور سواریاں سستائی ہوئی ہیں، پس اگر سفر میں اپنے اور اپنی سواروں کے ساتھ نرمی کا معاملہ نہ کریں گے، تو ان کے دشمنوں کو ان پر زیادہ قوت حاصل ہوگی، کیونکہ دشمن اپنے گھروں میں ہیں، جہاں ان کے آدمی اور سواریاں آرام کئے ہوئے ہیں، اور اللہ ہی سے مدد چاہی جاتی ہے۔

اور امیر المؤمنین ان کو حکم دیتے ہیں کہ ہر جمعہ ایک رات اور دن سفر نہ کریں اور آرام کریں جس میں خود کو اور جانوروں کو آرام پہنچائیں، اور اپنے سامان اور ہتھیاروں کی مرمت کریں، اور امیر المؤمنین ان کو حکم دیتے ہیں کہ اپنا قیام صلح کی بستیوں سے الگ رکھیں، امن و امان والی بستیوں میں ان کے ساتھیوں میں سے کوئی نہ جائے، نہ ان کے بازاروں میں، نہ ان کی مجلسوں میں، ہاں وہ شخص جاسکتا ہے جس کو اپنے دین اور امانت پر پورا بھروسہ ہو، اور نہ ان بستی والوں پر ظلم کریں اور نہ وہاں سے اپنے لئے گناہ جمع کریں، اور نہ ان کو کچھ اذیت پہنچائیں، سوائے اس کے کہ شرعی مطالبہ یا واجبی حق ہو، کیونکہ ان کا حق اور ان کی ذمہ داری ہے، جس کے پورا کرنے کا تم کو اسی طرح ذمہ دار بنایا گیا ہے، جس طرح کہ وہ لوگ حقوق و ذمہ کی پابندی کے مکلف ہیں، پس جب تک کہ وہ لوگ اپنے حقوق کی ادائیگی پر ثابت قدم رہیں، تم لوگ بھی ان کے حقوق ادا کرتے رہو، اور صلح والوں پر ظلم کر کے جنگ لے ملکو، پناہ حاصل کرو، قسم اللہ کی تمہیں ان لوگوں کے مال میں سے اتنا حصہ پہلے ہی دے دیا گیا ہے کہ اب مزید کی گنجائش ہے نہ ضرورت، ہم نے تمہارے سامان میں کوئی کوتاہی بھی نہیں کی ہے، اور نہ تمہاری قوت میں کوئی ضعف رہنے دیا ہے، اور تمہارے لئے سامان اچھی طرح جمع ہو گیا ہے، تمہیں ایک منتخب فوج دی گئی ہے، اور شرکائے ملکوں کی طرف تم کو مشغول کر کے صلح والوں کی طرف سے تمہاری توجہ ہٹائی ہے، اور ایک مجاہد کے لئے جتنا بندوبست کر سکتا تھا، اس سے بہتر تمہارے لئے کر دیا، ہم نے تمہارے لئے قوت کی ہم رسائی میں کوئی گنجائش نہیں چھوڑی، اور اللہ ہی پر بھروسہ ہے، "وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللَّهِ" اور امیر المؤمنین کی ہدایت ہے کہ ان کے جاسوس عرب اور اہل ملک میں سے وہ لوگ ہوں جن کے اخلاص اور صدق پر ان کو اطمینان ہو، کیوں کہ دروغ گوئی اطلاع نفع نہیں پہنچاتی، اگرچہ اس کی کوئی بات صحیح بھی ہو، فریب دہندہ دراصل تمہارے دشمن کا جاسوس ہے، تمہارا جاسوس نہیں۔ وَالسَّلَامُ عَلَيْكَ

اور دولت کی وہ فراوانی ہوئی کہ زکوٰۃ قبول کرنے والا ڈھونڈھے سے نہیں ملتا تھا۔

یحییٰ بن سعید کہتے ہیں کہ مجھے عمر بن عبدالعزیز نے افریقہ میں زکوٰۃ کی تحصیل وصول پر مقرر کیا، میں نے زکوٰۃ وصول کی، جب میں نے اس کے مستحق تلاش کئے، جن کو وہ رقم دی جائے تو مجھے ایک بھی محتاج نہیں ملا، اور ایک شخص بھی ایسا دستیاب نہیں ہوا، جس کو زکوٰۃ دی جاسکے، عمر بن عبدالعزیز نے سب کو غنی بنا دیا، آخر میں نے کچھ غلام خرید کر آزاد کئے، اور ان کے حقوق کا مالک مسلمانوں کو بنا دیا۔

ایک دوسرے قریشی کہتے ہیں کہ عمر بن عبدالعزیز کی مختصر مدتِ خلافت میں یہ حال ہو گیا تھا کہ لوگ بڑی بڑی رقمیں زکوٰۃ کی لے کر آتے تھے کہ جس کو مناسب سمجھا جائے دے دیا جائے، لیکن مجبوراً واپس کرنی پڑتی تھیں کہ کوئی لینے والا نہیں ملتا، عمر کے زمانہ میں سب مسلمان غنی ہو گئے، اور زکوٰۃ کا کوئی مستحق نہیں رہا۔

ان ظاہری برکات کے علاوہ (جو صحیح اسلامی حکومت کا ثانوی نتیجہ ہیں) بڑا انقلاب یہ ہوا کہ لوگوں کے رجحانات بدلنے لگے، اور قوم کے مزاج و مذاق میں تبدیلی ہونے لگی، ان کے معاصر کہتے ہیں کہ ہم جب لید کے زمانہ میں جمع ہوتے تھے، تو عمارتوں اور طرز تعمیر کی بات چیت کرتے تھے، اس لئے کہ لید کا یہی اصل ذوق تھا، اور اس کا تمام اہل مملکت پر اثر پڑ رہا تھا، مسلمان کھانوں اور عورتوں کا بڑا شائق تھا، اس کے زمانہ میں مجلسوں کا موضوع سخن یہی تھا، لیکن عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں نوافل و طاعات ذکر و تذکرہ گفتگو اور مجلسوں کا موضوع بن گیا، جہاں چار آدمی جمع ہوتے تو ایک دوسرے سے پوچھتے کہ رات کو تمہارا کیا پڑھنے کا معمول ہے، تم نے کتنے قرآن یاد کیا ہے، تم قرآن کب ختم کرو گے، اور کب ختم کیا تھا، مہینے میں کتنے روزے رکھتے ہو۔

ان کی زندگی کا جوہر

عمر بن عبدالعزیز کی زندگی کا جوہر اور ان کی تمام سرگرمیوں اور جدوجہد کی روح اور قوتِ محرکہ

ان کا قوی ایمان آخرت کا یقین اور جنت کا شوق ہے، انہوں نے جو کچھ کیا، خدا کے خوف اور اس کی رضا کے شوق میں کیا، اور یہی وہ طاقت تھی جو اپنے وقت کے اس سب سے بڑے طاقتور حکمران کو روئے زمین کی سب سے بڑی سلطنت کی ترغیبات اور وسائل کے مقابلہ میں ثابت قدم رکھتی تھی، ان کو کوئی اگر اس طرز عمل کے خلاف نصیحت کرتا اور تمتع و لطف اندوزی کی ترغیب دیتا، تو ہمیشہ یہ آیت پڑھ دیا کرتے تھے۔

إِنِّي أَخَافُ أَنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ

اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو مجھے ایک

يَوْمٍ عَظِيمٍ (الانعام ۱۵) بڑے دن کے عذاب کا خطرہ ہے۔

انہوں نے ایک موقع پر اپنے خادم سے کہا تھا، اور یہ ان کی صحیح تعریف تھی کہ اللہ نے مجھے بڑی حوصلہ مند طبیعت دی ہے، جو مرتبہ بھی مجھے حاصل ہوا، میں نے اس سے بلند تر مرتبہ کی تمنا کی، اور اب میں اس مقام پر پہنچ گیا ہوں کہ کوئی مرتبہ باقی نہیں رہا، اب میری حوصلہ مند طبیعت جنت کی مشاق و متمنی ہے، ان کی رقت و خشیت کا یہ حال تھا کہ ایک شخص سے انہوں نے نصیحت کی فرمائش کی اس نے کہا کہ اگر خدا نے تم کو جہنم میں ڈال دیا، اور ساری دنیا جنت میں چلی گئی تو تمہیں کیا فائدہ ہوا، اور اگر ساری دنیا جہنم میں چلی گئی، اور تمہیں اللہ نے جنت نصیب کی، تو تمہارا کیا نقصان ہوا، یہ سن کر وہ اس قدر روئے کہ ان کے سامنے جو انگلیٹھی رکھی تھی، وہ بچھ گئی، یزید بن حوشب کہتے ہیں کہ معلوم ہوتا تھا کہ جنت و دوزخ صرف عمر بن عبدالعزیز اور حسن بصری کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

عمر بن عبدالعزیز کی وفات

اگر اللہ کو منظور ہوتا اور عمر بن عبدالعزیز کو اپنے کسی پیش رو کی مدتِ خلافت مل جاتی تو پوری اسلامی مملکت میں گہرا اور دیرپا انقلاب ہو جاتا اور مسلمانوں کی تاریخ ہی دوسری ہوتی، لیکن بنی امیہ جن کو اپنے

اس فرد خاندان کی خلافت میں سب سے بڑی قربانی کرنی پڑی تھی اور جو اپنی بے تکلف مجلسوں میں حضرت عمرؓ کے گھرانے میں رشتہ کرنے پر بہت پھپھکتے رہتے تھے، زیادہ دن تک اس مجاہدہ کو برداشت نہ کر سکے اور انھوں نے جلد ان سے خلاصی حاصل کر کے مسلمانوں کو اس عطیہ خداوندی سے محروم کر دیا، سیدنا عمر بن عبدالعزیزؓ کل دو سال پانچ مہینے خلافت کر کے سن ۶۴۴ء میں دنیا سے رخصت ہوئے، اس بات کے آثار و قرائن موجود ہیں کہ ان کے خاندان نے ان کو زہر دیا۔



دوسری صدی کی اصلاحی کوششیں

اور

حضرت حسن بصریؒ

امت میں خلاقی انحطاط اور ایمانی ضعف

حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ کی وفات کے بعد حکومت کا دھارا اسی طرح بہنے لگا، جیسا کہ ان سے پہلے بہتا تھا، جاہلیت نے اپنے بچے مضبوطی کے ساتھ گاڑ لئے، ان کے جانشین نے (جس کو سلیمان ان کے بعد خلیفہ بنا گیا تھا) اور اس کے جانشینوں نے اس ناپستیدہ وقفہ کی تلافی کی پوری کوشش کی، اور حکومت کو اسی چول پر لے آئے جس پر وہ سلیمان کے زمانہ تک تھی۔

اب صورت حال یہ تھی کہ شخصی و موروثی حکومت کے تسلسل اور دولت و کامیابی کی فراوانی سے اسلامی معاشرہ میں "نفاق" کے جراثیم اور "مترفین سابقین" (گذشتہ امتوں کے دولت مندوں اور عیش پسندوں) کے اخلاق و اعمال پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے، سوسائٹی میں تعیش کا عمومی رجحان پیدا ہو گیا تھا ایمان و عمل صالح کی زندگی جو اس امت کا قیمتی سرمایہ اس کی قوت کار اور نبوت کا ایک بیش قیمت ترکہ تھا اس وقت خطرہ میں تھی اندیشہ تھا کہ یہ امت اخلاقی حیثیت سے دیوالیہ اور روحانی حیثیت سے کھوکھلی نہ ہو جائے، قلوب میں سردی و افسردگی، ایمان میں کمزوری اور تعلق بالشر میں اضمحلال بڑی شدت و سرعت سے پیدا ہونا چلا آ رہا تھا، اور یہ بڑی تشویش کی بات تھی، حکومت اس جوہر کی حفاظت اور پرورش سے نہ صرف غافل و بے تعلق تھی، بلکہ اس کا وجود اور اس کے ناپسندے اس مقصد کے لئے حقیقی خطرہ

بنے ہوئے تھے اور اپنی ذاتی سیرت و کردار سے وہ اس اخلاقی انحطاط کے محرک داعی تھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس امت میں ایمان اللہ تعالیٰ کے ساتھ زندہ تعلق اور انابت و عبودیت کی جو کیفیت پیدا کی تھیں اور جو ایک نبی ہی پیدا کر سکتا ہے وہ رو بہ نازل تھیں یہ وہ کمی تھی جو حکومت کے رقبہ کی توسیع اور بڑی سے بڑی فتوحات سے پوری نہیں کی جاسکتی تھی اور جو ایک مرتبہ زائل ہونے کے بعد (پچھلی امتوں کی تاریخ اس کی شاہد ہے) بڑی مشکل سے واپس لائی جاسکتی ہیں۔

اگر اس سرمایہ کی حفاظت نہ کی جاتی اور زمانہ کے اثرات اور اخلاقی و سیاسی عوامل کو آزادی کے ساتھ اپنا عمل کرنے کی اجازت دے دی جاتی تو یہ امت بھی سابقہ امتوں کی طرح ایک نفس پرور آخرت فراموش مادہ پرست قوم بن کر رہ جاتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے آخری ایام میں سب سے زیادہ خطرہ اسی بات کا تھا کہ یہ دنیا مسلمانوں کو مضہم نہ کر لے اور وہ اگلی امتوں کی طرح اس کے دھارے میں پڑ کر ضائع نہ ہو جائیں اپنے وفات سے چند دن پہلے جو خطبہ ارشاد فرمایا تھا اس میں صاف صاف کہا تھا۔

ما الفقر اخشی علیکم و لکن اخشی

علیکم ان تبسطوا لعلکم کما

بسطت علی من کان قبلكم

فتنا فسوها کما تفسوها فتهلکم

کما اهلکتهم۔

کرد اور تم کو بھی وہ اسی طرح ہلاک کرے جیسے

انگلوں کو ہلاک کیا۔

تابعین کی دعوتِ ایمانی

یہ خطرہ جس کا زبان نبوت نے اظہار کیا تھا، جلد پیش آگیا، لیکن اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لئے

اللہ کے کچھ مخلص اور سرفروش بندے میدان میں آئے، جنہوں نے اپنی قوتِ ایمانی سوزدروں، صحبت و تربیت و عطا و نصیحت اور دعوت و تلقین سے لاکھوں آدمیوں کو مادیت کے اس طوفان میں تنگے کی طرح بہنے سے بچایا، اور خود اس سیلاب کی رفتار کو سست کر دیا، انہوں نے امت کے ایمانی و روحانی تسلسل کو قائم رکھا، جو اس کے نسلی و سیاسی تسلسل سے زیادہ ضروری تھا، اور اس کی زندگی میں وہ خلا نہیں آنے دیا، جس میں محض ایک بے سیرت بے روح اور بے یقین قوم بن کر رہ جائے اس فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لئے فضلاً تا بعین کی ایک سربراہ آوردہ جماعت تھی جن میں سعید بن جبیر، محمد بن سیرین اور شعبی خاص طور سے ممتاز تھے۔

حسن بصری

لیکن اس خطرہ کے اصل حریف اور ایمانی دعوت کے علمبردار حضرت حسن بصری ہیں، جو ۲۰ھ میں پیدا ہوئے ان کے والد یسار مشہور صحابی حضرت زید بن ثابت کے آزاد کردہ غلام تھے اور خود انہوں نے ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر میں پرورش پائی تھی۔

حسن بصری کی شخصیت ان کی داعیانہ صلاحیتیں

حضرت حسن بصری میں اللہ تعالیٰ نے وہ تمام صلاحیتیں جمع فرمادی تھیں، جو اس دور کے مخصوص حالات میں دین کا وقار بڑھانے اور دینی دعوت کو موثر بنانے کے لئے درکار ہیں، ان کی شخصیت میں بڑی جامعیت، دل آویزی اور کشش تھی، ایک طرف وہ دین میں پورا تبحر اور گہری بصیرت رکھتے تھے، بلند پایہ مفسر اور مستند محدث تھے جس کے بغیر اس وقت کوئی اصلاحی کوشش انجام نہیں پاسکتی تھی، صحابہ کرام کا انہوں نے اچھا خاصا زمانہ پایا تھا، اور معلوم ہوتا ہے کہ بڑے غور سے اس کا مطالعہ کیا تھا، مسلمانوں کی زندگی اور اسلامی معاشرہ میں جو تغیرات پیش آئے تھے، ان پر گہری نظر رکھتے تھے، اپنے زمانہ کی سوسائٹی، ہر طبقہ کی زندگی اور معاشرہ

سے وہ پورے طور پر باخبر تھے اور اس کی خصوصیات اور اس کی بیماریوں سے ایک تجربہ کار طبیب کی طرح واقف تھے، وہ بڑے فصیح و بلیغ اور شیریں زبان تھے، وہ جب گفتگو کرتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے، جب آخرت کا بیان کرتے تھے، باصحاب کرام کے دور کی تصویر کھینچتے تھے تو آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتی تھیں، حجاج بن یوسف کا سازبان اور اورقادر الکلام اس اخیر دور میں نہیں گذرا، لوگ حسن بصری اور حجاج کو فصاحت میں ہم پایہ سمجھتے تھے، مشہور امام لغت و نحو ابو عمرو بن العلاء کہتے ہیں کہ میں نے حسن بصری اور حجاج بن یوسف سے بڑھ کر فصیح نہیں دیکھا، اور حسن حجاج سے زیادہ فصیح تھے۔ وسعت علم کا یہ حال تھا کہ ربیع بن انس کہتے ہیں کہ میں دس برس تک حسن بصری کے پاس آتا جاتا رہا، ہر روز ان سے کوئی ایسی بات سنتا تھا، جو اس سے پہلے نہیں سنی، ایک شخص نے ان کی اس جامعیت کو اس طرح بیان کیا:-

کان من دساری النجوم علما وتقوی وہ اپنے علم و تقویٰ، زہد و ورع و استغناء و عالی ہمتی
وزہدا و ورعا و عفة و رقة، و فقہا لطافت، تفقہ اور علم کے اعتبار سے ایک رختاں
ومعرفة یجمع مجلسہ ضر و با من الناس ستارہ تھے، ان کی مجلس میں قسم قسم کے لوگ جمع رہتے
هذا یأخذ عنہ الحدیث، وهذا یلقن تھے، اور ہر ایک فیض پاتا تھا، ایک شخص حدیث
منہ التاویل وهذا یسمع منہ الحلال حاصل کر رہا ہے، ایک تفسیر میں استفادہ کر رہا ہے ایک
والمحرام، وهذا ینحلی لہ الفتیا وهذا فقہ کا درس لے رہا ہے اور ایک فتویٰ پوچھ رہا ہے
یتعلم الحکم والقضا، وهذا یسمع الوعظ کوئی مقدمات فیصل کرنے اور قضا کے قواعد سیکھ رہا
وهو فی جمیع ذلك کالبحی العجاج ند فقا ہے، کوئی وعظ سن رہا ہے، اور وہ ایک بحرِ زخار میں جو
فکالسراج الوہاج تالفا ولا تنس مواقف موحی لے رہا ہے، اور ایک روشن چراغ ہیں جو مجلس کو
ومشاهدة فی الامر بالمعروف والنہی پر نور کر رہا ہے پھر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے

عن المنکر عند الامراء و اشباہ الامراء سلسلہ میں ان کے کارنامے اور حکام و امرا کے زہد
بالکلام الفصل واللفظ المجزل۔ پوری فصاحت اور پر شکوہ الفاظ میں انہما حق کے
واقعات بھلانے کی چیز نہیں۔

اس سب کے علاوہ اور اس سب سے بڑھ کر ان کی تاثیر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ محض صاحبِ حال اور صاحبِ کمال نہ تھے، بلکہ صاحبِ دل اور صاحبِ حال بھی تھے، وہ جو کچھ کہتے تھے ان کے دل سے نکلتا تھا، اس لئے دل پر اثر کرتا تھا، جس وقت وہ تقریر کرتے تھے، سراپا درد و اثر ہوتے تھے، اس کا نتیجہ تھا کہ اگرچہ بصرہ میں کوفہ میں بڑے بڑے صاحبِ علم اور صاحبِ درس تھے، مگر ان کے حلقہٴ درس میں مقناطیس کی کشش تھی، ان کے مواعظ و بیانات کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ ان کو کلام نبوت سے بڑی مناسبت تھی۔

امام غزالی نے اجیاء العلوم میں لکھا ہے کہ اس پر اتفاق ہے کہ حسن بصری کا کلام انبیاء علیہم السلام کے طرزِ کلام سے بڑی مناسبت رکھتا ہے ایسی مناسبت دوسرے واعظین کے کلام میں نہیں دیکھی گئی، اسی طرح ان کا طرزِ زندگی صحابہ کرام کے طرزِ زندگی سے بہت مشابہ تھا۔

ان کی ان خصوصیات و جامعیت کا یہ اثر تھا کہ لوگ ان کی شخصیت سے مسحور تھے، اور ان کو امت محمدی کے ممتاز ترین افراد میں شمار کرتے تھے، تیسری صدی کے ایک غیر مسلم فلسفی (ثابت بن قرہ) کا مقولہ ہے کہ امتِ محمدیہ کی جن چند ممتاز ترین شخصیتوں پر دوسری امتوں کو رشک آنا چاہئے ان میں حسن بصری بھی ہیں مگر معظمہ ہمیشہ سے عالمِ اسلام کا مرکز ہے، وہاں ہر فن کے صاحبِ کمال آتے رہتے ہیں، لیکن اہل مکہ بھی حسن بصری کا علم دیکھ کر ان کی تقریریں سن کر ششدر رہ گئے کہ ہم نے ان جیسا آدمی نہیں دیکھا۔

حسن بصری کے مواعظ

حسن بصری کے مواعظ دورِ صحابہ کی قوت و سادگی کا نمونہ ہیں، ان میں زیادہ تر دنیا کی بے ثباتی،

زندگی کی بے وفائی، اور آخرت کی اہمیت کا مضمون، ایمان و عمل کی تلقین، تقویٰ اور خشیت الہی کی تعلیم، طول اہل اور فریب نفس کی مذمت ملتی ہے، اور اس دور میں جس پر مادیت اور غفلت کا سخت حملہ ہوا تھا، اور عوام اور بہت سے خواص دولت اور عیش و عشرت کے سیلاب میں خش و خاشاک کی طرح بہے چلے جائے تھے، انہی مصائب کی ضرورت تھی، انہوں نے چونکہ صحابہ کرام کا دور اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اور ان کی صحبت کا فیض اٹھایا تھا، اب حکومت امویہ کا ثبات کچھ رہے تھے، اس لئے وہ اپنے مواعظ میں اکثر بڑے درد و جوش کے ساتھ صحابہ کرام کی ایسی کیفیات اور ان کی اخلاقی و عملی خصوصیات بیان کرنے لگتے ہیں، اور جب وہ ان دونوں زمانوں کا مقابلہ کرتے ہیں، اور اس عظیم انقلاب کا تذکرہ کرنے لگتے ہیں، جو ان کو دیکھتے دیکھتے ایمان و عمل اور اخلاق و عادات میں رونما ہوا تھا تو ان کا درد اور جوش بہت بڑھ جاتا ہے، اور ان کے مواعظ تیر و نشتر بن جاتے ہیں، اور ان کے مواعظ اپنی دل آویزی اور دل نشینی کے علاوہ اس دور کی فصیح و بلیغ زبان اور اعلیٰ ادب کا نمونہ ہیں، ایک موقع پر اہل زمانہ پر تبصرہ، صحابہ کرام کا تذکرہ اور اسلامی اخلاق کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں:-

ہیہات ہیہات اهلك الناس الاماني
ہائے افسوس! لوگوں کو امیدوں اور خیالی منصوبوں نے
قول بلا عمل، ومعرفة بغير صبر وایمان
غارت کیا، زبانی باتیں ہیں عمل کا نام نشان نہیں، علم ہے
بلا یقین، مالی اسری، رجالاً ولا اسری
مگر اس کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے صبر نہیں، ایمان ہے
عقولاً وایماناً، ولا اسری انیسا،
مگر یقین سے خالی، آدمی بہت نظر آتے ہیں، مگر دماغ نایاب
دخل القوم والله ثم خرجوا، وعرفوا
آنے جانے والوں کا شور ہے مگر ایک بندہ خدا ایسا نظر
ثم انكروا وحرمو انهم استعملوا، انما دین
نہیں آتا جس سے دل لگے، لوگ داخل ہوئے اور پھر
احدکم لعنة علی لسانہ اذا سئل المؤمن
نکل گئے، انہوں نے سب کچھ جان لیا پھر مگر گئے انہوں نے
انت بیوم الحساب؛ قال نعم! کذب
پہلے حرام کیا، پھر اسی کو حلال کر لیا، تمہارا دین کیلئے؟
وما لك يوم الدين ان من اخلاق
زبان کا ایک چٹا ہوا، اگر پوچھا جاتا ہے کیا تم روز حساب

المؤمنین قوۃ فی دین، وایماناً فی یقین
پر یقین رکھتے ہو، تو جواب ملتا ہے کہ ہاں ہاں قسم
وعلماً فی حلم وعلماً بعلم وکیساً فی
ہے روز جزا کے مالک کی، غلط کما، مومن کی شان تو
رفق وتمعلاً فی فاقہ وقصداً فی غنی
یہ ہے کہ وہ قوی فی الدین ہو، صاحب ایمان و یقین
وشفقتاً فی نفقۃ ورحمۃ لمجھود، وعظماً
ہو، اس کے علم کے لئے، علم اور اس کے علم کے لئے علم پاش
فی الحقوق، وانصافاً فی استقامۃ لا یجیف
زینت ہو، عقلمند ہو، لیکن نرم خوا، اس کی خوش پوشی
علی من یبغض ولا یاتم فی مساعدۃ من
اور ضبط اس کے فقر و افلاس کی پردہ داری کرے،
یحیب ولا یمز ولا یغمز ولا یلمز ولا یلغو
دولت ہو تو اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے
ولا یلہو ولا یلعب، ولا یشی بالنیمۃ
پائے، خرچ کرنے میں شفیق، ہستہ حالوں کے حق میں
ولا یتبع مالیس له ولا یجد الحق الذی
رحیم و کریم حقوق کی ادائیگی میں کشادہ دست و فراخ دل
علیہ، ولا یتجاوز فی العذر ولا یشتم
انصاف میں سرگرم و ثابت قدم کسی سے نفرت ہو تو اس کے
بالفیجۃ ان حلت بغيره ولا یسر
حق میں زیادتی نہ ہونے پائے کسی سے محبت ہو تو اس کی
بالمعصیۃ اذا نزلت بسواہ، المؤمن
مدد میں حد شریعت سے نہ بڑھنے پائے، نہ عیب چینی کرتا ہو،
فی الصلوۃ فما شح والی الرکوع مراع
نظر و اشارہ نہ طعن و تشنیع نہ لایحیی سے اس کو کچھ کام
قولہ شفاء وصبرۃ تقویٰ وسلوۃ فکرۃ
ہو نہ ہو و لعب و بچی چغلی خوری نہیں کرتا، جو اس کا حق
مگر یقین سے خالی، آدمی بہت نظر آتے ہیں، مگر دماغ نایاب
ونظرۃ عبرۃ، یمخالط العلماء لیعلم
نہیں اس کے پیچھے نہیں پڑتا جو اس پر واجب آتا ہے
ویسکت بینہم لیسلم ویتکلم لیغتم
اس کا انکار نہیں کرتا، معذرت میں حد نہیں بڑھتا
ان احسن استبشر وان اساء استغفر
دوسرے کی مصیبت میں خوش نہیں ہوتا، دوسرے کی
وان عتب استعتب، وان سفہ علیہ
مصیبت سے اس کو مسرت نہیں ہوتی، مومن کو نماز
حلم، وان ظلم صبر وان جبر علیہ
میں خشوع اور نمازوں کا ذوق ہوتا ہے اس کا کلام

عدل ولا يتعوز بغير الله ولا يستعين
 الا بالله وقور في الملاء، شكور في الخلاء
 قانع بالرزق، حامد على الوفاء، صابر
 على البلاء ان جلس مع الغافلين كتب
 من الذاكرين وان جلس مع الذاكرين
 كتب من المستغفرين، هكذا كان
 اصحاب النبي صلى الله عليه وسلم،
 الا اول فالاول حتى لحقوا بالله عز وجل
 وهكذا كان المسلمون من سلفكم الصالح
 وانما غيركم لما غيرتم ان الله لا يغير
 ما يقوم حتى يغيره فاما بانفسهم واذا
 اراد الله بقوم سوء فلا مرد له وما لهم
 من دونه من قال

شفاهاك ايام اس کا صبر تقویٰ اس کا سکوت سراسر
 غور و فکر اس کی نظر سراپا درس و عبرت علماء کی صحبت
 اختیار کرتا ہے علم کی خاطر خاموش رہتا ہے تو اس لئے کہ گناہوں
 اور گرفت سے محفوظ رہے بولتا تو اس لئے کہ کچھ ثواب کم سے
 اور فائدہ حاصل کرے نیکی کر کے اس کو خوشی ہوتی ہے غلطی
 ہو جاتی ہے تو استغفار کرتا ہے شکایت کرتا ہے اور اس کے
 دل میں کسی کی طرف سے رنج آتا ہے تو معافی مانگ کر لیتا ہے اس
 کوئی جہالت کرتا ہے تو وہ تحمل اور عقل سے کام لیتا ہے ظلم
 کیا جاتا ہے تو وہ صبر کرتا ہے کوئی اس کے حق میں نا انصافی
 کے تو وہ انصاف کو نہیں چھوڑتا، اللہ تعالیٰ کے سوا کسی
 کی پناہ نہیں لیتا، اور اس کے سوا کسی پر نہیں چاہتا مجمع
 میں باوقار تنہائی میں شکر گزار رزق پر قانع، آرام و عیش
 کے زمانہ میں شکر، مصیبت اور آزمائش کی گھڑیوں میں صبر
 غافلوں میں ذکر، ذاکروں میں ہو تو استغفار میں شافل
 یعنی شاکستار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے درجوں اور
 مرتبہ کے مطابق جب تک نیا میں ہے اسی نشان ہے اور جب
 دنیا سے گئے تو اسی آن بان گئے، مسلمانوں! تمہارے سلف صالحین کا
 پیروی نہ تھاجتیم نے اللہ کے ساتھ اپنا معاملہ بدل لیا تو اللہ نے بھی

تمہارے ساتھ اپنا معاملہ بدل لیا ان الله لا يغير ما يقوم حتى يغيره فاما بانفسهم واذا اراد الله بقوم سوء فلا مرد له وما لهم من دونه من قال

ایک دوسرے موقع پر صحابہ کرام کو یاد کرتے ہوئے اور سورہ الفرقان کی ان آیتوں کی تفسیر بیان کرتے ہوئے جن میں مومنین کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں فرمایا:-

ان المؤمنین لما جاء تنهم هذه الدعوى
 من الله صدقوا بها واخضى يقينها الى
 قلوبهم خشعت لله قلوبهم وابدانهم
 وابصارهم كنت والله اذ اسأتينهم
 رآيت قوما كانوا هم اى عين والله
 ما كانوا باهل جدل ولا باطل ولكنهم
 جاءهم امر عن الله فصدقوا به فتحتم
 الله فى القران احسن نعت قال وعباد
 الرحمن الذين يمشون على الارض
 هونا والهون فى كلام العرب اللين و
 السكينة والوقار واذا خاطبهم الجاهلون
 قالوا اسلاما حلما ولا يجهلون وان
 جهل عليهم جلسوا ايضا جسون
 عباد الله نهاسهم بما يسمعون
 ثم ذكر ليهم خير ليل فقال والذين
 يبيتون لربهم سجدا وقياما، ينتصبون
 لله على اقدامهم ويفترشون وجوههم

مومنین (اولین) کے کان میں جب خدا کی یہ پکار
 پہنچی تو انھوں نے اسی وقت اس کی تصدیق کی اور
 اس پر لبیک کہا، اس کا یقین ان کے دلوں کی گہرائی میں
 اتر گیا ان کے دل ان کے بدن اور ان کی نگاہیں خدا کی
 عظمت اور ہیبت میں جھک گئیں بخدا میں جب ان کو
 دیکھتا تو صفا معلوم ہوتا کہ دین حقائق اور غیب کی باتیں
 گویا ان کی آنکھوں کی جیسی تحقیق ہیں ان کو بخت و حسد
 اور فضول باتوں کے کچھ کام نہ تھا، ان کو تو خدا سے ایک چیز
 پہنچی اور انھوں نے مان لی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید
 میں ان کا بہترین سراپا کھینچا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے
 الرحمن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ
 چلتے ہیں آیت میں "هونا" کا لفظ آیا ہے "هون"
 کے معنی کلام عرب میں نرمی و سکینہ اور وقار کے ہیں پھر
 فرمایا اور جب ان کے سمجھ لوگ باگریں تو کہتے ہیں سلام
 ہے یعنی وہ ضابط و حلیم ہیں جہالت پر نہیں اترتے اور
 اگر کوئی دوسرا جہالت پر اترے تو ان کے علم و وقار میں
 فرق نہیں آتا، یہ لوگ اللہ کے بندوں کے ساتھ کام کی

سجداً لبہم تجری دموعہم علی
خدا و دہم فرقاً من ربہم لا مرما
سہرو الیہم ولا مرمانشعوانہارہم
قال الذین یقولون ربنا اصرِفْ
عنا عذاب جہنم اِنَّ عذابہا کان
عزماً و کل شیء یصیب ابن ادم ثم
یزول عنہ فلیس بغرام انما الغرام
اللازم لہ مادامت السموات و الارض
صدق القوم و اللہ الذی لا الہ الا هو
فعملوا وانتم تمعون فایاکم و ہذا
الاعمالی رحمکم اللہ فان اللہ لم یعط
عبداً امانتہ شیئاً فی الدنیا و الاخرۃ
بات سننے کے لئے دن گزارتے تھے پھر ان کی بڑی اچھی
راتیں گزرتی تھیں جن کی اللہ تعالیٰ خود تعریف کرتے اور
وہ لوگ اپنے رب کے سامنے سجدیں اور کھڑے ہو کر رات
گزارتے ہیں واقعی یہ لوگ اپنے پاؤں پکھڑے ہو جاتے
چہروں کو خاک پر رکھ دیتے اور سجدیں پڑھتے، ان کے
رخسائیں پر آنسوؤں کا تار بندھ جاتا، اللہ کا خوف ان کی
آنکھوں کو اٹکھا رکھتا، آخر کوئی توبہ بات تھی جس کے لئے
وہ راتیں آنکھوں میں کاشتیتے، کوئی توبہ بات تھی جس کا وہ
دن میں سہے سہے رہتے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اور وہ لوگ کہتے
ہیں اے ہمارے رب ہم سے دوزخ کا عذاب دور کر دے ہنیک
اس کا عذاب بڑا ناواں اور بڑا بے جا ہے آیت میں غرام
کا لفظ آیہ جو مصیبت انسان کو لاحق ہوا اور ٹل جائے
اس کو عرب غرام نہیں کہتے، غرام وہ مصیبت جو قیامت
تک انسان کے سر سے نہ ملے قسم ہے اس خدا کی جس کے سوا کوئی
موجود نہیں یہ اللہ کے بندے (اپنے قول اور اپنے دین میں)
سچے اور کچے ثابت ہوئے اور جو انھوں نے زبان کہا تھا
اس پر عمل کیا لیکن ان سو تم صرف تناؤں میں مشغول ہو
لوگو! ان خالی تناؤں سے باز آؤ، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ

اس تقریر کے آخر میں فرمایا، (اور اکثر موعظا کے بعد فرماتے) کہ اس وعظ و نصیحت میں تو کوئی کمی نہیں،
لیکن دلوں میں زندگی بھی تو ہو۔

ان کی حق گوئی و بیباکی

ان کے کمالات، فصاحت و بلاغت، تبحر علمی اور تقریر و تاثیر ہی تک محدود نہ تھے، بلکہ وہ اپنے زمانہ میں
حق گوئی و بیباکی، اخلاقی جرات و شجاعت میں بھی ممتاز تھے، انھوں نے خلیفہ وقت یزید بن عبد الملک پر بلا تنقید کی،
ایک موقع پر سردار کسی شخص نے سوال کیا کہ اس زمانہ کے فتن (یزید بن المہلب اور ابن الاشعث کی شورش) کے
متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ انھوں نے کہا کہ "نہ اس کا ساتھ دو، نہ اس کا ساتھ دو، ایک شامی نے کہا، اور نہ امیر المؤمنین کا"
یہ سن کر آپ کو غصہ آ گیا، پھر ہاتھ اٹھا کر کہا ہاں نہ امیر المؤمنین کا، ہاں نہ امیر المؤمنین کا " حجاج کی تلوار اور سفاکی
مشہور ہے مگر حسن کی زبان اس کے زمانہ میں بھی اظہار حق سے باز نہ آئی، اور اس کے متعلق بھی انھوں نے اپنے
ضمیر اور عقیدہ کے خلاف کوئی بات نہیں کہی۔

اسلامی حکومت میں "نفاق" اور منافقین

اسلام کے سیاسی و مادی اثر و اقتدار سے اسلامی مملکت میں بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا
جس نے اسلام کو قبول تو کر لیا تھا، مگر اس کے اخلاق و معاملات اور قلب و دماغ پوری طرح اسلام سے متاثر نہیں
ہو سکے تھے اور ان میں حقیقی ایمان اور اذخلاق فی السلم کا قہ " (اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ) کی نشان
پیدا نہیں ہوئی تھی، خود مسلمانوں کی نسلی نسل میں (جس کی پوری اسلامی تربیت نہیں ہو سکی تھی) بکثرت ایسے افراد
تھے، جو جاہلی اثرات سے پاک نہیں ہوئے تھے، اور اسلام سے ان کو گہرا تعلق اور زندگی میں احکام الہی کے سامنے

”انقیاد و تسلیم کی نو نہیں پیدا ہوئی تھی“ ان میں خاصی تعداد میں (بالخصوص حکومت کے طبقہ اور امرا و اغنیاء میں) ایسے لوگ تھے جن میں قدیم منافقین کے اخلاق و اعمال اور ان کے ذہن و مزاج کا پرتو نظر آتا تھا یہی لوگ بالعموم زندگی پر حاوی تھے درباروں میں حکومت میں کلیدی جگہوں پر فوج میں بازاروں میں انہی کا غلبہ تھا، انہی کا طرز زندگی سوسائٹی میں فیشن کی حیثیت رکھتا تھا۔

بعض حضرات کا یہ خیال تھا کہ نفاق ایک فقی و مقامی بیماری تھی جو عہد رسالت میں مدینہ طیبہ کے مخصوص حالات کی بنا پر پیدا ہو گئی تھی، اسلام کے غلبہ اور کفر کی مغلوبیت کے بعد وہ ختم ہو گئی، اس لئے کہ دو قوتوں کی کشمکش جاتی رہی اور صرف اسلام باقی رہ گیا، اس لئے قدرتی طور پر کسی ایسے گروہ کے پیدا ہونے کا موقع نہیں رہا جو ان دونوں کے درمیان متردد و متذبذب رہے اور کسی ایک کا وفادار اور مخلص رفیق نہ بن سکے، اب یا تو کھلا ہو اکفر ہے یا علانیہ اسلام، ان دونوں کے درمیان متذبذب کی کوئی وجہ نہیں، تفسیر و تاریخ میں اس خیال کے اثرات ملتے ہیں۔

ان حضرات نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا تھا کہ نفاق فطرت انسانی کی ایک کمزوری اور بیماری ہے جو اسی کی طرح پرانی اور عام ہے اس بیماری کے پیدا ہونے کے لئے یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ اسلام و کفر کی دو طاقتیں میدان میں ضرور ہوں اور ان میں کشمکش جاری ہو، خالص اسلام کے غلبہ اور اقتدار کی حالت میں بھی ایک یا سا گروہ پیدا ہو جاتا ہے جو کسی وجہ سے اسلام کو ہضم نہیں کر پاتا، اور وہ اس کے دل و دماغ میں گھر نہیں کر سکتا، لیکن اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اس کا انکار اور اس سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کرے یا اس کے مصالح اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ ان فوائد سے دست بردار ہو جائے جو اسلام کے انتساب سے اس کو کسی اسلامی سلطنت یا مسلمان سوسائٹی میں حاصل ہیں، اس لئے وہ ساری عمر اس دو عملی اور متذبذب کی حالت میں رہتا ہے اس کی نفسی کیفیات اس کے اعمال و اخلاق، اس کی اخلاقی کمزوری، اس کی مصلحت شناسی، موقع پرستی، زندگی سے تمتع و لطف اندوزی کا جذبہ، دنیاوی انہماک، آخرت فراموشی، اہل اقتدار کے سامنے روباہ مزاجی اور کمزور و اولاد عزیزوں پر دست درازی، منافقین اولین کی یاد تازہ کرتی ہے۔

”نفاق“ و منافقین کی نشاندہی

حضرت حسن بصریؒ کی یہ بہت بڑی دینی ذہانت تھی کہ انھوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیا کہ نفاق موجود اور زندہ ہے اور منافقین نہ صرف موجود ہیں بلکہ زندگی پر اثر انداز اور سلطنت میں خیل ہیں، اور انہی سے شہروں کی چہل پہل ہے، کسی نے ان سے کہا کہ اس زمانہ میں بھی نفاق پایا جاتا ہے؟ فرمایا:۔

لو خرجوا من اذقة البصرة لا استوحشتم
اگر منافقین بصرہ کی گلیوں سے نکل جائیں تو تمہارا
شہر میں جی لگنا مشکل ہو جائے۔

یعنی شہر کی آبادی میں بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے، جن کو اسلام سے برائے نام تعلق ہے اور اسلام نے ان کے دل میں گھر نہیں کیا ہے، یا وہ اپنے اعمال و اخلاق کے لحاظ سے اسلامی سیرت آراستہ نہیں ایک و سر موقع پر انھوں نے فرمایا:۔

يا سبحان الله ما لقيت هذه الامة من
خدا کی شان ہے اس امت پر کیسے کیسے منافق
منافق قہرھا و استأثر علیہا۔
غالب آگے ہیں جو پرے درجہ کے خود غرض ہیں۔

لے متاخرین میں شاہ ولی اللہ صاحبؒ بھی اسی کے قائل ہیں کہ نفاق ہر زمانہ میں موجود اور زندہ ہے اور منافقین کا وجود کسی خاص زمانہ کے ساتھ مخصوص نہیں، ان کے نزدیک نفاق کی دو قسمیں ہیں نفاق اعتقادی اور نفاق عمل و اخلاق، نفاق اعتقادی کا قطعی علم زمانہ رسالت کے بعد انقطاع وحی کی وجہ سے دشوار ہے، لیکن نفاق عمل اور نفاق اخلاق، کثیر الوقوع ہے، وہ اپنے زمانہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ اس وقت نفاق بکثرت موجود ہے، فوز الکبیر میں ارشاد فرماتے ہیں:۔ اگر تو یہی کہ ازنا نفاق نمونہ بدینی رود مجلس امرا و مصاحبان ایشان را بین کہ مرضی ایشان را بر مرضی شاعر ترجیح می دہند اور انصاف بیچ فرق نیست در میان آنانکہ کلام آنحضرت صلے اللہ علیہ آلم و سلم بے واسطہ شیعہ نفاق در زیدند و در میان آنانکہ احوال پیدا شدہ اند بطریق یقین حکم شاعر معلوم کردہ اند بعد ازاں برایشان خلاف آن اقدام می نمایند و علی ہذا القیاس جماعۃ از معقولیان کہ شکوک و شبہات بسیار بخاطر دارند معاد را بنیاسیاسۃ اند نمونہ آن گروہ اند (ص ۱۱ مطبوعہ محمدی)

یعنی حکومت میں وہ عنصر موجود ہے جو اسلام اور مسلمانوں کا مخلص نہیں اور جس کو صرف اپنے اغراض اور منافع سے چسپی ہے۔

حسن بصری کی دعوت و اصلاح کی طاقت و تاثیر میں اس بات کو بڑا دخل ہے کہ انھوں نے زندگی کا ایک سرا پکڑ لیا، اور سوسائٹی کی اصل بیماری کی طرف توجہ کی، ان کے زمانہ میں بہت سے واعظ اور داعی تھے، لیکن اس زمانہ کے معاشرہ نے کسی کے وجود اور کسی کی دعوت کو اس طرح محسوس نہیں کیا، جس طرح حسن بصری کے وجود اور ان کی دعوت کو محسوس کیا، اس لئے کہ ان کی تقریروں اور ان کے درسوں کے گہرے ہوئے معاشرہ پر زبرد پڑتی تھی، وہ "نفاق" کی حقیقت بیان کرتے تھے اور نفاق ایک مرض تھا، جو اس سوسائٹی میں پھیل رہا تھا، وہ منافقین کے اوصاف و اخلاق بیان کرتے تھے اور یہ اوصاف و اخلاق بہت سے لوگوں میں پائے جاتے تھے، جو حکومت، فوج اور تجارت میں پیش پیش تھے، اور زندگی میں نمایاں تھے، وہ آخرت فراموشی اور دنیا طلبی کے بحران کی مذمت کرتے تھے، اور بکثرت لوگ اس وبا کا شکار تھے، وہ موت اور آخرت کی تصویر کھینچتے تھے اور ان حقیقتوں کو مستحضر کرتے تھے، اور مترفین و غافلین کا ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس کی زندگی ان چیزوں کے بھلائے رکھنے میں تھی۔

غرض ان کی دعوت ان کے مواعظ اور ان کے اصلاحی درس اس زمانہ کی خواہشات و اغراض سے اس طرح متصادم تھے کہ اس زمانہ کی سوسائٹی کے لئے ان سے غیر متعلق رہنا مشکل ہو گیا تھا، اس کا نتیجہ تھا کہ بکثرت لوگ ان کی تقریروں اور مجلسوں سے چوٹ کھا کر پھلی زندگی سے تائب ہوتے تھے، اور نئی زندگی اختیار کرتے تھے، وہ اپنی تقریروں اور مجلسوں سے دین و ایمان کی دعوت بھی دیتے تھے، اور اپنی صحبت و عمل سے نفوس کی تربیت اور تزکیہ بھی کرتے تھے، ساٹھ سال کی طویل مدت انھوں نے اس دعوت و اصلاح میں گزاری، کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ کتنے نفوس کو ان کی وجہ سے حلاوتِ ایمان اور حقیقتِ اسلام نصیب ہوئی، عیوام بن حوشب کہتے ہیں کہ حسن نے ساٹھ برس تک اپنی قوم میں وہ کام کیا، جو انبیاء کرام (ختم نبوت سے پہلے) اپنی امتوں میں کرتے تھے۔

حسن بصری کی وفات اور ان کی مقبولیت

اس خلوص، دینی انہماک اور علمی و روحانی کمالات کا یہ اثر تھا کہ سارا بصرہ ان کا گرویدہ تھا، اس میں ان کا جب انتقال ہوا تو سارے شہر نے ان کے جنازہ کی مشالعت کی اور بصرہ کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ پوری آبادی کے قبرستان چلے جانے کی وجہ سے اس دن شہر کی جامع مسجد میں عصر کی نماز نہیں ہو سکی۔

حسن بصری کے بعد ان کے روحانی و علمی جانشینوں نے اور اپنے اپنے زمانہ کے داعیوں نے "دعوت الی اللہ" دعوت آخرت اور دعوت ایمان و عمل کے تسلسل کو جاری رکھا اور درمیان میں کوئی خلا واقع نہیں ہونے دیا، حسن بصری کی وفات کے بائیس برس بعد خلافت امویہ کا خاتمہ اور خلافت عباسیہ کا آغاز ہوا، اور دمشق کے بجا بغداد دار الخلافت اور پورے مشرق کا مرکز توجہ بن گیا۔

انقلاب حکومت کی کوششیں

ان اصلاحی کوششوں اور دعوت و تذکیر کے تسلسل کے ساتھ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد اس کی کوششیں بھی جاری رہی کہ خلافت کو اس کے صحیح مرکز پر قائم کیا جائے، اور اس اجارہ داری کو ختم کر دیا جائے، جو امویوں اور ان کے بعد عباسیوں نے قائم رکھی تھی، خلافت غلطی سے ایسی قومی اور نسلی بنیادوں پر قائم ہو گئی تھی کہ اس کے مقابلہ میں کوئی آواز اور کوئی تحریک اس وقت تک موثر نہیں ہو سکتی تھی، جب تک کہ اس کو شرافتِ نسب اور علوِ خاندان کی سند حاصل نہ ہو اور اس کی پشت پر خاندانی طاقت و حمایت نہ ہو، اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے خلافت اموی اور خلافت عباسی کے خلاف علم جہاد بلند کیا، ان کا تعلق اہل بیت تھا کہ ان کی کامیابی کا زیادہ امکان تھا، لیکن وہ امت کے دینی رجحان کے نمائندہ بھی تھے، اور ان کو مسلمانوں کی دینی عنصر اور اصلاح پسند جماعتوں کی ہمدردی اور تائید حاصل تھی۔

واقعہ اگر بلا کے بعد بھی خاندان نبوت کے متعدد افراد نے انقلاب کی کوشش کی، سیدنا حسین (علیہ علی آباد) اسلام کے بعد ان کے پوتے زید بن علی بن حسین نے ہشام بن عبدالملک کے مقابلہ میں علم جہاد بلند کیا، اور ۱۲۲ھ میں شہید و مصلوب ہوئے، امام ابوحنیفہ نے ان کی خدمت میں دس ہزار درہم بھیجے، اور حاضر نہ ہو سکے پر معذرت کی، ان کے بعد بنی حسن میں سے حضرت محمد ذوالنفس الزکیہ (بن عبدالسراہض ابن الحسن المثنی بن سیدنا حسن بن علی) نے مدینہ طیبہ اور ان کے مشورہ سے ان کے بھائی ابراہیم بن عبدالسراہض نے کوفہ میں منصور کے خلاف علم جہاد بلند کیا، امام ابوحنیفہ اور امام مالکؒ ان کی تائید و حمایت میں تھے، امام ابوحنیفہ نے برملا ان کی تائید کی، اور کچھ رقم بھی ان کی خدمت میں بھیجی، منصور کے فوجی افسر حسن بن قحطیبہ کو ابراہیم کا مقابلہ کرنے سے باز رکھا، اور اس نے خلیفہ سے معذرت کر دی، اول الذکر رمضان ۱۴۵ھ میں مدینہ طیبہ میں اور آخر الذکر ذوالقعدہ ۱۴۵ھ میں کوفہ میں شہید ہوئے، بنی امیہ اور بنی عباس کی حکومتوں کے استحکام اور وسیع انتظامات کی وجہ سے اگرچہ یہ سب کوششیں ناکام رہیں، لیکن انہوں نے امت میں غلط اقتدار کے خلاف جدوجہد اور اعلان حق کی ایک نظر قائم کر دی، اگرچہ علماء و کامیاب نہیں ہو سکے، لیکن ان کی کوششوں کا یہ ذہنی اثر فریبانی، اور جدوجہد کا یہ تسلسل کچھ کم قیمتی نہیں، اسلامی تاریخ کی آبرو انہی جواں مردوں سے قائم ہے، جنہوں نے غلط اقتدار اور مادی ترغیبات کے سامنے سپر نہیں ڈالی، اور صحیح مقصد کے لئے اپنے خون کا آخری قطرہ بہا دیا۔

”مِنَ الْمُؤْمِنِينَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللَّهَ عَلَيْهِ“

لے مناقب ابی حنیفہ بزارى ج ۱ ص ۵۵

لے امام مالک نے اہل مدینہ کو محمد ذوالنفس الزکیہ کی رفاقت و طاعت کا فتویٰ دیا، اگرچہ وہ منصور کی بیعت کر چکے ہوں (تاریخ الکامل ج ۵ ص ۲۱۴) لے مورخین کا خیال ہے کہ ابوحنیفہ کے خلاف منصور نے جو سخت کارروائی کی، اس کی وجہ ان کا عہدہ قضا سے انکار نہ تھا، بلکہ دراصل محمد و ابراہیم کی حمایت تھی جس کا منصور کو علم تھا، اس باب کی تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو امام ابوحنیفہ

کی سیاسی زندگی، از مولانا سید مناظر حسن گیلانی۔

خلافتِ عباسیہ اور دینی دعوت و تذکرہ

خلافتِ عباسیہ اور اس کے اثرات

خلافتِ عباسیہ، خلافتِ امویہ کی پوری پوری جانشین تھی، وہی دنیا داری کی روح، وہی شخصی و موروثی سلطنت کا نظام و آئین، اور وہی اس کی خرابیاں اور بُرے نتائج، وہی بیت المال میں آزادانہ تصرف، وہی عیش و عشرت کی گرم بازاری، فرق اتنا تھا کہ امویوں کی سلطنت میں اور ان کے زمانہ کی سوسائٹی میں عربی روح کار فرما تھی، اس کی خرابیاں، اور بے اعتدالیاں بھی اسی نوع کی تھیں، عباسی سلطنت کے جسم میں عجمی روح داخل ہو گئی تھی، اور عجمی قوموں اور تہذیبوں کے امراض و عیوب اپنے ساتھ لائی تھی، سلطنت کا رقبہ اتنا وسیع ہو گیا تھا کہ ہارون رشید نے ایک مرتبہ ابر کے ایک ٹکڑے کو دیکھ کر بڑے اطمینان سے کہا:۔

امطری حیث شئت فسیا تینی جہاں تیرے جی میں آئے جا کر برس جائی تری پیداوار

خرابہ۔ کا خراج بہر حال میرے ہی پاس آئے گا۔

ابن خلدون کے اندازہ کے مطابق سلطنتِ عباسیہ کی سالانہ آمدنی ہارون رشید کے زمانہ میں سات ہزار پانچ سو فنطار (سات کروڑ ڈیڑھ لاکھ دینار سے زیادہ تھی، یعنی اکتیس کروڑ پچاس لاکھ روپیہ ۳۱۵) سالانہ سے زائد، جو اس زمانہ کے اعتبار سے بہت بڑی مالیت تھی، امون کے زمانہ میں

لے مقدمہ ابن خلدون ص ۱۵۱

کافی اضافہ ہوا، اس کثیر آمدنی میں سب سے بڑی سلطنت کا پایہ تخت ہونے کی وجہ سے ساری دنیا کا سامان عیش و عشرت اور ساری دنیا کے اہل کمال، صنایع و معنی، غلام، باندیاں، مصاحب و شاعر اور خوش باش و خوش فکر سمیت کے بغداد میں آگئے تھے، دولت کی فراوانی عجمیوں کے اختلاط سے تمدن کی ساری خرابیاں اور تمدن زندگی کی ساری بے اعتدالیاں دارالسلام یا مرکز اسلام میں شروع ہو گئی تھیں، دولت کی بہتات، مال کی بے وقعتی اور اس وقت کے تمدن و عیش کا اندازہ کرنے کے لئے تاریخ میں مامون کی شادی کا حال پڑھ لینا کافی ہے، مورخ لکھتا ہے:-

”مامون بن خاندان شاہی و ارکان دولت و کل فوج و تمام افسران ملکی و خدام جن بن بہل (وزیر اعظم

جس کی لڑکی سے مامون کی شادی ہو رہی تھی) کا ہمان ہوا، اور برابر انیس دن تک اس عظیم الشان بارات

کی ایسی فیاضانہ جو صلہ سے ہمانداری کی گئی کہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی نے بھی چند روز کے لئے امیرانہ زندگی

بسر کر لی، خاندان ہاشم و افسران فوج اور تمام عہدہ داران سلطنت پر شکر و عنبر کی ہزاروں گولیاں نثار

کی گئیں، جن پر کاغذ لپیٹے ہوئے تھے، اور ہر کاغذ پر نقد، لونڈی، غلام، املاک، خلعت، اسب خاصہ، جاگیر

وغیرہ کی ایک خاص تعداد لکھی ہوئی تھی، نثار کی عام لوٹ میں یہ فیاضانہ حکم تھا جس کے حصے میں جو گوئی

آئے، اس میں جو کچھ لکھا ہوا سی وقت وکیل الخزن سے دلا دیا جائے، عام آدمیوں پر شکر و عنبر کی گولیاں

اور درہم و دینار نثار کئے گئے، مامون کے لئے ایک نہایت مکلف فرس بچھا یا گیا جو سونے کے تاروں سے

بنایا گیا تھا، اور گوہر و یاقوت سے مرصع تھا، مامون جب اس پر جلوہ فرما ہوا تو بیش قیمت موتی اس کے

قدم پر نثار کئے گئے، جو زریں فرس پر بکھر کر نہایت دل آویز سماں دکھاتے تھے پلے

بغداد کے داعی الی اللہ

لیکن اسی پر عیش و عشرت بغداد میں کچھ نفوس قدسیہ تھے، جو دعوت الی اللہ، تزکیہ و نفوس، علوم دینیہ

لے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو کتاب بایحوان (جاہظ) ج ۳ ص ۱۹، ج ۵ ص ۱۱۱ و مجلدات الاغانی۔

۱۱۱۱۱۱ (مولانا شبلی نعمانی مرحوم ص ۱۵۱، بحوالہ ابن خلدون، ابوالفداء، ابن الاثیر، ابن خلکان۔

کی نشر و اشاعت اور تعلیم و تعلم میں ہمہ تن منہمک تھے، انھوں نے شہر کے ہنگاموں اور زندگی کی ساری پچھلیوں سے

اپنے کو علیحدہ کر لیا تھا، اور اس امت کی روح اور تعلق باللہ کے سرمایہ اور اسلامی زندگی کے سرچشمہ (قرآن و حدیث)

کی حفاظت میں مصروف تھے، حکومت ان کو کسی قیمت پر خرید نہیں سکی، اور دنیا کی کوئی ترغیب ان کو اپنے کام سے

ہٹا نہیں سکی، مادیت کے اس پر تلاطم سمندر میں وہ انسانی جزیرے تھے، جہاں ڈوبنے والے پناہ لیتے تھے، انھوں نے

بغداد میں مادی و پر عشرت زندگی کے پہلو بہ پہلو ایک خالص ایمانی اور روحانی زندگی قائم کر رکھی تھی، جو اپنی

طاقت اور وسعت میں مادی و سیاسی زندگی سے کم نہ تھی، اگر خلفاء اور امراء و وزراء کا قبضہ جسموں پر تھا، تو ان کی

حکومت لوگوں کے دلوں اور دماغوں پر تھی، اور جہاں کہیں ان دونوں میں مقابلہ پیش آتا تو اکثر اوقات انہی کا

غلبہ ثابت ہوتا، سلطان وقت ہارون رشید اپنے شاہانہ تزک و احتشام کے ساتھ رقبہ میں مقیم تھا کہ مشہور امام حدیث

اور مرد صالح حضرت عبداللہ بن مبارک کی آمد ہوئی، شہر کی ساری آبادی ان کے استقبال کے لئے نکل پڑی، خلیفہ

تنہا رہ گیا، ازدحام کا یہ حال تھا کہ جوتیاں ٹوٹ گئیں، ہارون کی ایک کنیز بالاخانہ سے دیکھ رہی تھی، پوچھا کہ

یہ ماجرا کیا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ خراسان کے ایک عالم آئے ہیں، جن کا نام عبداللہ بن مبارک ہے، اس نے کہا کہ یہ ہے

بادشاہی نہ کہ ہارون کی بادشاہی کہ بغیر پولیس اور اہل کاروں کے جمع ہی نہیں ہوتے۔

یہ ایمانی اور علمی زندگی بغداد میں صاف نمایاں تھی، بغداد جس طرح عیش و عشرت اور مال و دولت کا

گہوارہ تھا، اور اس کے طالب دنیا کے گوشہ گوشہ سے سمت کر یہاں جمع ہو گئے تھے، اسی طرح علم و عمل، صلاح و

تقویٰ اور دعوت و اصلاح کا بھی سب سے بڑا مرکز تھا، جہاں اس فن کے امام اور اس فن کے طالب پورے عالم اسلام

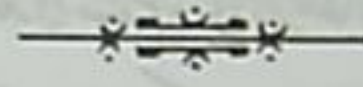
سے آکر جمع ہو گئے تھے، طبقات و تراجم کی کتابیں دیکھنے سے تو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ بغداد میں صلحی اور

علماء کے علاوہ اور کوئی بستا ہی نہ تھا، اور قال اللہ وقال الرسول کے سوا کوئی صدا بلند نہیں ہوتی تھی، یہ

دینی رونق اور عین مرکز حکومت میں دین و اصلاح کی یہ دعوت انہی مجاہد بندوں کے دم سے تھی، جنھوں نے

اسی کام کو اپنی زندگی کا مقصد سمجھ لیا تھا، اس سلسلہ میں سفیان ثوری، فضیل بن عیاض، جنید بغدادی

معروف کرنی، اور بشرحانی کا نام اور کام سب سے زیادہ نمایاں اور روشن ہے، ان حضرات کے اعمال و اخلاق، سچی خدا ترسی، بے لوث زاہدانہ زندگی، مخلوق سے استغناء، ایثار و بے نفسی، بے غرض خدمت خلق، اور ایمانی کیفیات غیر مسلم آبادی تک پر اثر ڈالتی تھیں، ان کی ذات سے اسلام کا اخلاقی و قارئی تھا، اس کا نتیجہ تھا کہ ان کی تقریریں سن کر اور ان کے اعمال و اخلاق دیکھ کر بہ کثرت یہودی، عیسائی، مجوسی اور صابی مسلمان ہوتے تھے۔



تدوین حدیث و فقہ

امت کی دو فوری ضرورتیں

امت کی روح اور اس کے اخلاق کی حفاظت کے ساتھ (جس کا سلسلہ برابر جاری تھا) امت کی اجتماعی زندگی و معاشرت اور معاملات و سیاست کی حفاظت کی بھی ضرورت تھی، اور اس بات کی ضمانت کی کہ وہ آئندہ بھی اسلام کے اصول و آئین کے مطابق ہوں گے، اس وقت دو بڑے عظیم (ایشیا و افریقہ) اور بڑے عظیم (یورپ کا ایک حصہ) اسپین) اسلام کی نگرانی و تولیت میں تھے، اسلام کی سلطنت روئے زمین کی سب سے بڑی وسیع اور سب سے طویل و عریض سلطنت تھی جو دنیا کے تہذیبی ترین ممالک پر مشتمل تھی، نئے حالات و مسائل سے مسلمانوں کا سابقہ تھا، تجارت و زراعت، جزیہ و خراج، محکومین، مفتوحہ ممالک کے نئے مسائل درپیش تھے، قدیم عادات و رواج کا بہت بڑا ذخیرہ اور نئی نئی ضروریات تھیں، جو مسلمانوں کی قوت فیصلہ اور اسلامی احکام کی منتظر تھیں، ان میں سے نہ کسی ضرورت کو ٹالا جاسکتا تھا، نہ سرسری طور پر ان سے گذرا جاسکتا تھا، حکومت مفصل و مکمل آئین و قانون سلطنت کی طالب تھی، حکومت کی انتظامی مشین کو روکا نہیں جاسکتا تھا، اگر قانون اسلامی کی ترتیب میں تاخیر ہوتی تو وہ رومی یا ایرانی قانون کو اختیار کرنے پر مجبور تھی جس کا نتیجہ وہ ہوتا، جو اس وقت کی نام نہاد اسلامی سلطنتوں کا ہوا ہے، علماء کی ذرا سی غفلت اور محافظانہ سنت کی دماغی کاہلی اور راحت پسندی اس امت کو ہزاروں برس کے لئے اسلامی معاشرت اور اس کے اجتماعی قوانین کی برکت محروم کر دیتی۔

ع یک محظ غافل بودم صد سالہ را ہم دور شد

اس وقت دو مسلوں کی طرف فوری توجہ کی ضرورت تھی، ایک تو یہ کہ حدیث و سنت کے سرمایہ کو محفوظ و مدون کر لیا جائے، جو محدثین کے سینوں اور منتشر سفینوں میں تھا، یہ نئے مسائل کے استنباط کا بہت بڑا ذریعہ اور فقہ اسلامی کا ایک بہت بڑا ماخذ تھا، اسی کے ساتھ وہ امت کے اسلامی مزاج اور زندگی کے اسلامی سانچے کی حفاظت کا بھی ذریعہ تھا، حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے زیادہ مفصل اور مستند سیرت ہے، وہ زمانہ نبوت کے تئیس برسوں کا ایک طرح کا روزنامہ ہے، جو کسی پیغمبر کی امت کو حاصل نہیں، اس کا ضائع ہو جانا بہت بڑا علمی و دینی سانحہ تھا، علاوہ بریں اس میں امت کی اخلاقی اصلاح، اعتدال، صحیح روحانیت زہد و تقویٰ اور تغیر و انقلاب پر ابھارنے والی زبردست طاقت ہے، جس کے اثر سے ہر زمانہ میں اہل دعوت و اہل عزیمت پیدا ہوتے رہیں گے اور ہر زمانہ کی مسلمان سوسائٹی کا شرعی و اخلاقی احتساب ہو سکے گا، اور ہر زمانہ اور ہر طبقہ کی بدعات کا مقابلہ کیا جاسکے گا۔

دوسری ضرورت فقہ کی تدوین اور استنباط و اجتہاد کی تھی، قرآن و حدیث میں اگرچہ زندگی کے ہر شعبہ کے لئے اصول و کلیات موجود ہیں، اور ان سے باہر کہیں جانے کی ضرورت نہیں، مگر زندگی متغیر ہے اور انسان کے حالات و ضروریات غیر محدود اور بیک وقت متنوع، ان اصول و کلیات کو زندگی کے ان تغیرات و تنوعات پر حاوی بنانے کے لئے اور ہر نئی حالت اور نئی ضرورت کے لئے ان کی ترجمانی و تشریح کے لئے اجتہاد و استنباط کی ضرورت تھی۔

لے حدیث کے جمع و تدوین کا کام عہد تابعین سے شروع ہو چکا تھا، اس سلسلہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی توجہ و توجی کا حال گذر چکا ہے، دوسری ہی صدی میں حدیث کے مختلف مجموعے تیار ہو چکے تھے جن میں سے ابن شہاب زہری (۱۲۴ م) ابن جریر کی (۱۵۰ م) ابن اسحاق (۱۵۱ م) سعید ابن ابی عروبہ مدنی (۱۵۶ م) عمر بنی (۱۵۳ م) ربیع بن صبیح (۱۶۰ م) وغیرہ کے مجموعے خاص طور پر مشہور ہیں، لیکن ضرورت تھی کہ اس کو زیادہ علمی و ترقی یافتہ شکل پر انجام دیا جائے۔

تدوین حدیث

پہلی ضرورت کے لئے قدرتی طور پر یہ انتظام ہوا کہ ظہور اسلام کے لئے اس ملک اور قوم کا انتخاب ہوا، جو اپنی راست گفتاری، امانت اور قوت حفظ میں دنیا میں ممتاز تھی، صحابہ کرام نے جو کچھ دیکھا جو کچھ سنا، اس کو محفوظ کر لیا، اور بے کم و کاست دوسری نسل کو پہنچا دیا، دوسری قوموں نے اپنے اپنے پیغمبروں کے بت تراشے اور ان کی تصویریں بنائیں، اسلام میں بت تراشی اور صورت گری حرام ہے، مگر صحابہ کرام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل و عادات کا ایسا جینا جاگتا مرقع پیش کر دیا، جس کی موجودگی میں کسی تصویر کی ضرورت نہیں، اور جو تصویر کے تمام مفاسد سے پاک ہے۔

محدثین کی بلند مہمتی اور جفاکشی

پھر ان روایات کی حفاظت و اشاعت کے لئے اللہ تعالیٰ نے صدہا کی تعداد میں ایسے بلند حوصلہ، تازہ دم، پر جوش طالب علم مہیا کر دیئے، جو قوت حافظہ و ذکاوت میں بے نظیر تھے، ان کا سیلاب عجم کے ملکوں سے امنڈ آیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں حدیث کا ایسا عشق بھر دیا کہ ان کے لئے چین سے بیٹھنا مشکل ہو گیا تھا، ان کو ہر جگہ سے اس علم کو حاصل کرنے اور اپنے سینہ اور سفینہ میں محفوظ کرنے کی دھن تھی، علوم کی تاریخ اور پیغمبروں کی امتوں میں اس عشق اور دھن اور پھر اس احتیاط و امانت کی مثال نہیں ملتی، انہوں نے ان احادیث کو جمع کرنے اور ان روایات کو ان کے راویوں سے سننے کے لئے اسلامی دنیا کا کونہ کونہ چھان ڈالا، اس بادیہ پیمانی کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ امام بخاری نے ۱۴ برس کے سن میں سیاحت شروع کر دی تھی، بخارا سے لے کر مصر تک سارے ممالک انہوں نے گھنگال ڈالے، امام ابو حاتم رازی کہتے ہیں کہ میں نے تین ہزار فرسخ (نو ہزار میل) سے زیادہ مسافت پیادہ پاتے کی، پھر میں نے میلوں کا شمار کرنا چھوڑ دیا، محدث احمد بن حنبل نے حدیث اندلس، عراق، حجاز،

اورین کے شیوخ کی خدمت میں حاضر ہو کر اخذ کی گویا پنجہ سے لے کر سوز تک سارا بڑا عظیم افریقہ اور پھر بحر احمر
طے کیا، بہت سے محدثین کا سفر نامہ تین تین بڑے علموں ایشیا، افریقہ، یورپ (اسپین) پر مشتمل ہے، اس وقت کی تمدن و
معروف دنیا کے مغرب بعید (اندلس) سے مشرق بعید (خراسان) تک سفر کرنا اور شہر شہر پھرنا تو معمولی بات تھی۔

فن اسماء الرجال

ان مخلصین نے صرف حدیث و روایات کے جمع و تدوین پر اکتفا نہیں کیا بلکہ درمیانی واسطوں کی بھی
تحقیق کی، اور ان تمام راویوں کے نام و نشان و تاریخ زندگی اور اخلاق و عادات کو محفوظ کر دیا، جن کے
توسط سے یہ روایات ان کو پہنچی تھیں، اس طرح جس ذات گرامی کے متعلق "وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ" کا
وعدہ اور اطلاع تھی، اس کی بدولت لاکھوں اشخاص کی زندگی روشنی میں آگئی، ان ہزاروں لاکھوں انسانوں
کی اہمیت کی وجہ سے یہ تھی کہ وہ اس ہستی کے اقوال و اعمال و احوال میں سے کسی جز کے راوی اور اس سلسلہ
روایت کے ایک ناقل تھے، نتیجہ یہ ہوا کہ احادیث و روایات کی تدوین کے ساتھ ساتھ ایک نیا علم "اسماء
الرجال" کا وجود میں آ گیا، یہ علم محدثین کی عالی ہمتی، علمی شغف، تحقیقی ذوق اور احساس ذمہ داری کی روشن
مثال ہے، اس امت کا ایک قابل فخر کارنامہ ہے، ڈاکٹر اسپرنگر نے "الاصابة في احوال الصحابة"
(حافظ ابن حجر) کے انگریزی مقدمہ میں بالکل صحیح لکھا ہے کہ:-

"کوئی قوم دنیا میں ایسی گزری، نہ آج موجود ہے، جس نے مسلمانوں کی طرح اسماء

الرجال کا عظیم الشان فن ایجاد کیا ہو جس کی بدولت آج پانچ لاکھ شخصوں کا حال معلوم

ہو سکتا ہو"

۱۔ یہ مثالیں "علمائے سلف" (مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی مرحوم) سے ماخوذ ہیں، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو، کتاب "حوائج سفر"

۲۔ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۳ء، ۱۸۶۴ء ۳۔ خطبات مدراس از مولانا سید سلیمان ندوی۔

محدثین کی احتیاط و امانت

محدثین نے نہ صرف رجال حدیث کے حالات جمع و محفوظ کر دیئے بلکہ صحیح حالات لکھنے کی پابندی کی،
اور ان کے اخلاق و عادات، قوت و ضعف، احتیاط و بے احتیاطی، دیانت و تقویٰ، علم و حافظہ کے متعلق ان
معاصرین کے بیانات اور قسم کی معلومات یکجا کر دیئے، اور ان کے بارہ میں کسی رو رعایت سے کام نہیں لیا، خواہ
ان کے زمانہ میں حاکم ہوں یا اپنے وقت کے بڑے زاہد ہوں۔

"راویوں کی چھان بین اور تحقیق میں اس درجہ دیانتداری اور حق گوئی سے کام لیا کہ وہ واقعتاً

آج اسلام کے مفاخر میں ہیں، راویوں میں بڑے بڑے خلفاء اور امرا بھی تھے جن کی تلواروں کی دھاک

بیٹھی ہوئی تھی، مگر محدثین نے نڈر ہو کر سب کی پردہ دری کی، اور ای کو وہی درجہ دیا جو اس بارگاہ میں

ان کو مل سکتا تھا، امام و کتب بڑے محدث تھے، لیکن ان کے باپ سرکاری خزانچی تھے، اس بنا پر وہ خود ان کے

جب روایت کرتے تو ان کی تائید میں کسی دوسرے کو ضرور ملا لیتے، یعنی تنہا اپنے باپ کی روایت کو تسلیم نہیں

کرتے تھے، اس احتیاط اور حق پسندی کی کوئی حد ہے"

مسعودی ایک محدث ہیں، ۱۵۴ھ میں ایک امام معاذ بن معاذ نے ان کو دیکھا کہ ان کو اپنی تحریری

یادداشت کے دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے تو انہوں نے فوراً ان کے حافظہ سے اپنی بے اعتباری ظاہر کر دی، یہی

امام معاذ بن معاذ وہ بزرگ ہیں کہ ان کو ایک شخص نے دس ہزار دینار جس کی قیمت آج دس ہزار گنی سے زیادہ ہے

صرف اس معاوضہ میں پیش کرنے چاہے کہ وہ ایک شخص کو معتبر (عدل) اور غیر معتبر سمجھ نہ کہیں، یعنی اس کے متعلق

خاموش رہیں، انہوں نے اشرافیوں کے اس توڑے کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا، اور فرمایا کہ میں کسی حق کو چھپا نہیں

سکتا، کیا تاریخ اس سے زیادہ احتیاط اور اس سے زیادہ دیانتداری کی کوئی مثال پیش کر سکتی ہے؟

۱۔ تہذیب التہذیب جلد ۱ ص ۱۳ ۲۔ ایضاً ۶ ص ۲۱ ۳۔ ایضاً ۶ ص ۳۳ ۴۔ خطبات مدراس ص ۶۰۵۹

قوتِ حافظہ اور استحضار

محدثین کی یہ جماعت ایران و ترکستان کا بہترین دماغی جوہر تھا، وہ نسلاً بڑے تندرست، توانا، جاکش، عالی حوصلہ، علم کے حریص اور حافظہ کے نہایت قوی تھے، حافظہ پر اعتماد اور اس سے کام لینے کی وجہ سے (تمام انسانی اعضاء کی طرح جو پرورش اور ورزش سے غیر معمولی طور پر طاقتور ہو جاتے ہیں) ان کا حافظہ اپنی قوتِ حفظ کے محیر العقول نمونے پیش کرتا تھا، جو ضعف و کمزوری کے اس خالص کتابی دور میں بعض اوقات ناقابلِ فہم معلوم ہوتے ہیں، لیکن تاریخ ان کے وقوع کی متواتر شہادتیں ہم پہنچاتی ہے اور تجربات ان کے امکان کی تصدیق کرتے ہیں، اور ان کی علمی توجیہ بالکل مشکل نہیں، کثرتِ کار، مناسبتِ تام اور اپنے موضوع سے عشق و شغف ایسا ملکہ پیدا کر دیتا ہے، اور انتقالِ ذہنی کے ایسے نمونے ظاہر ہوتے ہیں، جو غیر متعلق اشخاص کے لئے حیرت انگیز ہوتے ہیں۔

امام بخاریؒ جب بغداد آئے تو علماء بغداد نے ان کے امتحان کا یہ طریقہ تجویز کیا کہ سو حدیثوں کی سند اور متن (مضمون حدیث) کو الٹ دیا، ایک حدیث کی سند دوسرے متن کے ساتھ اور ایک حدیث کا متن دوسری سند کے ساتھ لگا دیا، اور دس دس حدیثوں کو ایک ایک شخص کے حوالہ کیا کہ وہ ان سے سوال کرے، امام بخاریؒ جب مجلس میں آئے تو ایک ایک شخص نے دس دس حدیثیں سنائیں، اور ان کی رائے دریافت کی، وہ سنتے اور فرماتے کہ میں ان حدیثوں سے واقف نہیں، اہل علم اس راز کو سمجھے اور ناواقف اشخاص ان کی لاعلمی پر مسکرائے، جب سب نے اپنے اپنے حصہ کی حدیثیں سنائیں تو امام نے باری باری ایک ایک کی طرف توجہ فرمائی اور کہا کہ آپ نے جو دس حدیثیں سنائی تھیں ان کا متن یہ ہے، اور ان کی سند یہ ہے، پھر دوسرے تیسرے کی طرف توجہ کی، یہاں تک کہ سب کی احادیث کی تصحیح کر دی، اور جس سند کا جو متن تھا، اور جس متن کی جو سند تھی، وہ بیان کی، لوگ ان کی وسعتِ نظر، حاضر دماغی اور حافظہ پر انگشت بدنداں رہ گئے۔

مجالسِ درس میں سامعین کا ہجوم

اس ذہین طبقہ کی توجہ و انہماک اور حدیث کی ضرورت کے احساس نے حدیث کا ایسا عام ذوق اس کے درس و روایت کی مجلسوں میں شرکت کا شوق اور اکتافن سے تلمذ و استفادہ کی حرص پیدا کر دی تھی کہ محدثین کی مجالسِ درس میں حاضرین کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہوتی، اور بادشاہوں کے دربار سے زیادہ ان میں سکون اور نظام ہوتا۔

یزید بن ہارون نے جب بغداد میں درس حدیث دیا، تو اس میں ستر ہزار حاضرین کا تخمینہ کیا گیا، امام عاصم بن علی الملوے حدیث کے واسطے بغداد سے باہر نخلستان میں ایک بلند چوڑے پرٹھے تھے، خلیفہ معتمد باشر نے ایک بار اپنا ایک معتد اس مجلس کے شرکاء کا اندازہ کرنے کے لئے بھیجا تو ایک لاکھ چوبیس ہزار حاضرین کی تعداد کا اندازہ تھا، احمد بن جعفر راوی ہیں کہ جب ابو مسلم بغداد میں آئے تو رجبہ غسان نامی مقام پر انھوں نے حدیث کا املا کیا، ساتھی کھڑے ہوئے جن میں سے ایک دوسرے کو شیخ کی روایت پہنچاتا تھا، اور لوگ کھڑے کھڑے تحریر حدیث میں مصروف تھے، دو اتوں کا شمار کیا گیا تو کچھ اور چالیس ہزار روایتیں شمار ہوئیں جو لوگ لکھتے نہ تھے، صرف سماعاً شریک تھے، وہ اس تعداد سے خارج ہیں، شیخ وقت فریابی نے بغداد میں املائے حدیث کیا تو تین سو سولہ مستملی ان کی مجلس میں حاضر تھے، اور حاضرین تخمیناً تیس ہزار فریابی کی مجلس میں دس ہزار آدمی ان کے پاس ایسے پڑھنے آتے تھے، جو دو قلم لے کر بیٹھے، فریبری کی روایت ہے کہ امام بخاری کی جامع صحیح کو ان سے نوے ہزار آدمیوں نے سنا۔

صحاحِ سنۃ

یہ عمومی ذوق انہماک اور جذبہ مسابقتِ خالی از حکمت نہ تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ احادیث کا ایسا محفوظ و مستند سرمایہ جمع ہو گیا، جو اس امت کی بہت بڑی ثروت اور اصلاح و تجدید کا ایک بڑا طاقتور

۱۰ مقدمہ فتح الباری ص ۷۹

ذریعہ ہے اس سرمیا میں امام بخاری کی صحیح بخاری، امام مسلم کی صحیح مسلم (جن کو اکثر صحیحین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے) اور جس حدیث کو ان دونوں نے روایت کیا ہے اس کو "متفق علیہ" کے لفظ سے یاد کرتے ہیں (جو حدیث کا اعلیٰ درجہ ہے) سب سے ممتاز اور بلند پایہ ہیں، ان دونوں کے بعد امام مالک کی موطا اور امام ترمذی کی جامع امام ابو داؤد سجستانی کی سنن ابی داؤد امام نسائی، اور امام ابن ماجہ کے مجموعے اپنی بہت سی خصوصیتوں کی وجہ سے ممتاز ہیں، بعد کی اصلاحی کوششوں اور تجدیدی کارناموں میں محدثین کرام کی ان ابتدائی محنتوں کا بہت بڑا حصہ ہے آج بھی کوئی سنجیدہ اور وقیع اصلاحی تحریک اور دینی انقلاب کی کوشش اس علمی ذخیرہ سے مستغنی نہیں ہو سکتی۔

تدوین فقہ

اسی طرح فقہ کی تدوین مسائل کا استنباط و استخراج، جزئیات و فتاویٰ کی ترتیب، اسلام کی ایسی عملی ضرورت تھی جس کو بالکل موخر نہیں کیا جاسکتا تھا، اسلام جزیرۃ العرب سے نکل کر شام، عراق، مصر و ایران اور دوسرے وسیع اور زرخیز ملکوں میں پہنچ گیا تھا، معاشرت، تجارت، انتظام ملکی سب بہت وسیع اور پیچیدہ شکلیں اختیار کر گئے تھے، اس وقت ان نئے حالات و مسائل میں اسلام کے اصول کی تطبیق کے لئے بڑی علمی ذہانت، معاملہ فہمی، باریک بینی، زندگی اور سوسائٹی سے وسیع واقفیت، انسانی نفسیات اور اس کی کمزوریوں سے باخبری قوم کے طبقات اور زندگی کے مختلف شعبوں کی اطلاع اور اس سے پیشتر اسلام کی تاریخ و روایات اور روح شریعت گہری واقفیت، عہد رسالت اور زمانہ اصحابہ کے حالات سے پوری آگاہی اور اسلام کے

لے شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ صحیحین کے متعلق لکھتے ہیں: اما الصحیحان فقد اتفق المحدثون علی ان جمیع ما فیہما من المنصل المرفوع صحیح بالقطع وانہما متواتران الی مصنفیہما وانہ کل من یہون امرہما فہو مبتدع متبع غیر سبیل المؤمنین (عاستنا) یعنی محدثین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ان دونوں کتابوں میں جتنی متصل مرفوع روایات ہیں وہ قطعی طور پر صحیح ہیں اور ان دونوں کتابوں کی

نسبت اپنے مصنفین کی تو اتنے سے ثابت ہے، اور جو شخص ان دونوں کتابوں کی تکثیر کرتا ہے، وہ جنت دارالایمان کا راستہ چھوڑ کر چلنے والے ہے

پورے علمی ذخیرہ (قرآن و حدیث اور لغت و قواعد) پر کامل عبور کی ضرورت تھی۔

ائمہ اربعہ اور ان کی خصوصیات

یہ اللہ کا بہت بڑا فضل تھا، اور اس امت کی اقبال مندی کہ اس کا عظیم کئے ایسے لوگ میدان میں آئے، جو اپنی ذہانت، دیانت، اخلاص اور علم میں تاریخ کے ممتاز ترین افراد ہیں، پھر ان میں سے چار شخصیتیں امام ابو حنیفہ (م ۱۵۰ھ) امام مالک (م ۱۷۹ھ) امام شافعی (م ۲۰۴ھ) امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) جو فقہ کے چار دبستان فکر کے امام ہیں اور جن کی فقہ اس وقت تک عالم اسلام میں زندہ اور مقبول ہے اپنے تعلق باللہ، لہبیت، قانونی فہم، علمی انہماک اور جذبہ خدمت میں خاص طور پر ممتاز ہیں، ان حضرات نے اپنی پوری زندگی اور اپنی ساری قابلیتیں اس بلند مقصد اور اس اہم خدمت کے لئے وقف کر دی تھیں، انھوں نے دنیا کے کسی جاہ و اعزاز اور سی لذت و راحت سے سروکار نہیں رکھا تھا، امام ابو حنیفہ کو دو بار عمدہ قضا پیش کیا گیا، اور انھوں نے انکار کیا یہاں تک کہ قید خانہ ہی میں آپ کا انتقال ہوا، امام مالک نے ایک مسئلہ کے اظہار میں کوٹے کھائے اور ان کے شانے اتر گئے، امام شافعی نے زندگی کا بڑا حصہ عسرت میں گزارا، اور اپنی صحت قربان کر دی، امام احمد نے تنہا حکومت وقت کے رجحان اور اس کے "سرکاری مسلک" کا مقابلہ کیا اور اپنے مسلک و راہل سنت کے طریقہ پر پھاڑکی طرح جے رہے، ان میں سے ہر ایک نے اپنے موضوع پر تنہا اتنا کام کیا اور مسائل و تحقیقات کا اتنا بڑا ذخیرہ پیدا کر دیا، جو بڑی بڑی منظم جماعتیں اور علمی ادارے بھی آسانی سے نہیں پیدا کر سکتے، امام ابو حنیفہ نے تراسی ہزار مسائل اپنی زبان سے بیان کئے، جن میں سے اڑتیس ہزار عبادت سے تعلق رکھتے ہیں، اور پینتالیس ہزار معاملات سے۔

لے مسئلہ یہ تھا کہ مجبور کی طلاق کا کچھ اعتبار نہیں، اس مسئلہ کا سیاسی پہلو یہ تھا کہ خلفاء کے لئے جو بیعت لی جاتی تھی، اس میں یہ کہلایا جاتا تھا کہ اگر بیعت توڑی تو سب کو طلاق ہو جائے گی، اگر مجبور کی طلاق کا اعتبار نہیں تو بیعت کے اس حلف نامے میں کوئی طاقت اور تاثیر باقی نہیں رہ جاتی، اسی بنا پر حکومت کو امام مالک کے اس فتوے سے بڑی تشویش لاحق ہوئی، اور اس کے حکام نے ان کے ساتھ سخت برتاؤ کیا۔ ۱۷۹ھ فخر الاسلام بحوالہ مناقب ابی حنیفہ لکھی ص ۹۷ - ج ۲ ص ۱۵۵

شمس الائمہ کردری نے لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے جس قدر مسائل مدون کئے ان کی تعداد چھ لاکھ ہے، المدونہ میں جو امام مالک کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے چھتیس ہزار مسائل ہیں کتاب لام جو امام شافعی کے افادات کا مجموعہ ہے سات ضخیم جلدوں میں ہے ابو بکر خلیل (م ۳۳۵) نے امام احمد کے مسائل چالیس جلدوں میں جمع کئے۔

ائمہ اربعہ کے شاگرد و جانشین

پھر ان کو شاگرد ایسے متنازلے جنہوں نے اس ذخیرہ میں اضافہ کیا اور ان کی تنقیح و ترتیب کا کام جاری رکھا، امام ابوحنیفہ کے شاگردوں میں امام ابو یوسف جیسا قانونی دماغ نظر آتا ہے جس نے ہارن رشید کی وسیع ترین سلطنت کے قاضی القضاة کے فرائض کامیابی کے ساتھ انجام دیئے، اور اسلام کے اصول معاشیات پر کتاب الخراج جیسی عالمانہ تصنیف کی، اسی طرح ان کے شاگردوں میں امام محمد جیسا فقیہ اور مؤلف اور امام زفر جیسا صاحب قیاس نظر آتا ہے، جنہوں نے فقہ حنفی کو چار چاند لگائے، امام مالک کو عبدالشہب بن وہب، عبدالرحمن ابن القاسم، شہب بن عبدالعزیز، عبداللہ ابن عبدالحکم، یحییٰ بن یحییٰ اللہثی جیسے وفادار شاگرد اور لائق عالم ملے جن کی کوششوں سے مصر اور شمالی افریقہ فقہ مالکی کا حلقہ بگوش ہو گیا، امام شافعی کو بولطی، مزنی اور ربیع جیسے محنتی اور ذہین شاگرد ملے جنہوں نے فقہ شافعی کو مرتب و منقح شکل میں پیش کر دیا، امام احمد کی فقہ کو ابن قدامہ جیسا مصنف اور محقق حاصل ہوا جس نے المغنی جیسی عظیم الشان تصنیف کی جو فقہ اسلامی کے وسیع ذخیرہ میں خاص امتیاز رکھتی ہے۔

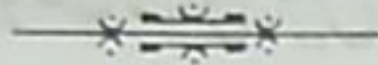
تدوین فقہ کا فائدہ

اسلام کی ابتدائی صدیوں میں ان ائمہ فن اور صاحب اجتہاد علماء کا پیدا ہونا اس دین کی

لہ سیرۃ النعمان (مولانا شبلی) بحوالہ قلائد عقود العقیان - ۲۷۵ اس کتاب کا نام "جامع العلوم لام احمد" ہے

ابو بکر خلیل کا مفصل حال شذرات الذہب فی اخبار من ذہب ج ۲ ص ۳۷۱ میں ملاحظہ ہو۔

زندگی اور اس امت کی کارکردگی کی صلاحیت کی دلیل تھی، ان کی کوششوں اور ذہانتوں سے اس امت کی عملی و معاملاتی زندگی میں ایک نظم اور وحدت پیدا ہو گئی اور اس ذہنی انتشار اور معاشرتی بے نظمی اور ابتتری سے محفوظ رہ گئی، جس کی قوتیں اپنے ابتدائی عہد میں شکار ہو چکی ہیں، انہوں نے فقہ کی ایسی بنیادیں قائم کر دیں اور ایسے اصول مرتب کر دیئے، جن سے بعد میں پیش آنے والے مسائل اور مشکلات کے حل کرنے میں مدد ملی جاسکتی ہے، اور عام معتدل زندگی کو باقاعدہ اور شرعی رہنمائی کے ساتھ گزارا جاسکتا ہے۔



فتنہ خلق قرآن اور امام احمد ابن حنبل

فلسفہ الہیات اور ذات و صفات کی بحثیں

دوسری صدی کی ابتدا ہی میں مسلمانوں کا تعارف یونانی فلسفہ سے ہوا یہ فلسفہ محض چند خیالات قیاسات کا مجموعہ اور الفاظ کا ایک طلسم تھا، جس کے پیچھے کوئی حقیقت و اصلیت نہ تھی، محدود الفاظ جن کے ساتھ خاص صورت اور تجربات وابستہ ہوں، ایک غیر محدود ذات کی حقیقت و صفات کو کس طرح بیان کر سکتے ہیں، اللہ کی ہستی اور اس کی ذات و صفات کا مسلک کیمیاوی طرز کی تحلیل و تجزیہ اور علمی مونثکافیوں اور قیاس آرائیوں کا میدان نہ تھا، اس معاملہ میں انسانوں کو وہ ابتدائی معلومات اور ذاتی تجربات ہی حاصل نہیں، جن پر بحث و قیاس کی عمارت قائم کی جاسکے، اس بارہ میں انسانوں کا ذریعہ علم صرف انبیاء علیہم السلام کی اطلاع اور وحی الہی ہے، اسی اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت اور اس کی صفت بیان کرنے کا طریقہ معلوم ہو سکتا ہے، اور اسی پر انکشاف کرنا عقل کی پختگی اور بالغ نظری ہے، مسلمانوں کے پاس قرآن و حدیث کی صورت میں یہ علم محکم موجود تھا، اور ان کو اس نیشنل بے حاصل (الہیاتی مباحث) کی مطلق ضرورت نہ تھی، صحابہ کرام، تابعین، ائمہ دین اور محدثین اسی مسلک پر قائم تھے، اور مسلمانوں کی ساری توجہ دعوت اسلام، فتح و جہاد، اور زندگی کے عملی مسائل، اور مفید علوم کی تدوین میں مصروف تھی، جب یونانی اور سریانی کتابوں کے تراجم ہوئے اور قدیم مذاہب و ممالک کے علماء و متکلمین سے اختلاط ہوا تو امت کے وہ گروہ جو جلد متاثر ہونے کی قابلیت رکھتے تھے، اور جن کی ذہانت میں گہرائی اور پختگی سے

زیادہ سطحیت اور جہت تھی، اس طرز فکر اور طریقہ بحث سے متاثر ہوئے، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات ان کے باہمی تعلق، کلام الہی، رویت باری، مسئلہ عدل، تقدیر، جبر و اختیار کے متعلق ایسی بحثیں اور مسائل پیدا ہو گئے، جو نہ دینی حیثیت سے ضروری تھے، نہ دنیاوی حیثیت سے مفید، بلکہ امت کی وحدت اور مسلمانوں کی قوت عمل کے لئے مضر۔

معترکہ کا عروج

دینی فلسفیوں کے اس گروہ کی امامت معترکہ کر رہے تھے، جو اپنے وقت کے "روشن خیال" عالم اور پر جوش متکلم تھے، انھوں نے ان علمی بحثوں کو کفر و ایمان کا معیار بنا دیا، اور اپنی ساری ذہانتوں کو ان مباحث پر لگا دیا، ان کے مقابلہ میں محدثین و فقہاء اگر وہ تھے، جو ان مسائل میں سلف کے مسلک کا قائل تھے، اور ان مونثکافیوں کو مضر اور ان تعبیرات کو غلط سمجھتا تھا، ہارون رشید کے دور خلافت تک معترکہ عروج حاصل نہیں ہوا، مومن کے زمانہ میں جو یونانی فلسفہ اور عقیدت سے مرعوب تھا، اور مخصوص تربیت اور حالات کی وجہ سے اس کی دماغی ساخت معترکہ سے ملتی جلتی تھی، معترکہ کو عروج حاصل ہوا اور قاضی ابن ابی ذؤانہ کی بدولت جو سلطنت عباسیہ کا قاضی القضاة ہو گیا تھا، اور معترکہ کے افکار و آراء کا پر جوش داعی اور مبلغ تھا، مذہب اعترال کو حکومت وقت کی سرپرستی اور حمایت حاصل ہو گئی، مومن میں خود دعوت کی روح اور ایک داعی کا جوش اور جذبہ تبلیغ تھا، اس میں ذہین نوجوانوں کی عجلت پسندی اور مطلق العنان فرماں رواؤں کی ضد (راج ہٹ) دونوں جمع تھیں، اس کے دربار اور مزاج پر معترکہ حاوی تھے۔

۱۔ اس نے ایک مرتبہ حضرت علیؑ کی تفصیل کا اعلان کر دیا جس سے ملک میں خاصی برپا پیدا ہوئی، ایک مرتبہ معترکہ کے جواز کا اعلان کیا، پھر جب قاضی القضاة یحییٰ بن اکثم نے علمی طور پر اس کو قائل کیا تو اس کی حرمت کا اعلان کروا دیا۔

عقیدہ خلق قرآن^۱ اس وقت معتزلہ کا شعار اور کفر و ایمان کا معیار بن گیا تھا، محدثین اس مسئلہ میں معتزلہ کے حریف اور مد مقابل تھے اور محدثین کی طرف سے امام احمد بن حنبل^۲ اس مسئلہ میں سینہ سپر تھے۔

امام احمد بن حنبل

امام احمد بن حنبل^۳ ربيع الاول ۱۶۲ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے، وہ خالص عربی النسل اور قبیلہ اشجینا میں سے تھے، صبر و ہمت اور استقامت و عزیمت اس قبیلہ کے تاریخی خصائص میں سے ہیں، ان کے دادا حنبل بن ہلال بصرہ سے خراسان منتقل ہو گئے، اموی حکومت میں وہ علاقہ سرخس کے حاکم بھی تھے، لیکن جب عباسیوں نے اہل بیت اور بنی ہاشم کے نام سے خراسان میں اپنی دعوت پھیلانی تو وہ اس دعوت کے ہمدردوں اور کارکنوں میں تھے، امام احمد کی ماں مرو سے بغداد آئیں، تو وہ پیٹ میں تھے، ولادت سے پہلے ان کے والد کا انتقال ہو گیا تھا، ماں نے بڑی ہمت اور حوصلہ مندی سے پرورش کی، گذر اوقات کے لئے برائے نام ایک جائیداد بھی ان حالات نے ان میں تھکن و جھاکشی اور عزم و اعتماد علی النفس کی صفات پیدا کر دیں، بچپن میں قرآن مجید حفظ کیا، اور زبان کی تعلیم حاصل کی، پھر ایک دفتر میں داخل ہوئے تاکہ تحریر و انشاء کی مشق حاصل کریں، نجابت اور صلاحیت کے

لے خلق قرآن کی بحث ایک خاص علمی اور فلسفیانہ بحث تھی جس کا داعی اثر (جیسا کہ بعض اعتزال دوست مورخین نے اعتراف کیا ہے) یہ پڑنا لازمی تھا کہ قرآن مجید کی عظمت و جلالت اور اس کے لفظاً و معنیاً کلام الہی ہونے کا عقیدہ کمزور پڑ جاتا، محدثین معتزلہ کی ان تعبیرات کو غلط اور امت کے لئے مضربِ بھتہ تھے، اس لئے انھوں نے اس کی علانیہ مخالفت کی، معتزلہ روشن خیال اور آزادی آرا کا احترام کرنے والے مشہور ہیں، لیکن انھوں نے اس مسئلہ میں سخت غلو اور مذہبی جبر و استبداد سے کام لیا، اور اپنی ناعاقبت اندیشی سے سارے عالم اسلام کو میدان جنگ اور دارالامتحان بنا دیا، انھوں نے اس مسئلہ میں اپنے مخالفین کے ساتھ وہ سلوک کیا جو قرون وسطیٰ میں ارباب کلیسا نے آزاد خیالوں کے ساتھ کیا تھا، بالآخر یہی سختی اور حکومت وقت کی سرپرستی مذہب اعتزال اور معتزلہ کے زوال کا باعث ہوئی۔

۱۰۰۰ عہد صدیقی کے مشہور سپہ سالار ثمنی بن حارثہ کا تعلق اسی قبیلہ سے تھا۔

آثار بچپن سے نمایاں تھے، ان کے چچا بغداد کے وقائع نگار تھے اور خلیفہ کی غیر موجودگی میں وہ پرچہ نویسی کرتے تھے، اور خبریں بھیجتے تھے، ایک مرتبہ انھوں نے یہ تحریریں اپنے کمن بھتیجے کے سپرد کیں کہ وہ ایک معین شخص کو پہنچا دیں، انھوں نے اس خیال سے کہ اس میں اہل بغداد کی شکایت اور بہت سے لوگوں کی مخبری ہوگی، ان کاغذات کو دجلہ میں ڈال دیا، جب وہ دفتر میں خطوط نویسی کی مشق کرتے تھے تو بہت سی عورتیں جن کے شوہر ہارون رشید کے ساتھ فوج میں باہر گئے ہوئے تھے، ان سے خط پڑھواتی اور جواب لکھواتی تھیں، وہ خطوط لکھ دیا کرتے تھے، لیکن جس مضمون کو شریعت یا تہذیب کے خلاف سمجھتے تھے، اس کو نہیں لکھتے تھے، تقویٰ اور طہارت اور صلاحیت نجابت کے انہی آثار کو دیکھ کر ان کے زمانہ کے ایک صاحب نظر (سلیم بن جبیل) نے کہا تھا کہ اگر یہ نوجوان زندہ رہا تو اہل زمانہ پر حجت ہو گا۔

علوم دینیہ میں انھوں نے حدیث کی طرف خصوصی توجہ کی، سب سے پہلے قاضی ابویوسف رحمہ اللہ سے حدیث کی کتابت کی، پھر چار برس تک بغداد میں امام حدیث سلیم بن بشر بن ابوحازم الوسطی (م ۸۲ھ) سے استفادہ کرتے رہے، اس اثنا میں مشہور ائمہ حدیث عبدالرحمن بن مہدی، ابوبکر بن عیاش وغیرہ سے استفادہ کیا، ان کا اپنے مقصد میں مستعدی اور سرگرمی کا اندازہ اس سے ہو گا کہ وہ کہتے ہیں کہ میں بعض دن حدیث سننے کے لئے اتنے سویرے جانے کا ارادہ کرتا کہ میری ماں میرا دامن پکڑ لیتیں کہ اتنا تو ٹھہر جاؤ کہ اذان ہو جائے اور کچھ اجالا ہو جائے۔ بغداد سے فارغ ہو کر انھوں نے بصرہ، حجاز، یمن، شام اور جزیرہ کا سفر کیا اور ہر جگہ کے نامور محدثین سے استفادہ کیا۔

۸۴ھ میں حجاز کے پہلے سفر میں ان کی ملاقات امام شافعی سے ہوئی، پھر بغداد میں دوبارہ ملاقات ہوئی، جب کہ وہ اپنے اصول اور اپنی فقہ بہت کچھ مدون کر چکے تھے، امام احمد اس وقت پختہ کار ہو چکے تھے، امام شافعی احادیث کے صحت و مستم کے بارے میں اکثر ان پر اعتماد کرنے اور فرماتے تھے، کہ اگر تم محدثین کے یہاں

۱۰۰۰ لے تاریخ حافظہ ہی (ترجمہ امام احمد بن حنبل) ۱۰۰۰ المناقب لابن ابی حوزی ص ۲۳ ۱۰۰۰ ایضاً

حدیث صحیح ہو تو مجھے بتلا دیا کرو میں اسی کو اختیار کروں گا۔

انہوں نے جریر بن عبد الحمید محدث سے حدیث سننے کے لئے رے (ایران) جانے کا بھی قصد کیا، لیکن خرچ نہ ہونے کی وجہ سے نہ جاسکے کہتے تھے کہ اگر میرے پاس ۹۰ درہم بھی ہوتے تو میں چلا جاتا، طلب حدیث میں ان کی بلند ہمتی کا اندازہ اس سے ہوگا کہ ۱۹۸ھ میں انہوں نے حج کی نیت سے حجاز اور وہاں کچھ دن قیام کر کے عبد الرزاق بن ہمام سے حدیث سننے کے لئے صنعاء میں کا قصد کیا تھا اور اپنے ہم درس یحییٰ بن معین سے اس کا تذکرہ بھی کر دیا تھا، دونوں نے اس کی نیت کی اور کہہ پونچے، ابھی دونوں طواف قدم کر رہے تھے کہ عبد الرزاق بن ہمام طواف کرتے دکھائی دیئے، ابن معین ان کو پہچانتے تھے، انہوں نے سلام کیا، اور امام احمد کا تعارف کرایا، انہوں نے ان کو دعویٰ اور کہا کہ میں نے ان کی بڑی تعریف سنی ہے، یحییٰ بن معین نے کہا کہ ہم کل آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور آپ سے حدیث کی سماعت کریں گے، جب وہ چلے گئے، تو امام احمد نے اپنے رفیق سے کہا کہ تم نے شیخ سے کیوں وعدہ لے لیا؟ انہوں نے کہا کہ حدیث سننے کے لئے شکر کرو کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو ایک ہمینہ کے سفر، پھر واپسی کے ایک ہمینہ اور مصارف کثیر سے بچالیا، اور شیخ کو ہمیں پہنچا دیا، امام احمد نے کہا کہ مجھے خدا سے شرم آتی ہے کہ میں حدیث کے لئے سفر کی نیت کروں، پھر اسی وجہ سے فسح کر دوں، ہم تو جائیں گے اور وہیں جا کر سنیں گے چنانچہ حج کے بعد صنعاء گئے، اور زہری اور ابن المسیب کی روایتوں کی (جو پہلے سے ان کی سنی ہوئی نہیں تھیں) انہوں نے وہاں سماعت کی۔

اس بلند ہمتی، جفاکشی، کثرت اسفار اور فطری اور غیر معمولی قوتِ حافظہ کا نتیجہ تھا کہ ان کو دس لاکھ حدیثیں یاد تھیں، اس وسعتِ علم اور کثرتِ حفظ کے باوجود وہ امام شافعی کے تفقہ، حسن استنباط اور زکاوت سے متاثر تھے، اور کہتے تھے کہ "مادرات عینائی مثلہ" انہوں نے اس سے اجتہاد کے اصول سیکھے، اور اس کا ملکہ اخذ کیا، اور بالآخر وہ اس امت کے نامور مجتہدین میں ہوئے، جن کی فقہ ابھی تک عالم اسلام میں زندہ ہے، امام شافعی بھی

لے ابن کثیر اور ابن جوزی۔

ان کے بڑے محترف اور قدردان تھے، بغداد سے جاتے ہوئے انہوں نے فرمایا "خروجت من بغداد وما خلفت بها اتقى وافقه من ابن حنبل" (میں بغداد چھوڑ کر جا رہا ہوں، اس حالت میں کہ وہاں احمد بن حنبل سے بڑھ کر نہ کوئی متقی ہے نہ کوئی فقیہ)۔

چالیس سال کی عمر میں غالباً ۲۲۵ھ میں انہوں نے حدیث کا درس دینا شروع کیا، یہ بھی ان کا کمال اتباع سنت تھا کہ انہوں نے عمر کے چالیسویں سال جو سن نبوت ہے، اشاعت شروع کی، ابتدا ہی سے ان کے درس میں طالبین و سامعین کا ازدحام ہوتا تھا، بعض راویوں کا بیان ہے کہ ان کے درس کے سامعین کی تعداد پانچ پانچ ہزار ہوتی تھی جن میں سے پانچ پانچ سو صرف لکھنے والے ہوتے تھے، ان کے درس کی مجلسیں بڑی باوقار اور سنجیدہ ہوتی تھیں، کوئی وہاں تفریح کی بات یا غیر سنجیدہ حرکت جو حدیث کے وقار کے خلاف ہے نہیں کر سکتا تھا، غبار کو امرا اور اہل دنیا کے مقابلہ میں ترجیح اور اعزاز حاصل تھا، علامہ ذہبی امام احمد کے ایک رفیق اور ہم عصر کا بیان نقل کرتے ہیں:-

لم ارالفقیر فی مجلس اعز منہ فی مجلس
 میں نے غریب آدمی کو جتنا امام احمد کی مجلس درس
 الی عند اللہ، کان ما لا الیہم، مقصراً
 میں معزز دیکھا کہیں نہیں دیکھا، وہ غریب کی طرف توجہ
 عن اهل الدنيا، وکان فیہ حلم ولم
 بے تھے، اور امرا سے بے رنجی برتتے تھے، ان میں علم و
 یکن بالعقول، وکان کثیر التواضع
 وقار تھا، ان کے مزاج میں عجلت نہ تھی، بڑے متواضع
 تعلواہ السکینۃ والوقار الخاجلس فی
 اور کسر المزاج تھے، طمانینت اور وقار ان کے چہرہ سے
 مجلسہ للقیابعد العصور لا یتکلم حتی یشالہ
 عیاں تھا، عصر کے بعد جب درس کے لمبے بیٹھے توجہ تک
 ان سے سوال نہ کیا جائے گفتگو نہ فرماتے تھے۔

ان کی زندگی ائمہ سلف کی طرح فقر و زہد اور توکل و قناعت کی زندگی تھی، اور ان کا فقر اختیاری

لے ابن حنبل محمد ابو زہرہ ۳۳-۳۴ ۲۵ ترجمہ الامام ۲۵

تھا، انھوں نے کبھی خلفاء اور سلاطین وقت کا کوئی عطیہ قبول نہیں کیا، ان کے لڑکوں نے کبھی ان سے اس مسئلہ پر
 استچیت کی تو انھوں نے فرمایا کہ یہ مال حلال ہے، اس سے حج درست ہے، میں اس کو حرام سمجھ کر نہیں، بلکہ احتیاطاً
 چھوڑتا ہوں، وہ محنت کر کے یا اپنی آبائی جائیداد کی آمدنی سے گزارا کرتے تھے، اس فقر و تنگی کے باوجود بڑے فیاض
 اور عالی حوصلہ تھے، فرماتے تھے، اگر ساری دنیا سمٹ کر ایک لقمہ بن جائے اور وہ لقمہ کسی مسلمان کے ہاتھ میں ہو اور وہ
 مسلمان اس لقمہ کو کسی مسلمان بھائی کے منہ میں رکھ دے تو ذرا بھی اسراف نہ ہوگا، وہ صرف مال کے بارے میں نہیں
 بلکہ اپنی ذات کے بارے میں بھی بڑے فراخ حوصلہ اور عالی ظرف تھے، ایک شخص نے ایک موقع پر ان کو بہت سخت
 سست کہا، تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کو ندامت ہوئی، اور اس نے آکر معذرت کی، اور کہا کہ آپ مجھے معاف
 کر دیں، فرمایا جہاں یہ بات ہوئی تھی وہاں سے قدم اٹھانے سے پہلے میں تم کو معاف کر چکا تھا، انھوں نے فتنہ خلیفہ خلیفہ
 میں اپنے سب دشمنوں کو حتیٰ کہ خلیفہ وقت کو جس کے حکم سے ان کو سخت ترین اذیت پہنچی تھی، معاف کر دیا، فرماتے
 تھے کہ صرف داعی بدعت کو تو معاف نہیں کرتا، ورنہ جس نے میری اذیت میں حصہ لیا ہے، سب میری طرف سے
 آزاد ہیں، کبھی فرماتے کہ تمہارا اس میں کیا نفع ہے کہ تمہارے سبب سے کسی مسلمان کو عذاب دیا جائے۔

ان کمالات و اوصاف کے ساتھ کبھی ان کو اپنی عظمت کا احساس نہیں ہوتا تھا، اور کوئی فخریہ کلمہ
 ان کی زبان سے نہیں نکلتا تھا، ان کے ساتھی یحییٰ بن معین کہتے ہیں:-

ما رأیت مثل احمد بن حنبل صحبتہ میں نے احمد جیسا آدمی نہیں دیکھا میں پچاس برس

خمیسین سنۃ ما افتخر علینا بشئ مما کان ان کے ساتھ رہا، انھوں نے کبھی ہمارے سامنے

فیہ من الصلاح والخیر

اپنی صلاح و خیر پر فخر نہیں کیا۔

ان کی تواضع اور اخفائے حال کا یہ حال تھا کہ اگرچہ وہ عالی نسب عرب تھے، اور یہ اس دور میں بڑا
 سرمایہ فخر تھا، لیکن اس کا تذکرہ بھی وہ پسند نہیں کرتے تھے، علامہ ذہبی ان کے ایک معاصر عام ابونعمان سے

نقل کرتے ہیں کہ احمد بن حنبل نے میرے پاس اپنا خرچ رکھا دیا تھا، اور اس سے بقدر ضرورت وہ لیتے رہتے تھے،

ایک دن میں نے ان سے کہا کہ ابو عبد اللہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ عرب ہیں، انھوں نے جواب دیا: "یا ابانا النعمان نحن قوم مساکین"
 (ابونعمان ہمارا کیا ہم غریب لوگ ہیں، ہمیں ان سے بہت پوچھا رہا، مگر انھوں نے مال دیا، اور کوئی جواب نہیں دیا۔

باوجود اس کے کہ فتنہ خلیفہ قرآن میں ان کی ثابت قدمی کی وجہ سے تمام عالم اسلام میں ان کا چرچا تھا، اور
 ہر طرف ان کی تعریف اور ان کے لئے دعا کا غلغلہ بلند تھا، وہ برابر خائف رہتے تھے، اور ان کو اپنی طرف سے
 اطمینان نہیں تھا، مروزی کہتے ہیں کہ میں نے ایک روز ان سے کہا کہ آپ کے لئے بڑی کثرت سے دعا ہوتی ہے،
 فرمایا مجھے اندیشہ ہے کہ میں استدراج نہ ہو، کیوں تم نے یہ کیسے کہا، میں نے کہا کہ طرسوس سے ایک شخص آیا ہے وہ کہتا
 ہے کہ ہم ملک و م میں جہاد کر رہے تھے، رات کے سناٹے میں احمد کے لئے دعا کا شور مچا، اور کہنے والے نے کہا کہ احمد
 کے لئے دعا کرو! ہم امام احمد کی طرف سے نیت کر کے منجیق بھی چلاتے تھے، اور ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ دشمن کا
 ایک شخص قلعہ کی دیوار پر کھڑا ہوا تھا، اور سپر کو بالکل آڑ بنا لے ہوئے تھا، ہم نے احمد کی نیت کر کے منجیق چلائی،
 اس کا سر اور سپر اڑ گئی، یہ سن کر امام احمد کے چہرہ کا رنگ بدل گیا، اور فرمایا خدا کرے یہ استدراج نہ ہو!

بعض مرتبہ ان کو دیکھنے کے لئے غیر مسلم بھی دور دور سے آتے، ایک مرتبہ ایک عیسائی طبیب علاج کے لئے
 آیا، اس نے کہا کہ میں کئی سال سے آپ کی زیارت کا آرزو مند تھا، آپ کی زندگی صرف اسلام ہی کے لئے خیر و برکت
 کا باعث نہیں، ساری مخلوق کے لئے وہ خیر و برکت ہے، ہمارے سب دوست آپ سے بہت خوش ہیں، مروزی کہتے ہیں کہ
 جب وہ چلا گیا تو میں نے عرض کیا کہ میرا خیال ہے کہ ساری دنیا سے اسلام میں آپ کے لئے دعا ہوتی ہوگی، انھوں نے
 فرمایا کہ بھائی انسان پر اپنی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے، تو کوئی کچھ کہے، اس کو دھوکہ نہیں ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تواضع اور مسکنت کے ساتھ ان کو رعب و وقار بھی اتنا بخشا تھا کہ اہل حکومت اور
 فوجی اور سپاہی بھی ان سے معوب ہو جاتے تھے، اور ان کا احترام کرنے پر مجبور تھے، ان کے ایک معاصر کہتے ہیں کہ

لے خدا کی طرف سے ذلیل اور کسی غیر مقبول اور فاسد العقیدہ آدمی کی کرامت اور وجاہت کا ظہور سنہ ۲۲۰ھ (ذہبی) ص ۲۲۰

اور وقائع نگار متعین کر دیئے کہ حالات کی اطلاع برابر ملتا رہے، ہجوم دم بہ دم بڑھتا جاتا تھا، یہاں تک کہ گلی بند کر دی گئی، لوگ سڑکوں اور مسجدوں میں بھر گئے، یہاں تک کہ بازار میں خرید و فروخت مشکل ہو گئی، پیشاب خون کا آنے لگا تھا، طبیعت دریافت کیا گیا تو اس نے کہا کہ غم اور فکر نے ان کے پیٹ کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے، جمعرات کو طبیعت زیادہ خراب ہو گئی، ان کے شاگرد مروزی کہتے ہیں کہ میں نے ان کو وضو کرایا، تو انہوں نے تکلیف کی حالت میں بھی مجھے ہدایت کی کہ انگلیوں میں خلال کراؤں، شب جمعہ میں حالت زیادہ نازک ہو گئی اور جمعہ ۱۲ ربیع الاول کو اس امام سنت نے انتقال کیا۔

فتنہ خلق قرآن

مامون نے خلق قرآن کے مسئلہ پر اپنی پوری توجہ مرکوز کر دی، ۲۱۸ھ میں اس نے والی بغداد اسحق بن ابراہیم کے نام ایک مفصل فرمان بھیجا جس میں عامہ مسلمین اور بالخصوص محدثین کی سخت مذمت اور حقارت آمیز تنقید کی، ان کو خلق قرآن کے عقیدہ سے اختلاف کرنے کی وجہ سے توحید میں ناقص، مردود الشہادۃ، ساقط الاعتبار اور شرار امت قرار دیا، اور حاکم کو حکم دیا کہ جو لوگ اس مسئلہ کے قائل نہ ہوں، ان کو ان کے عہدوں سے معزول کر دیا جائے اور خلیفہ کو اس کی اطلاع کی جائے۔

یہ فرمان مامون کی وفات سے چار مہینے قبل کا ہے، اس کی نقلیں تمام اسلامی صوبوں کو بھیجی گئیں اور صوبہ داروں (گورنروں) کو ہدایت کی گئی کہ اپنے اپنے صوبوں کے قضاة کا اس مسئلہ میں امتحان لیں، اور جو اس عقیدہ سے متفق نہ ہو، اس کو اس کے عہدہ سے ہٹا دیا جائے۔

اس فرمان کے بعد مامون نے حاکم بغداد کو لکھا کہ سات بڑے محدثین کو (جو اس عقیدہ کے مخالفین کے

۱۔ ذہبی ص ۳۷۷ ۲۔ بخاری تاریخ کبیر و صغیر ۳۔ جنازہ و کفن کی تفصیل آگے آئے گی۔

۴۔ اس خط کا مکمل مضمون تاریخ طبری اور طیفور کی تاریخ بغداد میں موجود ہے۔

سرگروہ ہیں، اس کے پاس بھیج دیا جائے، وہ سب آئے تو مامون نے ان سے خلق قرآن کے متعلق سوال کیا، ان سب نے اس سے اتفاق کیا، اور ان کو بغداد واپس کر دیا گیا، جہاں انہوں نے علماء و محدثین کے ایک مجمع کے سامنے اپنے اس عقیدہ کا اقرار کیا، لیکن شورش ختم نہیں ہوئی، اور عام مسلمان اور تقریباً تمام محدثین اپنے خیال پر قائم رہے۔ انتقال سے پہلے مامون نے اسحق بن ابراہیم کو تیسرا فرمان بھیجا، جس میں ذرا تفصیل سے پہلے خط کے مضمون بیان کیا تھا، اور امتحان کے دائرہ کو وسیع کر کے اہلکاران سلطنت اور اہل علم کو بھی اس میں شامل کر لیا تھا، اور سب کے لئے اس عقیدہ کو ضروری قرار دیا تھا، اسحق نے فرمان شاہی کی تعمیل کی، اور شاہی علماء کو جمع کر کے ان سے گفتگو کی، اور ان کے جوابات اور کلامہ کو بادشاہ کے پاس لکھ کر بھیج دیا، مامون اس محضر کو پڑھ کر سخت برا فروختہ ہوا، ان علماء میں سے دو (بشر بن الولید اور ابراہیم ابن المہدی) کے قتل کا حکم دیا، اور لکھا کہ بقیہ میں سے جس کو اپنی رائے پر اصرار ہو، اس کو پابجولاں اس کے پاس بھیج دیا جائے، چنانچہ بقیہ تیس علماء میں سے (جو پہلے قائل نہیں ہوئے تھے) چار اپنی رائے (عدم خلق قرآن) پر قائم رہے، یہ چار اشخاص امام احمد بن حنبل، سجادہ، قواریری، اور محمد بن نوح تھے، دوسرے دن سجادہ اور تیسرے دن قواریری نے بھی اپنی رائے سے رجوع کیا، اور صرف امام اور محمد بن نوح باقی رہے، جن کو مامون کے پاس طوس، تھکڑیوں اور بیڑیوں میں روانہ کر دیا گیا، ان کے ہمراہ انیس دوسرے مقامات کے علماء تھے، جو خلق قرآن کے منکر اور اس کے غیر مخلوق ہونے کے قائل تھے، ابھی یہ لوگ رقعہ ہی پہنچے تھے کہ مامون کے انتقال کی خبر ملی، اور ان کو حاکم بغداد کے پاس بغداد واپس کر دیا گیا، راستہ میں محمد بن نوح کا انتقال ہو گیا، اور امام اور ان کے رفقاء بغداد پہنچے۔

مامون نے اپنے جانشین معتمد بن الرشید کو وصیت کی تھی کہ وہ قرآن کے بارے میں اس کے مسلک و عقیدہ پر قائم رہے، اور اسی کی پالیسی پر عمل کرے (وخذ بسیرۃ اخیک فی القرآن) اور قاضی ابن ابی دواد کو بدستور اپنا مشیر اور وزیر بنا لے، چنانچہ معتمد نے ان دونوں وصیتوں پر پورا پورا عمل کیا۔

امام احمد ابتلاء و امتحان میں

اب مسئلہ خلق قرآن کی مخالفت اور عقیدہ صحیحہ کی حمایت اور حکومت وقت کے مقابلہ کی ذمہ داری تنہا امام احمد بن حنبل کے اوپر تھی جو گروہ محدثین کے امام اور سنت و شریعت کے اس وقت امین تھے۔

امام احمد کو رقعہ سے بغداد لایا گیا، چار چار بیڑیاں ان کے پاؤں میں پڑی تھیں، تین دن تک ان سے اس مسئلہ پر مناظرہ کیا گیا، لیکن وہ اپنے اس عقیدہ سے نہیں ہٹے جو تھے دن والی بغداد کے پاس ان کو لایا گیا، اس نے کہا کہ احمد بن حنبل کو اپنی زندگی ایسی دو بھر ہے، خلیفہ تم کو اپنی تلوار سے قتل نہیں کرے گا، لیکن اس نے قسم کھائی ہے کہ اگر تم نے اس کی بات قبول نہ کی تو مار پر مار پڑے گی اور تم کو ایسی جگہ ڈال دیا جائے گا جہاں کبھی سورج نہیں آئے گا، اس کے بعد امام کو معتصم کے سامنے پیش کیا گیا، اور ان کو اس انکار و اصرار پر ۲۸ کوڑے لگائے گئے، ایک تازہ جلاذ صرف دو کوڑے لگاتا تھا، پھر دوسرا جلاذ بلایا جاتا تھا، امام احمد ہر کوڑے پر فرماتے تھے:-

اعطونی شیئا من کتاب اللہ اوستة
میرے سامنے اللہ کی کتاب یا اس کے رسول کی
رسولہ حتی اقول بہ
سنت سے کچھ پیش کرو تو میں اس کو مان لوں۔

واقعہ کی تفصیلات امام احمد کی زبان سے

امام احمد نے اس واقعہ کو خود تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:-

"میں جب اس مقام پر پہنچا جس کا نام باب البستان ہے تو میرے لئے سواری لائی گئی، اور مجھ کو سوار ہونے کا حکم دیا گیا، مجھے اس وقت کوئی سہارا دینے والا نہیں تھا، اور میرے پاؤں میں بوجھل بیڑیاں تھیں، سوار ہونے کی کوشش میں کئی مرتبہ اپنے منہ کے بل گرتے گرتے بچا، آخر کسی نہ کسی طرح سوار ہوا اور معتصم کے محل میں پہنچا، مجھے ایک کوٹھی میں داخل کر دیا گیا، اور دروازہ بند کر دیا گیا، آدھی رات کا

وقت تھا، اور وہاں کوئی چراغ نہیں تھا، میں نے نماز کے لئے مسح کرنا چاہا، اور ہاتھ بڑھایا تو پانی کا ایک پیالہ اور طشت رکھا ہوا ملا، میں نے وضو کیا، اور نماز پڑھی، اگلے دن معتصم کا قاصد آیا اور مجھے خلیفہ کے دربار میں لے گیا، معتصم بیٹھا ہوا تھا، قاضی القضاة ابن ابی ذؤاد بھی موجود تھا، اور ان کے ہم خیالوں کی ایک بڑی جمعیت تھی، ابو عبد الرحمن الشافعی بھی موجود تھے اسی وقت دو آدمیوں کی گردنیں بھی اڑائی جا چکی تھیں، میں نے ابو عبد الرحمن الشافعی سے کہا کہ تم کو امام شافعی سے مسح کے بارے میں کچھ یاد ہے؟ ابن ابی ذؤاد نے کہا کہ اس شخص کو دیکھو کہ اس کی گردن اڑائی جانے والی ہے، اور یہ فقہ کی تحقیق کر رہا ہے، معتصم نے کہا کہ ان کو میرے پاس لاؤ، وہ برابر مجھے پاس بلاتا رہا، یہاں تک کہ میں اس سے بہت قریب ہو گیا، اس نے کہا بیٹھ جاؤ، میں بیڑیوں سے تھک گیا تھا، اور بوجھل ہو رہا تھا، تھوڑی دیر کے بعد میں نے کہا کہ مجھے کچھ کہنے کی اجازت ہے، خلیفہ نے کہا کہ میں نے کہا کہ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اللہ کے رسول نے کس چیز کی طرف دعوت دی ہے؟ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اس نے کہا کہ لا الہ الا اللہ کی شہادت کی طرف، میں نے کہا تو میں اس کی شہادت دیتا ہوں، پھر میں نے کہا کہ آپ کے جد امجد ابن عباس کی روایت ہے کہ جب قبیلہ عبد القیس کا وفد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے ایمان کے بارے میں آپ سے سوال کیا، فرمایا تمہیں معلوم ہے کہ ایمان کیلئے، انھوں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ معلوم ہے، فرمایا اس بات کی گواہی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں، نماز کی پابندی، زکوٰۃ کی ادائیگی اور مال غنیمت میں سے پانچویں حصہ کا نکلانا، اس پر معتصم نے کہا کہ اگر تم میرے پیش رو کے ہاتھ میں پتلے نہ آگے ہوتے تو میں تم سے تعرض نہ کرتا، پھر عبد الرحمن بن اسحاق کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ میں نے تم کو حکم نہیں دیا تھا کہ اس آزمائش کو ختم کرو، امام احمد کہتے ہیں کہ میں نے کہا اللہ اکبر اس میں تو مسلمانوں کے لئے کشائش ہے، خلیفہ نے علماء حاضرین سے کہا کہ ان سے مناظرہ کرو اور گفتگو کرو، پھر عبد الرحمن سے کہا کہ ان سے گفتگو کرو (یہاں امام احمد اس مناظرہ کی تفصیل بیان

کرتے ہیں) :-

ایک آدمی بات کرتا، اور میں اس کا جواب دیتا، دوسرا بات کرتا، اور میں اس کا جواب دیتا، معتمد کہتا، احمد! تم پر خدا رحم کرے، تم کیا کہتے ہو، میں کہتا امیر المؤمنین! مجھے کتاب الشریعت رسول میں سے کچھ دکھائیے تو میں اس کا قائل ہو جاؤں، معتمد کہتا کہ اگر یہ میری بات قبول کر لیں تو میں اپنے ہاتھ سے ان کو آزاد کروں، اور اپنے فوج و لشکر کے ساتھ ان کے پاس جاؤں اور ان کے آستانہ پر حاضر ہوں، پھر کہتا احمد! میں تم پر بہت شفیق ہوں اور مجھے تمہارا ایسا ہی خیال ہے، جیسے اپنے بیٹے ہارون کا، تم کیا کہتے ہو، میں وہی جواب دیتا کہ مجھے کتاب الشریعت رسول میں سے کچھ دکھاؤ تو میں قائل ہوں، جب بہت دیر ہو گئی تو وہ اگٹا گیا اور کہا جاؤ، اور مجھے قید کر دیا اور میں اپنی پہلی جگہ پر واپس کر دیا گیا، اگلے دن پھر مجھے طلب کیا گیا، اور مناظرہ ہوتا رہا اور میں سب کا جواب دیتا رہا، یہاں تک کہ زوال کا وقت ہو گیا، جب اگٹا گیا تو کہا کہ ان کو لیجاؤ، تیسری رات کو میں سمجھا کہ کل کچھ ہو کر ہے گا، میں نے ڈوری منگوائی اور اس سے اپنی بیڑیوں کو کس لیا، اور جس ازار بند سے میں نے بیڑیاں باندھ رکھی تھیں، اس کو اپنے پاؤں میں پھر ڈال لیا کہ ہمیں کوئی سخت وقت آئے اور میں برہنہ ہو جاؤں، تیسرے روز مجھے پھر طلب کیا گیا، میں نے دربار بھر اٹھا، میں مختلف ڈیوڑھیاں اور مقامات طے کرتا ہوا آگے بڑھا، کچھ لوگ تلواریں لئے کھڑے تھے، کچھ لوگ کوڑے لئے، اگلے دونوں دن کے بہت سے لوگ آج نہیں تھے، جب میں معتمد کے پاس پہنچا تو کہا بیٹھ جاؤ، پھر کہا ان سے مناظرہ کرو اور گفتگو کرو، لوگ مناظرہ کرنے لگے، میں ایک کا جواب دیتا، پھر دوسرے کا جواب دیتا، میری آواز سب پر غالب تھی، جب دیر ہو گئی تو مجھے الگ کر دیا اور ان کے ساتھ تخلیہ میں کچھ بات کہی، پھر ان کو ہٹا دیا، اور مجھے بلایا، پھر کہا احمد! تم پر خدا رحم کرے، میری بات مان لو، میں تم کو اپنے ہاتھ سے رہا کروں گا، میں نے پہلا سا جواب دیا، اس پر اس نے برہنہ ہو کر کہا کہ ان کو پکڑو اور

لے معتمد امام احمد کے معاملہ میں نرم ہو گیا تھا، مگر احمد بن ذواد برابر اس کو گرم کرتا رہا، اور غیرت دلاتا رہا کہ لوگ کہیں گے کہ معتمد اپنے بھائی مامون کے مسلک سے ہٹ گیا۔

کھینچو، اور ان کے ہاتھ اکھیڑ دو، معتمد کرسی پر بیٹھ گیا، اور جلا دوں اور تازیانہ لگانے والوں کو بلایا، جلا دوں سے کہا آگے بڑھو، ایک آدمی آگے بڑھا اور مجھے دو کوڑے لگاتا، معتمد کہتا زور سے کوڑے لگاؤ، پھر وہ ہٹ جاتا، اور دوسرا آتا اور دو کوڑے لگاتا، انیس کوڑوں کے بعد پھر معتمد میرے پاس آیا، اور کہا کیوں احمد! اپنی جان کے پیچھے پڑے ہو، بخدا مجھے تمہارا بہت خیال ہے، ایک شخص عجیب مجھے اپنی تلوار کے دستے سے پھیرتا، اور کہتا کہ تم ان سب پر غالب آنا چاہتے ہو، دوسرا کہتا کہ اللہ کے بندے! خلیفہ تمہارے سر پر کھڑا ہوا ہے، کوئی کہتا کہ امیر المؤمنین آپ روزے سے ہیں، اور آپ دھوپ میں کھڑے ہوئے ہیں، معتمد پھر مجھ سے بات کرتا، اور میں اس کو وہی جواب دیتا، وہ پھر جلا دوں کو حکم دیتا کہ پوری قوت سے کوڑے لگاؤ، امام کہتے ہیں کہ پھر اس اشارہ میں میرے حواس جاتے رہے، جب میں ہوش میں آیا تو دیکھا کہ بیڑیاں کھول دی گئی ہیں، حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ ہم نے تم کو اوندھے منہ گرا دیا، تم کو روندنا، احمد کہتے ہیں کہ مجھ کو کچھ احساس نہیں ہوا!

بے نظیر عزیمت و استقامت

اس کے بعد احمد بن حنبل کو گھر پہنچا دیا گیا، جب سے وہ گرفتار کئے گئے، رہائی کے وقت تک ٹھائیس مہینے ان کو حبس میں گزرے، ان کو ۳۳-۳۴ کوڑے لگائے گئے، ابراہیم ابن مصعب جو پساہیوں میں سے تھے، کہتے ہیں کہ میں نے احمد سے زیادہ جری اور دلیر نہیں دیکھا، ان کی نگاہ میں ہم لوگوں کی حقیقت بالکل کھلی کی سی تھی۔ محمد بن اسمعیل کہتے ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ احمد کو ایسے کوڑے لگائے گئے کہ اگر ایک کوڑا ہاتھی پر پڑتا تو چیخ مار کر بھاگتا، ایک صاحب جو واقعہ کے موجود تھے، بیان کرتے ہیں کہ امام روزے سے تھے، میں نے کہا بھی کہ آپ روزے سے ہیں، اور آپ کو اپنی جان بچانے کے لئے اس عقیدہ کا اقرار کر لینے کی گنجائش

لے تاریخ الاسلام للذہبی، ترجمۃ الام احمد ص ۴۱-۴۹ باختصار و تلخیص۔

اس عظمت و مقبولیت کا نتیجہ یہ تھا کہ ۲۴۱ھ میں جب اس امام سنت نے انتقال کیا تو سارا شہر امنڈ آیا، کسی کے جنازہ پر خلقت کا ایسا ہجوم اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا تھا، نماز جنازہ پڑھنے والوں کی تعداد کا اندازہ یہ ہے کہ آٹھ لاکھ مرد اور ساٹھ ہزار عورتیں تھیں۔



فتنہ اعتزال

اور

امام ابوالحسن اشعری اور ان کے پیرو

معتزلہ کا علمی اقتدار اور اس کے اثرات

معتصم اور واثق کے انتقال پر (جو مذہب اعتزال اور معتزلہ کے سرپرست تھے) معتزلہ کا زور ٹوٹ گیا، واثق کا جانشین خلیفہ متوکل مذہب اعتزال سے بیزار اور معتزلہ کا دشمن تھا، اس نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر معتزلہ کی عظمت و اقتدار کے نشانات مٹائے اور ان کو حکومت سے بالکل بیدخل کر دیا، لیکن علمی حلقوں میں ابھی معتزلہ کا اثر باقی تھا، خلق قرآن کا عقیدہ تو اپنی طاقت کھو چکا تھا، لیکن ان کے دوسرے مباحث اور مسائل ابھی تازہ اور زندہ تھے، معتزلہ نے اپنی ذہانت، علمی قابلیت اور اپنی بعض نمایاں شخصیتوں کی وجہ سے اپنا علمی وقار قائم کر لیا تھا، اور قضا، افتاء و حکومت کے اندر بعض اونچے عہدوں پر فائز تھے، تیسری صدی کے وسط میں ان کا فساد و ردورہ ہو گیا، عام طور پر تسلیم کیا جانے لگا کہ معتزلہ دقیق النظر و وسیع الفکر اور محقق ہوتے ہیں، اور ان کی آراء و تحقیقات عقل سے زیادہ قریب ہوتی ہیں، بہت سے نوجوان طالب علم اور شہرت پسند اعتزال کو فیشن کے طور پر اختیار کرتے، امام احمد کے بعد خرابی میں کوئی طاقت ور علمی اور دینی شخصیت نہیں پیدا ہوئی، محدثین اور ان کے ہم مسلک علمائے علوم عقلیہ اور نئے طریقہ بحث و نظر کی طرف (جس کا معتزلہ اور فلاسفہ کے اثر سے رواج پڑ چلا تھا) توجہ نہیں کی، نتیجہ یہ تھا کہ مباحث کی مجلسوں

اور درس کے حلقوں میں محدثین کی یہ علمی کمزوری اور فلسفہ کے مبادی سے بے خبری محسوس کی جاتی تھی، اس کے مقابلہ میں علمی مباحثوں میں معتزلہ کا پلہ ابھاری رہتا، اور جو لوگ دین کا گہرا علم نہیں رکھتے تھے، اور اس حقیقت سے واقف نہیں تھے کہ سطحی ذہانت معتزلہ کی تائید کرتی ہے، اور پختہ اور گہری ذہانت بالآخر محدثین ہی کے مسلک اور محکمات شریعت کو قبول کرتی ہے، وہ معتزلہ کی حسن تقریر حاضر جوابی اور علمی موثکافی سے متاثر ہوتے تھے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ظاہر شریعت اور مسلک سلف کی علمی بے توقیری، اور اس کی طرف سے بے اعتمادی پیدا ہو رہی تھی، خود محدثین اور ان کے تلامذہ کے گروہ میں بہت سے لوگ احساس کہتری کا شکار تھے، اور معتزلہ کی عقلیت اور فلسفہ سے مرعوب ہو رہے تھے یہ صورت حال دینی وقار اور سنت کے اقتدار کے لئے سخت خطرناک تھی، قرآن مجید کی تفسیر اور عقائد اسلام، ان فلسفی نما مناظرین کے لئے بازیچہ اطفال بنے جا رہے تھے مسلمانوں میں ایک خام عقلیت اور سطحی فلسفیت مقبول ہو رہی تھی، یہ محض ایک ذہنی ورزش تھی، اور اصطلاحات کی معرکہ آرائی اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے اور اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کے لئے نہ تو محدثین و حنابلہ کی دینی غیرت اور جوش کافی تھا، نہ عابدوں و زاہدوں کا زہد و عبادت، اور نہ فقہاء کے فتاویٰ اور جزئیات و مسائل پران کا عبور و استحضار۔

سنت کے وقار کے لئے ایک بلند شخصیت کی ضرورت

اس کے لئے ایک ایسی شخصیت درکار تھی جس کی دماغی صلاحیتیں معتزلہ سے کہیں بلند ہوں، جو عقلیت کے کوچہ سے نہ صرف واقف بلکہ عرصہ تک اس کا رہ نور درہ چکا ہو جس کی بلند شخصیت اور مجتہدانہ دماغ کے سامنے اس زمانہ کی عقلیت و فلسفہ کے علمبردار مبتدی طالب علم معلوم ہوتے ہوں، اور ایسے لپست و جعفر نظر آتے ہوں جیسے کسی دیوقامت انسان کے سامنے پسند قد انسان اور نوعمر بچے، اسلام کو فوری طور پر ایک ایسے امام سنت کی ضرورت تھی، اور شیخ ابوالحسن اشعری کی ذات میں اس کو وہ شخصیت مل گئی۔

امام ابوالحسن اشعری

ابوالحسن علی نام، والد کا نام اسمعیل تھا، مشہور صحابی حضرت ابو موسیٰ اشعری کی اولاد میں تھے، ۲۶۰ھ میں بصرہ میں پیدا ہوئے، ان کی والدہ نے ان کے والد اسمعیل کے انتقال کے بعد ابو علی ابجالی سے نکاح کر لیا تھا، جو اپنے وقت میں معتزلہ کے امام اور مذہب اعتزال کے علمبردار تھے، شیخ ابوالحسن نے ان کی آغوش میں تربیت پائی اور بہت جلد ان کے معتد اور دست راست بن گئے، ابو علی ابجالی اچھے مدرس اور مصنف تھے، مباحثہ پر زیادہ قدرت نہیں رکھتے تھے، ابوالحسن اشعری شروع سے زبان آور حاضر جواب تھے، ابو علی بحث و مناظرہ کے موقع پر انہی کو آگے کر دیتے تھے، بہت جلد وہ سر حلقہ اور مجالس بحث کے صدر نشین بن گئے، تمام ظاہری قیاسات و قرآن بتلاتے تھے، کہ وہ اپنے مربی اور استاد کے جانشین ہوں گے اور مذہب اعتزال کی حمایت و اشاعت میں شاید ان سے بھی آگے بڑھ جائیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے انتظامات عجیب ہیں، اس نے سنت کی حفاظت و نصرت کے لئے اس شخص کو انتخاب کیا، جس نے ساری زندگی مذہب اعتزال کی حمایت و اثبات میں گزاری تھی، اور جس کے لئے اعتزال کی مسند امامت تیار تھی، شیخ ابوالحسن کی طبیعت میں اعتزال کا رد عمل پیدا ہوا، ان کی طبیعت معتزلہ کی تاویلوں اور قیاس آرائیوں سے متنفر ہونے لگی، اور ان کو یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ سب ذہانت کی باتیں ہیں، اور اپنے مذہب کی پچ ہے، حقیقت کچھ اور ہے، اور وہ وہی ہے، جو صحابہ کرام اور سلف کا مسلک ہے، بالآخر عقل کو اسی آستانہ پر جھکنا پڑتا ہے، چالیس برس تک معتزلہ کے مذہب اور اعتقادات کی حمایت اور ان کو ثابت کرنے کے بعد ان کی طبیعت اس سے بالکل پھر گئی اور ان کے ذہن میں اس کے خلاف بغاوت پیدا ہوئی، پندرہ دن وہ گھر سے نہیں نکلے، سو لوہویں دن وہ گھر سے سیدھے جامع مسجد پہنچے، جمعہ کا دن تھا، اور جامع مسجد

بھری ہوئی تھی انھوں نے منبر پر چڑھ کر بلند آواز سے اعلان کیا "جو مجھے جانتا ہے وہ جانتا ہے، جو نہیں جانتا ہے اس کو بتلاتا ہوں کہ میں ابوالحسن اشعری ہوں، میں معتزلی تھا، فلاں فلاں عقیدوں کا قائل تھا، اب تو بے کرتا ہوں اپنے سابق خیالات سے باز آتا ہوں، آج سے میرا کام معتزلہ کی تردید اور ان کی کمزوریوں اور غلطیوں کا اظہار ہے، وہ دن اور ان کی زندگی کا اخیر دن ان کی ذہانت علمی تجربہ قوت گویائی اور استدلال تحریر اعتراض کی تردید اور سلف کے مسلک اور اہل سنت کے عقائد کی تائید اور اثبات میں صرف ہوئی، جو کل تک معتزلہ کی زبان اور ان کا سب سے بڑا وکیل تھا، وہ اہل سنت کا ترجمان اور ان کا سب سے بڑا حامی بن گیا۔"

امام ابوالحسن اشعری کا جذبہ تبلیغ و احقاق حق

وہ اس فرض کو تقرب الی اللہ اور جہاد و دعوت سمجھ کر انجام دیتے تھے، اور خود معتزلہ کی مجلسوں میں جا کر اور ان کے ممتاز لوگوں سے مل کر ان کو مطمئن کرنے اور حق کی تفہیم کرنے کی کوشش کرتے تھے، کسی نے ان کو کہا کہ آپ اہل بدعت سے کیوں ملتے جلتے ہیں، اور خود کیوں ان کے پاس چل کر جاتے ہیں، حالانکہ ان کے مقاطعہ کا حکم ہے؟ انھوں نے جواب میں فرمایا کیا کروں وہ بڑے بڑے عہدوں پر ہیں، ان میں سے کوئی حاکم شہر ہے، کوئی قاضی ہے، وہ اپنے عہدہ اور وجاہت کی وجہ سے میرے پاس آنے سے رہے، اب اگر میں بھی ان کے پاس نہ گیا تو حق کیسے ظاہر ہوگا، اور ان کو کیسے معلوم ہوگا کہ اہل سنت کا بھی کوئی مددگار اور دلائل سے ان کے مذہب کو ثابت کرنے والا ہے؟

ان کی ذہنی صلاحیتیں اور علمی کمالات

امام ابوالحسن کو مناظرہ اور بحث و استدلال کا پہلے سے ملکہ تھا، اور یہ ان کا فطری ذوق اور خداداد

صلاحیت تھی، مذہب حق کی حمایت کے جذبہ اور تائید الہی نے ان کی ان قوتوں اور صلاحیتوں کو اور جلا دی، وہ اپنے زمانہ کی عقلی سطح سے بلند تھے، اور عقلیات و علم و کلام میں بہت دماغ رکھتے تھے، معتزلہ کے سوالات و اعتراضات کا جواب وہ اس آسانی سے دیتے تھے، جیسے کوئی کہتے مشق استاد اور ماہر فن مبتدی طالب علم کے سوالات کا جواب دیتا ہے، اور ان کو خاموش کر دیتا ہے، ان کے ایک شاگرد ابو عبد اللہ بن خنیف اپنی پہلی ملاقات اور ایک مجلس کی کیفیت بیان کرتے ہیں:-

"میں شیراز سے بصرہ آیا، مجھے ابوالحسن اشعری کی زیارت کا شوق تھا، لوگوں نے مجھے ان کا پتہ دیا، میں آیا، تو وہ ایک مجلس مناظرہ میں تھے، وہاں معتزلہ کی ایک جماعت تھی، اور وہ لوگ گفتگو کر رہے تھے، جب وہ خاموش ہوئے، اور انھوں نے اپنی بات پوری کر لی، تو ابوالحسن اشعری نے گفتگو شروع کی، انھوں نے ایک ایک سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم نے یہ کہا تھا، اس کا جواب یہ ہے، تم نے یہ اعتراض کیا تھا، اور اس کا جواب اس طرح ہے، یہاں تک کہ انھوں نے سب کا جواب دے دیا، جب وہ مجلس سے اٹھے تو میں ان کے پیچھے پیچھے چلا، اور ان کو اوپر سے نیچے تک دیکھنے لگا، انھوں نے فرمایا کہ تم کیا دیکھتے ہو؟ میں نے کہا کہ یہ دیکھتا ہوں کہ آپ کی کتنی زبانیں ہیں، کتنے کان اور کتنی آنکھیں ہیں (کہ آپ سب کی سنتے، سب کی سمجھتے، اور سب کا جواب دیتے ہیں) وہ یہ سن کر ہنس پڑے۔"

ایک روایت میں یہ اضافہ ہے کہ میں نے ان سے کہا کہ "آپ کی سب باتیں تو سمجھ میں آئیں، مگر یہ نہ سمجھ سکا کہ آپ ابتداً خاموش کیوں رہتے ہیں، اور معتزلہ کو گفتگو کا موقع کیوں دیتے ہیں، آپ کی شان تو یہ ہے کہ آپ ہی گفتگو کریں، اور اعتراضات کو خود رفع کر دیں، انھوں نے فرمایا کہ میں ان مسائل و اقوال کو اپنی زبان سے ادا کرنا جائز نہیں سمجھتا، البتہ یہ جب کسی کی زبان سے نکل جائیں تو پھر ان کا جواب دینا، اور ان اقوال کی تردید اہل حق کا فرض ہو جاتا ہے۔"

امام ابو الحسن اشعری مجتہد فن اور علم کلام کے بانی تھے، ان کے بعد تکلمین ان کی خداداد ذہانت، ان کے کلام کی گہرائی، ان کی نکتہ رسی، اور ان کی بالغ نظری کے قائل ہیں، قاضی ابوبکر باقلانی سے جس کو ان کے معاصرین نے ان کی فصاحت و حسن تقریر و قوت تحریر کی وجہ سے "لسان الامۃ" کا خطاب دیا تھا، کسی نے کہا کہ آپ کا کلام ابو الحسن اشعری کے کلام سے زیادہ بلند اور واضح معلوم ہوتا ہے، انھوں نے کہا کہ "میری یہی سعادت ہے کہ میں ابو الحسن کے کلام کو سمجھ لوں"۔

علامہ ابواسحق اسفرائینی کا پایہ علم کلام و اصول فقہ میں مسلم ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں شیخ ابو الحسن باہلی (امام ابو الحسن اشعری کے شاگرد) کے سامنے ایسا تھا، جیسے سمندر کے اندر قطرہ اور شیخ ابو الحسن باہلی کہتے تھے کہ میری حیثیت امام ابو الحسن اشعری کے سامنے ایسی تھی، جیسے سمندر کے پہلو میں ایک قطرہ ہے۔

ان کا مسلک اور ان کی خدمات

امام ابو الحسن اشعری نے معتزلہ اور محدثین کے درمیان ایک معتدل و متوسط مسلک اختیار کیا، وہ نہ تو معتزلہ کی طرح عقل کی غیر محدود طاقت اور فرمانروائی کے قائل تھے کہ وہ الہیات کے بارے میں اور ما بعد الطبیعیات میں بھی بے تکلف اپنا عمل کر سکے اور اس کے جزئیات و تفصیلات اور ذات و صفات باری تعالیٰ کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر کر سکے، اور اس کو معیار قرار دیا جاسکے، نہ وہ بعض پر جوش محدثین و مخالف کی طرح دین کی نصرت اور عقائد اسلام کی حفاظت کے لئے عقل کا انکار اور اس کی تحقیر ضروری سمجھتے تھے، اور ان کلامی و اعتقادی مباحث سے جو زمانہ کے اثرات سے شروع ہو گئے تھے، احتیاط و سکوت واجب سمجھتے تھے، وہ معتزلہ اور فلسفہ زدہ علماء سے ان کی اصطلاحات اور علمی زبان میں گفتگو کرتے تھے جس سے مذہب و عقائد اہل سنت کا وقار اور وزن بڑھتا تھا، ان کا اس پر عمل تھا کہ "کلموا الناس علی قدر عقولہم" اس میں

جس طرح عوام کی عقلی سطح کی رعایت ضروری ہے، اسی طرح اہل علم و عقلا کی عقلی سطح کی رعایت بھی ضروری ہے، ابو الحسن اشعری نے پوری قوت اور وضاحت کے ساتھ معتزلہ پر تنقید کی کہ انھوں نے دین کے اخذ و فہم میں اپنی خواہشات کی پیروی اور اپنے فرقہ کے پیشواؤں کی تقلید کی، اور کتاب و سنت کو اس کا ماخذ نہیں بنایا، بلکہ جہاں قرآن کی آیات اور اپنے عقائد میں تعارض دیکھا، بے تکلف اس کی تاویل اور توجیہ کر لی۔ "کتاب الابانۃ عن اصول الدیانۃ" میں جو اعتزال سے علیحدگی کے بعد کی اولین تصنیفات میں سے ہے، تحریر فرماتے ہیں:-

آما بعد اذ ان من الزائغین عن الحق	حمد و صلوة کے بعد معلوم ہو کہ معتزلہ اور قدریہ فرقوں
من المعتزلة و اهل القدر مالت بهم	نے جو حق سے منحرف ہیں اپنی خواہشات کی پیروی میں
اهو انهم الى تقليد رؤسائهم و من مضى	اپنے پیشواؤں اور اپنے فرقہ کے پیش روؤں کی تقلید
من اسلافهم فتا و لو القرآن على ارائهم	کی، اور اپنی آراء کے مطابق کرنے کے لئے قرآن مجید کی
تا و لا للم ينزل الله به سلطانا و لا وضع	ایسی تاویلات کیں جن کی خدانے کوئی سند نہیں
به برهاننا و لا نقلوه عن رسول الله	اتاری نہ ان کی کوئی واضح دلیل ہے، اور نہ وہ
سرب العالمين و لا عن السلف	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف (صحابہ و
المتقدمين	تابعین) سے منقول ہیں۔

پھر اپنے مسلک کی وضاحت کرتے ہوئے صاف لکھتے ہیں:-

قولنا الذي نقول به و ديانتنا التي	ہمارا عقیدہ جس کے ہم قائل ہیں اور ہمارا مسلک
ندین بها القسك بكتاب ربنا عزوجل	جس پر ہم قائم ہیں یہ ہے کہ قرآن مجید اور سنت
و بسنة نبينا عليه السلام و ما روئے	رسول کو مضبوط پکڑا جائے، اور صحابہ و تابعین

عن الصحابة والتابعين وأئمة الهدى
 ونحن بذلك معتمدون وبما كان
 يقول به أبو عبد الله محمد بن محمد
 بن حنبل نصر الله وجهه ورفع درجته
 واجزل مثوبته قائلون ولما خالف
 قوله مخالفون لآلة الامام الفاضل
 والرئيس الكامل الذي ابان الله
 به الحق ورفع به الضلال ووضح
 به المنهاج وقمع به بدع المبتدعين
 وزبح الزائغين وشك الشاكين قومة
 الله عليه من امام مقدم وخليل
 معظم مفخم له
 اور انك حديث سے جو منقول ہے اس کو اختیار
 کیا جائے ہم اسی مسلک پر مضبوطی سے قائم ہیں اور
 امام احمد بن حنبل کے عقائد و مسلک کے (الشران
 کے چہرہ کو تروتازہ رکھے اور ان کے درجات
 بلند فرمائے اور ان کو اجر جزیل عطا فرمائے) قائل
 و معتقد ہیں اور جو ان کے مسلک سے علیحدہ ہے ہم
 اس سے علیحدہ ہیں اس لئے کہ وہ ایسے امام فاضل
 اور پیشوا کے کامل تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے
 ہاتھوں حق کو واضح اور گمراہی کو زائل فرمایا اور
 صراط مستقیم کو روشن کیا اور مبتدعین کی بدعات
 اہل زینح کی کجروی اور اہل تنک کے شکوک کا ازالہ
 کیا اللہ تعالیٰ ایسے بلند پایہ امام اور ایسے مستحق
 محبت و احترام پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے۔

لیکن ان کا اصلی کارنامہ اس مسلک سنت اور عقیدہ سلف کے ساتھ موافقت اور اس کی اجمالی
 تائید نہیں ہے یہ تو محدثین اور عام خیالہ کر رہے تھے ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کتاب و
 سنت کے ان حقائق اور اہل سنت کے ان عقائد کو عقلی دلائل سے ثابت کیا اور معتزلہ اور دوسرے
 فرقوں سے ان کے ایک ایک مسئلہ اور ایک ایک عقیدہ میں انہی کی زبان اور اصطلاحات میں بحث کر کے عقائد
 اہل سنت کی صداقت اور ان کا منقول و معقول کے مطابق ہونا واضح کیا۔

دین کی اہم خدمت کی تکمیل اور وقت کے اس عظیم الشان فریضہ کے ادا کرنے میں وہ معتزلہ اور معتزلہ
 فرقوں کے "معتوب" بنے اور ایسا ہونا بالکل قدرتی تھا، لیکن وہ ان تشدد محدثین اور جامد خیالہ کے اعتراضات
 کا ہدف بھی بن گئے، جن کے نزدیک ان مباحث میں حصہ لینا، اور فلسفہ کی اصطلاحات کا استعمال کرنا اور نقلی مباحث
 و مسائل میں عقلی استدلال سے کام لینا ہی ایک "زینح و ضلال" کی بات تھی۔

امام ابو الحسن اشعری خود اس بات کے قائل و داعی ہونے کے باوجود کہ عقائد کا ماخذ اور الہیات
 و مابعد الطبیعیاتی مسائل کے علم کلام کا سرچشمہ کتاب و سنت اور تعلیمات نبوت ہے، نہ کہ عقل مجرد اور قیاسات
 یا یونانی الہیات اس خیال سے متفق نہیں تھے کہ زمانہ کے اثرات سے یا دوسری قوموں اور فلسفوں کے اختلاط
 سے عقائد کے بارے میں جو مسائل چھڑ گئے ہیں اور ان کی بنیاد پر مستقل گروہ اور فرقے بن گئے ہیں، ان سے صرف
 اسی بنا پر سکوت کیا جائے کہ حدیث میں ان مسائل و مباحث اور ان الفاظ و اصطلاحات کا ذکر نہیں ہے،
 ان کے نزدیک اس سے سنت و شریعت کے وقار کو نقصان پہنچے گا، اور اس کو ان کی شکست اور کمزوری پر
 محمول کیا جائے گا، نیز فرق باطلہ کو جو عقلی استدلال اور فلسفہ کی اصطلاحات سے کام لے رہے ہیں، خود اہل سنت
 کے اندر نفوذ کرنے اور ان کے نوجوان اور ذہین عنصر کو اپنی طرف مائل کرنے کا موقع ملے گا، ان کے نزدیک عقائد
 کا ماخذ یقیناً وحی و نبوت محمدی ہے اور اس کا ذریعہ علم کتاب و سنت اور صحابہ کرام کے اقوال و روایات ہیں،
 اس بارے میں ان کا راستہ معتزلہ و فلاسفہ سے بالکل جدا اور اس کے متوازی ہے، لیکن وہ ان حقائق و عقائد
 کے ثبوت میں تائید کے لئے عقلی استدلال اور رائج الوقت الفاظ و اصطلاحات سے کام لینا نہ صرف جائز
 بلکہ وقت کے تقاضے کی بنا پر ضروری اور افضل الجہاد سمجھتے ہیں، نیز وہ مباحث جن کا تعلق عقلیات و حیات
 سے ہے، اور معتزلہ و فلاسفہ نے ان کو (خوا مخواہ) عقائد کی بحث کا جزو بنا دیا ہے، اور اپنی ذہانت اور زبان
 آوری سے ان کو حق و باطل کا معیار قرار دے دیا ہے، امام ابو الحسن اشعری کے نزدیک ان سے گریز کرنا درست
 نہیں، شریعت کے وکیل و ترجمان کو ان دائروں میں بھی ان کا مقابلہ کرنا ضروری ہے، اور عقلی و حسی حیثیت سے

ان کی نزدیک اور اہل حق کے مذہب کا اثبات فرض ہے، ان کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے سکوت کی وجہ لا علمی نہ تھی، بلکہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں یہ مباحث اور یہ طرز استدلال پیدا نہیں ہوا تھا، لیکن جس طرح زمانہ کے تغیرات اور نئے حالات نے بہت سی فقہی تفصیلات و جزئیات پیدا کر دیں اور نئے مسائل کے استنباط اور اجتہاد پر مجبور کیا، اور زمانہ شناس اور مخلص فقہاء و مجتہدین نے استنباط و اجتہاد سے کام لے کر نئے حوادث و مسائل کا جواب دیا، اور امت کو نئے فتنوں اور اتحاد و بے عملی کے حملوں سے بچایا، اسی طرح محافلین شریعت اور متکلمین اہل سنت کا فرض ہے کہ عقائد و الہیات کے دائرہ میں جو نئے سوالات پیدا ہو رہے ہیں، یا نئے اعتراضات کئے جا رہے ہیں، ان کا جواب دین اور زمانہ کی عقلیت کے مطابق عقائد حقہ کو ثابت و مدلل کریں، امام ابو الحسن اشعری نے اسی مدعا کو ثابت کرنے کے لئے ایک مستقل رسالہ "استحسان المتخصن فی الکلام" تصنیف کیا۔

بہر حال انھوں نے دونوں گروہوں کی رضامندی اور نارضا مندی سے آنکھیں بند کر کے دین کی نصرت و حمایت اور ایمان و عقیدہ کی حفاظت کے لئے جو طرز عمل ضروری سمجھا، بڑی شجاعت اور ذہانت کے ساتھ اس کی طرف توجہ کی، اور تقریراً و تحریراً اس میں مصروف رہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معتزلہ و فلاسفہ کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو تھام لیا، اور بہت سے اکھڑتے ہوئے قدموں کو جہاد دیا، عقائد اہل سنت اور طریقہ سلف کی طرف سے پُر زور و مدلل حمایت و وکالت کرنے کی وجہ سے اہل سنت میں نیا اعتماد اور نئی زندگی پیدا ہوئی، اور وہ احساس کہتری رک گیا، جو گھن کی طرح سواد امت کو کھاتا جا رہا تھا، معتزلہ بھی ان کے پے درپے حملوں سے پیچھے ہٹ گئے، اور ان کو اپنی حفاظت اور اپنے مذہب کے وجود کو قائم رکھنے کی فکر لاحق ہو گئی، ابو بکر بن الصیرفی کہتے ہیں کہ معتزلہ نے بہت سراٹھایا تھا، ان کے مقابلہ کے لئے اللہ تعالیٰ نے امام ابو الحسن اشعری کو پیدا کر دیا، انھوں نے معتزلہ کو اپنی ذہانت و استدلال سے بند کر دیا، ان کے اس کارنامہ کی وجہ سے لوگوں نے ان کو مجددین و محافظین سنت میں شمار کیا ہے، اور ابو بکر اسماعیلی جیسے بعض اہل نظر

نے تجدید دین اور حفاظت شریعت کے سلسلہ میں امام احمد کے بعد ان کا نام لیا ہے۔

ان کی تصنیفات

امام ابو الحسن اشعری نے صرف بحث و مناظرہ اور زبانی تقریر و تفہیم پر اکتفا نہیں کیا بلکہ عقائد باطلہ کی تردید میں جلیل القدر کتابیں تصنیف کی ہیں، انھوں نے اہل سنت کے عقیدہ کے مطابق قرآن مجید کی تفسیر کی جو ذہبی کے بیان کے مطابق تیس اجزاء میں ہے، بعض مؤلفین نے امام ابو الحسن اشعری کی تصنیفات ڈھائی سو سے تین سو تک بیان کی ہیں جن میں سے اکثر معتزلہ کے رد میں ہیں، اور بعض دوسرے مذاہب اویان و فرق کی تردید میں، ان میں ایک کتاب الفصول ہے، جس میں انھوں نے فلاسفہ طباہین (نیچری) دہریہ، ہندوؤں، یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں کا رد کیا ہے، یہ بڑی ضخیم کتاب ہے، اور بارہ کتابوں کا مجموعہ ہے، ابن خلکان نے کتاب "اللمع" "الموجز" "ایضاح البرہان" "التبیین عن اصول الدین" "الشرح والتفصیل فی الرد علی اهل الافک والتضلیل" کا بھی ذکر کیا ہے، علوم عقلیہ و کلام کے علاوہ علوم شریعت میں بھی ان کی متعدد تصنیفات ہیں جن میں سے "کتاب القیاس" کتاب الاجتہاد، "تختیر الواحد"، ابن الراوندی کے انکار تو اتر کے رد میں بھی ایک مستقل تصنیف ہے، انھوں نے خود اپنی کتاب (العمد) میں ان کتابوں کے نام لکھے ہیں جو وہ ۳۲۰ھ تک یعنی وفات سے چار سال پہلے تصنیف کر چکے تھے، یہ گنتی میں ۶۸ کتابیں ہیں جن میں سے متعدد دس دس بارہ بارہ جلدوں میں ہیں، زندگی کے آخری چار سال کے اندر بھی انھوں نے بکثرت تصنیفات کیں، مقالات الاسلامیین (جو ان کی مشہور کتاب ہے) کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ صرف متکلم ہی نہ تھے، بلکہ علم عقائد کے ایک بلند پایہ اور محتاط مورخ بھی تھے، انھوں نے اس کتاب میں معتزلہ اور دوسرے فرقوں کے جو اقوال و مذاہب نقل کئے ہیں، ان میں بڑی احتیاط و دیانت سے کام لیا ہے، اور

خود ان فرقوں کی کتابوں سے ان کی تصدیق ہوتی ہے۔

عبادت و تقویٰ

امام ابوالحسن محض علمی و عقلی آدمی نہ تھے، بلکہ علم و عقل میں درجہ امامت و اجتهاد کو پہنچنے کے ساتھ عبادت و تقویٰ اور اخلاق فاضلہ سے بھی آراستہ تھے، اور یہ ائمہ سلف کی عام خصوصیت ہے، احمد بن علی فقیہ کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوالحسن کی بیس سال خدمت کی، میں نے ان سے زیادہ متورع، محتاط، باجبا دنیاوی معاملات میں شرمیلا اور امور آخرت میں مستعد نہیں دیکھا، تکلم ابوالحسن ہر وی بیان کرتے ہیں کہ امام ابوالحسن نے برسوں عشا کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی ہے، ان کے خادم بندار بن احسین کا بیان ہے کہ امام ابوالحسن صرف ایک جائداد پر گزار کرتے تھے، جو ان کے دادا بلال ابن ابی بردہ بن ابی موسیٰ اشعری نے وقف کی تھی، اور جس کی آمدنی سترہ درہم روزانہ تھی۔

وفات

۳۲۴ھ میں امام ابوالحسن اشعری نے انتقال کیا، اور بغداد محلہ مشرع الزوایا میں مدفون ہوئے، ان کے جنازہ پر اعلان کیا گیا کہ آج ناصر سنت کا انتقال ہو گیا۔

امام ابو منصور ماتریدی

اسی زمانہ میں دنیائے اسلام کے ایک دوسرے سرے ماوراء النہر میں ایک دوسرے عالم اور

لے مشہور مشرق WENSINK نے اپنی کتاب اسلامی عقیدہ MUSLIM CREED میں ۵۵ پر اور پہلے مقالات اسلامیین کے

مقدمہ میں اس کا بڑا اعتراف کیا ہے (الاشعری ابوالحسن) ۳۱۱ تبیین کذب المفتری ص ۱۳۱ ۳۱۵ ایضاً

۵۵ ایضاً ص ۱۳۲ و ابن خلکان ص ۳۶۵ بحوالہ خطیب، ۵۵ ابن خلکان ص ۳۶۵۔

تکلم ابو منصور ماتریدی (م ۳۳۲ھ) نے علم کلام اور عقائد اسلام کی طرف توجہ کی، وہ بڑے متوازن فہم

کے آدمی تھے، معتزلہ سے ہر وقت برسرِ مقابلہ ہونے کی وجہ سے امام ابوالحسن کے علم کلام میں بعض انتہا پسندانہ باتیں آگئی تھیں، اور بعد کے اشاعرہ نے معاملہ کو اور آگے بڑھا دیا، امام ابو منصور نے حشو و زوائد اور ایسے التزامات کو جو معتزلہ کی ضد میں اشعری علم کلام کا جز بن گئے تھے، اور ان کا ثابت کرنا، اور نباہنا مشکل تھا، خارج کر دیا اور اہل سنت کے علم کلام کی مزید تنقیح و تہذیب کی، اور اس کو زیادہ معتدل اور جامع بنا دیا، امام ابو منصور اور ان کے تابعین کا یہ اختلاف جزئی اور محدود تھا، ایسے مسائل جن میں ماتریدی نے اشاعرہ سے اختلاف کیا ہے، ان میں چالیس سے زائد نہیں، اور ان میں بھی اختلاف بیشتر لفظی ہے۔

امام ابو منصور ماتریدی فقہی مسلک کے لحاظ سے حنفی تھے، جس طرح شافعی علماء و متکلمین عقیدہ و اصولاً اشعری ہیں، اسی طرح حنفی علماء و متکلمین بالعموم ماتریدی ہیں، امام ابو منصور بہت بڑے مصنف بھی تھے، معتزلہ روافض اور قرامطہ کی تردید میں ان کی بڑی فاضلانہ تصنیفات ہیں، ان کی کتاب "تأویلات القرآن" اپنے موضوع پر ایک جلیل القدر تصنیف ہے، جس سے ان کی غیر معمولی قابلیت علوم عقلیہ سے واقفیت اور اعلیٰ درجہ کی ذکاوت کا اظہار ہوتا ہے۔

امام ابوالحسن اشعری نے چونکہ معتزلہ اور اعتزال کا براہ راست مقابلہ کیا تھا، اور وہ عالم اسلام کے علمی مرکز (عراق) میں تھے، جہاں معتزلہ کا بڑا زور تھا، اس لئے انہوں نے علمی حلقہ کو زیادہ متاثر کیا، اور علم کلام

لے یہ زمانہ اعتزال کے خلاف رد عمل اور سنی علم کلام و عقائد کی تدوین کا خاص دور تھا، امام ابوالحسن اشعری کے علاوہ تقریباً اسی زمانہ میں مصر میں طحاوی (م ۳۳۱ھ) اور سمرقند میں امام ابو منصور ماتریدی (م ۳۳۳ھ) پیدا ہوئے، اول الذکر نے اپنے دونوں نامور معاصرین کے مقابلہ میں علم کلام میں شہرت حاصل نہیں کی اور امام ابو منصور ماتریدی کا مدرسہ فکر بھی اشعری مدرسہ میں ضم ہو کر رہ گیا۔ ۳۱۵ عقائد معتزلہ کے تعلیقات میں شیخ محمد عبدہ نے ثابت کیا ہے کہ یہ مختلف فیہ مسائل تیس سے

زائد نہیں۔ (ابن تیمیہ از محمد ابو زہرہ) ص ۱۸۵

کی تاریخ میں ان کا نام اور کام زیادہ نمایاں اور پیش پیش ہے۔

اشعری حلقہ کے علماء اور ان کا علمی اثر

امام اشعری کے بعد ان کے سلسلہ اور مکتب خیال میں بڑے جلیل القدر علماء و متکلمین اور اساتذہ پیدا ہوئے جنہوں نے تمام عالم اسلام پر اپنا ذہنی تفوق اور اپنی قابلیت کا سکہ قائم کر دیا، اور ان کی وجہ سے دنیا کے اسلام کی علمی و ذہنی قیادت معتزلہ کے ہاتھ سے نکل کر علماء اہل سنت کے ہاتھ میں آگئی، چوتھی صدی میں قاضی ابوبکر باقلانی (م ۳۲۵ھ) اور شیخ ابواسحق اسفرائینی (م ۳۱۵ھ) بڑے نامور متکلم اور با عظمت عالم تھے، پانچویں صدی میں علامہ ابواسحق شیرازی متوفی ۳۵۵ھ اور امام احرارین ابوالمعالی عبدالملک الجونی (م ۳۶۵ھ) نے اپنے علم و فضل سے دنیا پر بادشاہت کی۔

علامہ ابواسحق شیرازی مدرسہ نظامیہ بغداد کے صدر مدرس تھے، خلیفہ مقتدی باللہ نے ان کو ملک شاہ سلجوقی کے پاس سفیر بنا کر بھیجا، وہ بغداد سے نیشاپور اس شان سے پہنچے کہ جس شہر سے گذرتے شہر کا شہر ان کے استقبال کے لئے نکل آتا جو شوق عقیدت میں یہ لوگ ان کے پاؤں کے نیچے کی مٹی اٹھا لیتے، دوکانڈا اپنا سامان تجارت ان پر نثار کرتے، مٹھائیوں، پھلوں، قیمتی کپڑوں کی بارش کرتے، نیشاپور پہنچے تو پورا شہر استقبال کے لئے امنڈ آیا، امام احرارین ان کا فاشیہ اپنے کاندھوں پر رکھ کر خادم کی طرح ان کے سامنے چلتے تھے اور کہتے تھے، کہ مجھے اس بات پر فخر ہے۔

اپ اسلان سلجوقی کی سلطنت اور نظام الملک کی وزارت میں سب سے بڑی اسلامی مملکت میں امام احرارین کو سب سے بڑا ذہنی اعزاز حاصل تھا، وہ نیشاپور کے خطیب سلطنت کے اسلامی اوقاف کے ناظم و نگران اور مدرسہ نظامیہ کے صدر مدرس تھے، ابن خلکان لکھتے ہیں:-

و بقی علی ذلک قریباً من ثلاثین سنة
تیس سال تک وہ اس طرح رہے کہ علمی و دینی
غیر منہ و لاد فاع مسلمہ المعرب
میدان میں ان کا کوئی ہمسرا اور حریف نہ تھا
و المنبر و الخطابة و التدريس و مجلس
و منبر کی وہ زمینت تھے، خطابت تدریس اور وعظ
التدکیر یوم الجمعة^۱
و تذکیر انھیں کا منصب سمجھا جاتا تھا۔

ان کے اثر و رسوخ اور علوم تربیت کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ ملک شاہ سلجوقی نے عید کے چاند کا اعلان کر دیا، امام احرارین کے نزدیک رویت ثابت نہیں تھی، انھوں نے منادی کروادی کہ ابوالمعالی (امام احرارین کی کنیت) کہتا ہے کہ کل تک ماہ رمضان ہے، جو میرے فتویٰ پر عمل کرنا چاہتا ہے اسے لازم ہے کہ وہ کل بھی روزہ رکھے، ملک شاہ نے باز پرس کی تو فرمایا کہ جو امور فرمان سلطانی پر موقوف ہیں ان کی اطاعت ہم پر فرض ہے، اور جو حکم فتویٰ سے متعلق ہے، وہ بادشاہ کو مجھ سے پوچھنا چاہئے، کیونکہ حکم شریعت علماء کا فتویٰ حکم شہیہ کے برابر ہے، روزہ رکھنا عید کرنا یا امور فتویٰ پر موقوف ہیں، بادشاہ وقت کو ان سے کوئی تعلق نہیں، چنانچہ بادشاہ نے اعلان کر دیا کہ میرا حکم درحقیقت غلط تھا، اور امام احرارین کا حکم صحیح ہے۔

ان کا انتقال ہوا تو نیشاپور کے بازار بند ہو گئے، جامع مسجد کا منبر توڑ دیا گیا، ان کے شاگرد جو چار سو کے قریب تھے، سب نے دوات قلم توڑ ڈالے، لوگ ایک دوسرے سے تعزیت کرتے تھے، سال بھر ان کا غم تازہ رہا۔

نظام الملک طوسی (کے عہد وزارت سے) جو عقیدہ اشعری تھا، اور اپنے وقت کی سب سے بڑی اسلامی (سلجوقی) سلطنت کا نفس ناطقہ تھا، اشعریت کو بڑا فروغ ہوا، اور اس کو ایک طرح کی سرکاری حمایت اور تائید حاصل ہو گئی، بغداد اور نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ کے قیام نے جو اشعری

علماء و اساتذہ کے زیر اہتمام تھے، اشعریت کو علمی وسعت واستحکام بخشا، مدرسہ نظامیہ بغداد عالم اسلام کا سب سے بڑا دارالعلوم تھا جس کو بڑے احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اور اس میں پڑھانا اور پڑھنا علماء و طلبہ کے لئے ایک فخر کی بات تھی، اس کے اثر سے طلبہ اور عوام کا اشعری عقائد و فکر سے متاثر ہونا قدرتی امر ہے۔

— — — — —

علم کلام کا انحطاط فلسفہ اور باطنیت کا فروغ

اور
ایک نئے متکلم کی ضرورت

علم کلام کا انحراف و انحطاط

اس وقت اگرچہ اشعری مکتب خیال کے علماء تمام عالم اسلام، نظام تعلیم اور مذہبی زندگی پر حاوی ہو گئے تھے، لیکن خود ان کے کلام اور ان کے اقتدار کو اندر سے گھن لگ گیا تھا، امام ابو الحسن اشعری کی طاقتور شخصیت و عقلیت اور مجتہدانہ دماغ نے معتزلہ کے سحر کو باطل کر دیا تھا، اور سنت و شریعت کا اقتدار از سر نو قائم کر دیا تھا، اس میں ان کے اصول و قواعد کو تنہا دخل نہ تھا، ان کی بلند ذہنی صلاحیتوں اور علمی مکرر استدلال و اجتہاد کو بھی دخل تھا، یہ وفار ایسی ہی طاقت و شخصیتوں اور اجتہادی قابلیتوں سے قائم رہ سکتا تھا، لیکن ان کے پیروں رفتہ رفتہ لکیر کے فقیر بن گئے، اور علم کلام میں بھی بجائے تجدید و اجتہاد کے نقل و نقل کا سلسلہ شروع ہو گیا، جن لوگوں نے زمانہ کی تبدیلی کا احساس کیا، اور جدت سے کام لیا، انھوں نے فلسفہ کی اصطلاحات اور فلسفیانہ طرز استدلال کو علم کلام میں داخل کر لیا، جو نہ قرآن مجید کے طریق استدلال کی طرح فطری، عام فہم اور دلکش تھا، نہ ان کے دعاوی کے ثبوت کے لئے قطعی دلائل فراہم کرتا تھا، اس میں خود قیل و قال کی بڑی گنجائش تھی، اور ہر وقت اس کا حطرہ تھا کہ اس کے مقدمات کو کمزور اور مشکوک ثابت کر دیا جائے، اس طرح نہ انھوں نے اہل سنت اور سلب سلف کی صحیح نمایندگی کی، نہ خالص فلسفہ کے

لہ جیسا کہ بن تیمیہ نے اپنی بعض تصنیفات خصوصاً ۱۱۵ علی المنطقیین میں کیا۔

حلقوں میں احترام و عظمت حاصل کی۔

فلسفہ کار و اج

دوسری طرف مامون کی قدر دانی اور دلچسپی اور مترجمین کی محنت اور توجہ سے سریانی، یونانی اور فارسی سے یونانی فلسفہ کی بکثرت کتابیں خصوصاً ارسطو کی تصنیفات عربی میں منتقل ہو گئی تھیں اور وہ تیز طبیعت اور خام عقلیت مسلمانوں پر بڑا اثر ڈال رہی تھیں، اس ذخیرہ میں کچھ تو منطق، طبیعیات، عنصریات، ریاضیات کی کتابیں اور علوم تھے، جن کے استعمال کرنے میں کوئی حرج نہ تھا، اور کچھ الہیات اور بالبعد الطبیعیات کے مباحث اور دفترتھے، الہیات کا یہ ذخیرہ درحقیقت یونانیوں کا علم الاصفیاء (دیوالا) تھا، جس کو انھوں نے بڑی چالاکی سے فلسفیانہ زبان اور علمی اصطلاحات میں منتقل کر دیا تھا، یہ مفروضات اور تخیلات کا ایک طلسم تھا، جس کا نہ کوئی ثبوت تھا نہ کسی عالم میں ان کا وجود، اس میں کہیں عقول و افلاک کا شجرہ نسب ہے کہیں ان فرضی اور خیالی چیزوں کے افعال و حرکات کا زائچہ کھینچا گیا ہے، ایک ایسی امت کے لئے جس کو اللہ تعالیٰ نے نبوت کی دولت سے سرفراز فرمایا تھا، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ اپنی ذات و صفات کے صحیح معرفت اور نوع انسان اور کائنات کی ابتدا و انتہا اور آغاز و انجام کا یقینی علم بخشا تھا، اس یونانی افسانہ اور طلسم ہو شربا کی طرف التفات کرنے اور اس کی تفصیلات و جزئیات پر وقت ضائع کرنے کی مطلق ضرورت نہ تھی، مگر جو لوگ یونانیوں کے منطق و طبیعیات اور ریاضیات سے مرعوب تھے، انھوں نے الہیات کے اس دفتر پارینہ کو بھی صحیفہ آسمانی کی طرح قبول کر لیا، اور اس کو اس طرح ہاتھ لیا کہ گویا ان کے پاس پمیر اور آسمانی کتاب کے ذریعہ کوئی علم نہیں پہنچا تھا، اور وہ جاہل قوموں کی طرح الہیات و دینیات میں بھی اسی طرح بے بصارت اور تہی دامن تھے، جیسے ریاضیات و طبیعیات میں۔

فلسفہ یونان کے عرب ناقل و شارح

دوسری طرف فلسفہ یونان کو یعقوب کندی (م ۲۵۵ھ) ابو النصر فارابی (م ۳۳۹ھ) اور شیخ بوعلی ابن سینا (م ۳۲۵ھ) کے سے پر جوش و کھیل حاصل ہوئے کہ خود یونان میں بھی ان کی نظیر ملنی مشکل ہے، انھوں نے ارسطو کو عصمت و تقدیس اور علم و حکمت کے ایسے مقام پر پہنچا دیا جو یونانی الہیات میں شاید مبداء اول (واجب الوجود) کو بھی حاصل نہیں، یہ بھی ایک بدقسمتی تھی کہ مسلمانوں کے حصہ میں یونان کے علمی ذخیرہ میں سے زیادہ تر ارسطو کی تصنیفات و افکار آئے، جو پمیر کی تعلیمات، اور دین کی روح و مزاج سے زیادہ اختلاف اور کم از کم مناسبت رکھتے ہیں، پھر دوسری بدقسمتی یہ تھی کہ فلاسفہ عرب میں سے کوئی بھی ان کے اصل ماخذوں اور ان کی اصل زبانوں سے واقف نہیں تھا، ان کا تمام تر انحصار تراجم پر تھا، اور ان سے خود ان فلاسفہ کا منشاء سمجھنے میں غلطیاں ہوئیں، پھر ان پر ارسطو کا ایسا علمی رعب اور اس کی شخصیت کا ایسا سحر غالب تھا کہ انھوں نے اس کے افکار و آراء پر نقد و جرح کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی، اور عقولات کو بھی منقولات بنا دیا۔

جماعت انخوان الصفا اور اس کے رسائل

چوتھی صدی کے آخر میں تمام عالم اسلام پر فلسفہ یونان کا اثر پڑ رہا تھا، ہر ذہن و متحسس نوجوان اس کو شوق و عظمت کی نگاہ سے دیکھتا تھا، چوتھی صدی کے وسط ہی میں انخوان الصفا کے نام سے فری سین کے طرز کی ایک خفیہ انجمن بغداد میں قائم ہوئی، جس میں فلسفہ یونان کو معیار قرار دے کر دینی مباحث اور عقائد پر گفتگو ہوتی تھی، اور مسائل کو طے کیا جاتا تھا، اس انجمن کا منشور ان کے الفاظ میں یہ تھا:-

ان الشریعة الاسلامیة قد تنجست

اسلامی شریعت جہالتوں اور گمراہیوں کی آمیزش سے

بالمجالات واختلطت بالضلالات
ولا سبيل الى غسلها وتطهيرها الا بالفلسفة
لانها حادية للحكمة الاعتقادية والمصلحة
الاجتهادية وانه متى انتظمت الفلسفة
اليونانية والشريعة المحمدية فقد
حصل الكمال له
گندی ہو گئی ہے اس کو صرف فلسفہ کے ذریعہ
دھویا اور پاک کیا جاسکتا ہے اس لئے کہ فلسفہ
اعتقادی علوم و حکمت اور اجتہادی مصلحتوں
پر حاوی ہے اب صرف فلسفہ یونان اور شریعت
محمدی کے امتزاج سے کمال مطلوب حاصل
ہو سکتا ہے۔

ان کی اپنے رفقا کو خاص ہدایت تھی کہ وہ بچتہ کار اور سن رسیدہ لوگوں پر وقت ضائع کرنے کے بجائے نوجوانوں اور کم عمریوں کی طرف توجہ کریں اور ان کو اپنے خیالات سے متاثر کرنے کی کوشش کریں، اس لئے کہ عمر رسیدہ لوگوں میں بچتگی اور جمود ہوتا ہے، جو نئی چیز کو قبول کرنے سے مانع ہوتا ہے، نوجوان نئی چیز کو قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

انہوں نے اس بحث و نظر کے نتیجے میں ۵۲ رسالے مرتب کئے، جو ان کے فلسفہ کی ناپسندگی کرتے ہیں اور رسائل اخوان الصفا کے نام سے تاریخ و ادب میں مشہور ہیں اور طبیعیات، ریاضیات، عقلیات کے مباحث پر مشتمل ہیں، معتزلہ اور ان کے ہم مذاق لوگوں نے ان رسائل کو ہاتھوں ہاتھ لیا، وہ اپنی مجلسوں میں ان کو پڑھتے تھے اور جہاں جاتے تھے اپنے ساتھ لے جاتے تھے، یہاں تک کہ ایک صدی کے اندر وہ اندلس پہنچ گئے۔

معتزلہ و فلاسفہ کا فرق

معتزلہ سے اگرچہ دانستہ یا نادانستہ شریعت کو نقصان پہنچا تھا، اور انہوں نے عقل کی طاقت کو غیر محدود سمجھ کر ذات و صفات کے نازک و ماوراء عقل (نہ مخالف عقل) مسائل کو با زکیہ اطفال بنا دیا

تھا، لیکن وہ اصلاً مذہبی ذہن کے لوگ تھے، وحی نبوت پر ایمان رکھتے تھے، اور عموماً مقشف، معاصی سے مجتنب و محتاط تھے، عبادت اور دینی دعوت کا ذوق رکھتے تھے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے سختی کے ساتھ پابند تھے، اور یہ سب ان کے اصول و عقائد کا اقتضا تھا، اس لئے اعتزال کے فروغ اور معتزلہ کے اقتدار سے عالم اسلام میں کفر و کجاد و انکار نبوت، انکار محاد اور بے علمی اور تعطل کا رجحان پیدا نہیں ہو سکا، اور مسلمانوں کا مذہبی شعور مجروح یا کمزور نہیں ہونے پایا۔

لیکن فلاسفہ کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا، فلسفہ نبوت کے بالکل متوازی چلتا ہے، اور کہیں جا کر نہیں ملتا، وہ دین کے اصول و کلیات اور اس کے بنیادی عقائد و مسائل سے متصادم ہے، اس لئے جس قدر فلسفہ کی مقبولیت اور عظمت بڑھتی گئی، قدرتی طور پر دین کی وقعت اور انبیاء علیہم السلام کی عظمت کم ہوتی گئی، اور عقائد سے لے کر اخلاق و اعمال تک اس ذہنی تبدیلی سے متاثر ہوئے، مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا، جو دین کی علانیہ تحقیر کرتا، اور اسلام سے فخریہ اپنی بے تعلقی کا اظہار کرتا، جو لوگ اتنی اخلاقی جرات نہیں رکھتے تھے، وہ ظاہری طور پر رسم و رواج کے پابند تھے، لیکن اندر سے وہ کسی معنی میں مسلمان نہیں تھے۔

باطنیت کا فتنہ

فلسفہ کے ساتھ ساتھ اور اس کے اثر سے ایک نیا فتنہ پیدا ہوا، جو اسلام کے حق میں اور نبوت کی تعلیمات کے لئے فلسفہ سے بھی زیادہ خطرناک تھا، یہ باطنیت کا فتنہ ہے، اس کے بانی اور داعی اکثر ان قوموں کے افراد تھے، جو اسلام کے مقابلہ میں اپنی سلطنتیں اور اقتدار کھو چکے تھے، اور ظاہری مقابلہ اور جنگ سے ان کی بازیافت کی، کوئی امید نہ تھی، یا شہوت پرست اور لذت پسند لوگ تھے، اور اسلام ان کی زندگی پر لے آفصل کے لئے ملاحظہ ہو، صحنی الاسلام ج ۳ فصل اول ۱۲۳ ان کے نزدیک کبیرہ کے ارتکاب سے آدمی مخلد فی النار ہوتا ہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر فرض ہے۔

حدود و قیود عائد کرتا تھا، یا شخصی اقتدار اور سرداری کے حریص تھے، ان تمام مختلف مقاصد کے لوگ باطنیت کے نشان کے نیچے جمع ہو گئے، انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اسلام کو جنگی طاقت سے شکست نہیں دے سکتے، نہ مسلمانوں کو کفر و احماد کی کھلی ہوئی دعوت دے سکتے ہیں، اس لئے کہ اس سے ان کے مذہبی احساسات بیدار ہو جائیں گے اور مقابلہ کی قوت ابھر آئے گی، انہوں نے اس کے لئے ایک نیا راستہ اختیار کیا۔

ظاہر و باطن کا مغالطہ

انہوں نے دیکھا کہ شریعت کے اصول و عقائد اور احکام و مسائل کو الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور انسانوں کے سمجھنے اور عمل کرنے کے لئے ایسا ضروری تھا۔

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانٍ قَوْمِهِ
لِيُبَيِّنَ لَهُمْ (سورہ ابراہیم ۴) کی زبان میں تاکہ لوگوں پر مطلب واضح کر دے۔

ان الفاظ کے معنی و مفہوم متعین ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان سے ان کی تشریح اور اپنے عمل سے ان کی تعیین کر دی ہے، یعنی مفہوم امت میں عملی و لفظی طور پر تو اترو تسلسل سے چلے آ رہے ہیں، اور ساری امت ان کو جانتی اور مانتی ہے، نبوت و رسالت، ملائکہ، معاد، جنت، دوزخ، شریعت، فرض و واجب، حلال و حرام، صلاۃ، زکوٰۃ، روزہ، حج، یہ سب وہ الفاظ ہیں جو خاص دینی حقائق کو بیان کرتے ہیں، اور جس طرح یہ دینی حقائق محفوظ چلے آ رہے ہیں، اسی طرح ان دینی حقائق کو ادا کرنے والے یہ الفاظ بھی محفوظ چلے آ رہے ہیں، اور اب دونوں لازم ملزوم بن گئے ہیں۔

جب نبوت و رسالت، یا نبی یا صلوٰۃ یا زکوٰۃ کا لفظ بولا جائے گا تو اس سے اس کی وہی حقیقت سمجھ میں آئے گی، اور وہی عملی شکل سامنے آئے گی، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائی اور صحابہ کرام نے اس کو سمجھا، اس پر عمل کیا، اور اس کو دوسروں تک پہنچایا، اور اسی طرح نسلاً بعد نسل وہ چیز امت تک

منتقل ہوتی رہی، انہوں نے اپنی ذہانت سے اس نکتہ کو سمجھا کہ الفاظ و معانی کا یہ رشتہ امت کی پوری زندگی اور اسلام کے فکری و عملی نظام کی بنیاد ہے، اور اسی سے اس کی وحدت اور اپنے سرچشمہ اور اپنے ماضی سے اس کا ربط قائم ہے، اگر یہ رشتہ ٹوٹ جائے اور دینی الفاظ و اصطلاحات کے مفہوم و معانی متعین نہ رہیں، یا مشکوک ہو جائیں تو یہ امت ہر دعوت اور ہر فلسفہ کا شکار ہو سکتی ہے، اور اس کے سنگین فلاح میں سیکڑوں چور دروازے اور اس کی مضبوط دیواروں میں ہزاروں ٹسکاف پیدا ہو سکتے ہیں۔

اس نکتہ کو پا جانے کے بعد انہوں نے اپنا سارا زور اس تبلیغ پر صرف کیا کہ ہر لفظ کے ایک ظاہری معنی ہونے ہیں، اور ایک حقیقی اور باطنی، اسی طرح قرآن و حدیث کے کچھ ظاہر ہیں، اور کچھ حقائق، ان حقائق سے ان ظواہر کو وہی نسبت ہے، جو گودے اور مغز سے چھلکے اور پوست کو ہے، جہلا صرف ان ظواہر کو جانتے ہیں، اور ان کے ہاتھ میں پوست ہی پوست ہے، عقلاً و حقائق کے عالم ہیں، اور ان کے حصہ میں مغز آیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ یہ الفاظ دراصل حقائق کے رموز و اشارات ہیں، ان سے وہ مراد نہیں جو عوام سمجھتے اور عمل کرتے ہیں، ان سے مراد کچھ اور چیزیں ہیں، جن کا علم صرف اہل اسرار کو ہے، اور انہیں سے دوسروں کو حاصل ہو سکتا ہے، جو ان حقائق تک نہیں پہنچا، اور ظواہر میں گرفتار ہے، وہ ظاہری بیڑیوں اور شریعت کی پابندیوں میں جکڑا ہوا ہے، اور نہایت نیچی سطح پر ہے، جو حقائق و رموز کی بلند سطح تک پہنچ جاتا ہے، اس کی گردن سے یہ طوق و سلاسل اتر جاتے ہیں، اور وہ شریعت کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے، یہی اس آیت کا مفہوم ہے:

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي

لَهُ تَعْطِيلُ شَرِيعَتِ كَمَا مَسْتَقِلَّ عَقِيدَهُ بَعْدَ مَا جَانَتْهَا، ایک باطنی امام و داعی "میدنا" ادریس لکھتے ہیں:-

لَقَدْ آتَى اللَّهُ مُحَمَّدَ بْنَ الْمُحَلَّبِ وَهُوَ نَبِيٌّ نَاطِقٌ بِسْمِ اللَّهِ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (محمد بن اسماعیل کو اللہ تعالیٰ نے نبی ناطق کی حیثیت سے مبعوث فرمایا، اور انہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو نسوح کر دیا، (عاصمۃ نفوس المہتدین و قاصمۃ ظہور المعتدین لسیدنا ادریس) معزالدین الشرفاطمی سے بھی ایسے ہی اقوال منقول ہیں۔

كَانَتْ عَلَيْهِمْ (اعراف ۱۵۷) ہیں ان پھندوں نکالے گا جن میں گرفتار تھے۔

جب یہ اصول تسلیم کر لیا گیا، اور حقائق و ظواہر کے اس فلسفہ کو قبول کر لیا گیا تو انھوں نے نبیؐ کو نبوتِ ملائکہ، آخرت اور اصطلاحاتِ شرعیہ کی من مانی تشریح کرنی شروع کر دی جس کے بعض نادرمخونے یہ ہیں:

نبی اس ذات کا نام ہے جس پر قوتِ قدسیہ صافیہ کا فیضان ہو، جبریل کسی ہستی کا نام نہیں، صرف فیضان

کا نام ہے، معاد سے مراد ہر چیز کا اپنی حقیقت کی طرف واپس آجانا ہے، جنابت سے مراد افتائے راز ہے،

غسل سے مراد تجدیدِ عہدِ زلمے سے مراد علمِ باطن کے نطفہ کو کسی ایسی ہستی کی طرف منتقل کرنا جو عہد میں شریک

نہ ہو، طہارت سے مراد مذہبِ باطنیہ کے علاوہ ہر مذہب سے برأت، تیمم سے مراد ماذون (اجازت یافتہ)

سے علم کا حصول، صلوة سے مراد امام وقت کی طرف دعوت، زکوٰۃ سے مراد اہل استعداد و صفایں

اشاعتِ علم، صیام (روزہ) سے مراد افتائے راز سے پرہیز و احتیاط، حج سے مراد اس علم کی طلب جو

عقل کا قبلہ اور منزل مقصود ہے، جنت، علمِ باطن، جہنم، علمِ ظاہر، کعبہ، خود نبی کی ذات ہے، بابِ کعبہ سے

مراد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات، قرآن مجید میں طوفانِ نوح سے مراد علم کا طوفان ہے جس میں

اہل شہادت غرق کر دیئے گئے، آتشِ نمرود سے مراد نمرود کا غصہ ہے نہ کہ حقیقی آگ، ذبح سے مراد جس کا

ابراہیم کو حکم دیا گیا تھا، بیٹے سے عہد لینا، یا جوج یا جوج سے مراد اہل ظاہر ہیں، عصا سے موسیٰ سے مراد

ان کی دلیل اور حجت ہے، وغیرہ وغیرہ۔

نبوتِ محمدی کے خلاف بغاوت

الفاظِ شرعی کے متواتر و متواتر معنی و مفہوم کا انکار اور قرآن و حدیث کے ظاہر و باطن اور مغز و پوست کی تقسیم ایسا کامیاب حربہ تھا جس سے اسلام کے نظامِ اعتقاد و نظامِ فکر کے خلاف سازش

لے قواعد عقائد آل محمد (باطنیہ) تالیف محمد بن حسن الدلمی بیانی زمانہ تالیف ۱۳۵۷ھ ص ۸-۱۶

کرنے والوں نے ہر زمانہ میں کام لیا، اسلام کی پوری عمارت کو اس طرح آسانی سے ڈالنا میٹ کیا جاسکتا تھا

اور اسلام کے ظاہری خول کے اندر ریاست اندرون ریاست قائم کی جاسکتی تھی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ بعد کی

صدیوں میں جن فرقوں نے اور منافقین کی جس جماعت نے نبوتِ محمدی کے خلاف بغاوت کرنی چاہی اس نے

باطنیت کے اسی حربہ سے کام لیا، اور اس معنوی تو اترو توارث کا انکار کر کے پورے نظامِ اسلامی کو مشکوک و

مجروح بنا دیا، اور اپنے لئے دینی سیادت بلکہ نبی نبوت کا دروازہ کھول لیا، ایران کی بہائیت اور ہندوستان

کی قادیانیت اس کی بہترین مثالیں ہیں۔

لے قادیانیوں نے بھی باطنیوں کی طرح الفاظ کو قائم رکھتے ہوئے ان کا نیا مفہوم بیان کیا ہے، اور معنوی توارث و تواتر کا عملاً انکار

کیا ہے، ختم نبوت، مسیح و نزول مسیح، معجزات، دجال وغیرہ سب الفاظ وہی ہیں مگر ان کی تشریح و تطبیق میں باطنیوں کی طرح اختراع

و ایجاد سے کام لیا ہے، مرزا صاحب کی کتابیں اور مولوی محمد علی کی تفسیر اس کی مثالوں سے بھری ہوئی ہیں۔

بہائیوں نے بالکل نئی شریعت وضع کی ہے جس کے بعض دفعات یہ ہیں روزہ سال میں ایک ہی ہینہ کا ہے مگر ہینہ ۱۰ دن

کا ہے، روزہ کی ابتدا صبح صادق کے بجائے طلوع آفتاب سے ہے، سال ۳۲ سال تک انسان احکامِ شرعی کا مکلف رہتا ہے، پھر

پابندیاں اٹھ جاتی ہیں، وضو فرض نہیں ہے، مستحب عورتوں پر نظر جائز ہے کوئی پردہ نہیں جس گھر میں بانی مذہب (باب) کی ولادت

ہوئی ہے، اس کی زیارت واجب ہے، جماعت کی نماز صرف جنازہ میں مشروع ہے، ایمان کے بعد کوئی چیز نہیں بلکہ محض۔

مذہب بانی کی پیروی سے آدمی ظاہر ہو جاتا ہے، پھر کبھی گندہ نہیں ہوتا، بلکہ جس چیز کو اس کا ہاتھ لگ جاتا ہے وہ بھی ظاہر

ہو جاتی ہے، پانی ہمیشہ ظاہر و مظهر رہتا ہے، بہائیوں کا قانون میراث علیحدہ ہے (حاضر العالم الاسلامی بکوالفرنج

انسائیکلو پیڈیا آف اسلام) موسیو ہوارٹ نے اپنے مقالہ "بابیت" میں صحیح لکھا ہے کہ باب نے اسلام میں اصلاح کے

نام سے ایک نئے دین کی تشکیل کی ہے جس کے عقائد و اصول علیحدہ ہیں اور اس کو نئی سوسائٹی اور ہیئت اجتماعیہ کے منشور

کے طور پر پیش کیا ہے، یہی صورت حال قادیانیت کی ہے، دونوں جگہ ایک نئی نبوت اور ایک نئے نظامِ دینی کی تاسیس ہے،

درحقیقت یہ سب باطنیت کی صدائے بازگشت ہے۔

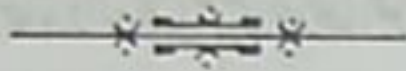
ظاہر ہے کہ ان "نکتہ آفرینیوں" کو (جن کی چند مثالیں اوپر پیش کی گئی ہیں) کوئی سلیم الطبع آدمی قبول نہیں کر سکتا تھا، لیکن علم کلام کی معرکہ آرائیوں نے عالم اسلام میں ایسا ذہنی انتشار پیدا کر دیا تھا، اور فلسفہ کے اثر سے لوگوں میں پیچیدہ اور غامض مضامین کا (خواہ اس کے اندر کوئی مغز نہ ہو) ایسا مذاق پیدا ہو گیا تھا کہ ایک طبقہ پر باطنیوں کا جادو چل گیا، جنہوں نے قدیم علم ہیئت، علم طبیعیات اور یونانی الہیات کے مسائل اور یونانی اصطلاحات عقل اول وغیرہ کو آزادی سے استعمال کیا تھا، اور مختلف اثرات اور مختلف اعراض سے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے، کچھ جذبہ انتقام میں کچھ اسرار و رموز کے شوق میں کچھ غلط قسم کی ظاہریت اور تقشف کے رد عمل میں کچھ بوالہوسی اور نفس پرستی کی آزادی کے لالچ میں کچھ اہل بیت کے نام سے اس طرح باطنیوں نے ایسی خفیہ تنظیم قائم کر لی، جس سے طاقتور اسلامی حکومتیں عرصہ تک پریشان رہیں، عالم اسلام کی بعض لائق ترین اور مفید ترین ہستیاں (نظام الملک طوسی و فخر الملک وغیرہ) ان کا شکار ہوئیں، عرصہ تک کسی بڑے عالم اور مسلمان بادشاہ یا وزیر کو اس کا اطمینان نہیں تھا کہ صبح وہ صحیح سلامت اٹھے گا، ابن جوزی نے لکھا ہے کہ اصفہان میں اگر کوئی شخص عصر تک اپنے گھر واپس نہ جاتا تو سمجھ لیا جاتا کہ وہ کسی باطنی کا شکار ہو گیا، اس بدامنی کے علاوہ انھوں نے ذہن و ادب اور علم کو بھی متاثر کرنا شروع کیا، اور دین کے اصول و نصوص اور قطعیات کی تاویل و تحریف اور عام احاد کا دروازہ کھل گیا۔

ایک نئی شخصیت کی ضرورت

فلسفہ اور باطنیت کے ان اسلام کش اثرات کے لئے ایک ایسی شخصیت کی ضرورت تھی، جس کو علوم عقلیہ و نقلیہ دونوں میں پوری بصیرت اور دہندگاہ حاصل ہو، اور وہ تمام علوم میں مجتہدانہ نظر اور اپنا خود مقام رکھتا ہو، جو اپنے ذہن خداداد، جودت طبع اور دقت نظر میں فلاسفہ یونان اور بہت سے

اہل باطنیوں کے ہاتھ سے شہید ہونے والوں کی مفصل فہرست کے لئے ملاحظہ ہو، نظام الملک طوسی ص ۵۶۲، ۵۶۳

قدیم ائمہ فکر سے کم نہ ہو، جو بہت سے علوم کو نئے طریقہ سے مدون کرنے کی قابلیت رکھتا ہو، جو فوراً علم اور وسعت نظر کے ساتھ دولت یقین سے بھی مالا مال ہو، اور اس نے اپنے ذاتی تفکر، تلاش و تحقیق اور باطنیت و عبادت سے دین کے ان ابدی حقائق پر نیا ایمان حاصل کیا ہو، اور وہ نئے اعتماد، تازہ یقین کے ساتھ علی و جبر البصیرۃ دین کی پیروی اور رسول کے اقتداء کی طرف دعوت دیتا ہو، نیز عالم اسلامی اور علمی دنیا میں اپنے علم و یقین اور فکر و نظر سے ایک نئی روح اور زندگی کی ایک نئی لہر پیدا کر دے، پانچویں صدی کے عین وسط میں اسلام کو ایسی شخصیت عطا ہوئی، جس کی عالم اسلام کو سخت ضرورت تھی، یہ شخصیت امام غزالی کی تھی۔



امام غزالیؒ

تعلیم اور علمی عروج

امام غزالیؒ کا نام محمد کنیت ابو حامد والد کا نام بھی محمد تھا، طوس کے ضلع میں ۴۵۰ھ میں طاہران میں پیدا ہوئے، والد کی وصیت کے مطابق جو ایک مخلص علم دوست اور غریب مسلمان تھے، ان کے ایک صوفی دوست نے تعلیم کا انتظام کرنے سے معذرت کی، اور کسی مدرسہ میں داخل ہو جانے کا مشورہ دیا، چنانچہ وہ ایک مدرسہ میں داخل ہو کر تعلیم میں مشغول ہو گئے۔

امام غزالیؒ نے اپنے وطن میں شیخ احمد الراذکانی سے فقہ شافعی کی تعلیم حاصل کی پھر حرجان میں امام ابو نصر اسماعیلی سے پڑھا، اس کے بعد نیشاپور جا کر امام احرارین کے حلقہٴ درس میں شامل ہوئے اور تھوڑی ہی مدت میں اپنے رفقاء میں جو ۴۰ کی تعداد میں تھے، ممتاز ہو گئے، اور اپنے نامور استاد کے نائب (معیذ) بن گئے، امام احرارین ان کی تعریف میں فرماتے تھے کہ غزالیؒ بحرِ خوار ہے، امام احرارین کے انتقال کے بعد نیشاپور سے نکلے، اس وقت ان کی عمر ۲۸ سال کی تھی، لیکن بڑے بڑے کبیر السن علماء سے وہ زیادہ ممتاز اور باکمال سمجھے جاتے تھے۔

درس و تدریس سے فارغ ہونے کے بعد امام غزالیؒ نظام الملک کے دربار میں پہنچے نظام الملک نے ان کی شہرت اور ممتاز قابلیت کی بنا پر بڑے اعزاز و اکرام سے دربار میں ان کو لیا، یہاں اہل کمال کا مجمع تھا، علمی مباحثے اور دینی مناظرے درباروں اور مجلسوں میں یہاں تک کہ تقریبات شادی و عہد کی ایک ضروری عنصر تھے۔

امام غزالیؒ ان مباحث میں سب پر غالب رہتے تھے، ان کی نمایاں قابلیت دیکھ کر نظام الملک نے ان کو مدرسہ نظامیہ کی صدارت کے لئے انتخاب کیا جو اس وقت ایک عالم کے لئے سب سے بڑا اعزاز اور منہا ترقی تھا، اس وقت ان کی عمر ۳۴ سال سے زیادہ نہ تھی، ۴۸۵ھ میں وہ بڑی شان و شوکت کے ساتھ بغداد میں داخل ہوئے اور نظامیہ میں درس شروع کیا، تھوڑے ہی دن میں ان کے درس حسن تقریر اور تبحر علمی کی بغداد میں دھوم مچ گئی، طلبہ و علماء نے استفادہ کے لئے ہر طرف سے ہجوم کیا، ان کی مجلس درس مرجع خلافت بن گئی تین تین سو منتہی طالب علم اور سو سو امراء اور وسائر اس میں شرکت کرتے تھے، رفتہ رفتہ انہوں نے اپنی عالی داعی، علمی فضیلت اور طاقتور شخصیت سے بغداد میں ایسا اثر اور رسوخ پیدا کر لیا کہ ارکان سلطنت کے ہمسر بن گئے، اور بقول ایک معاصر (شیخ عبدالغافر فارسی) کے ان کے جاہ و جلال کے سامنے امراء اور وزراء اور خود بارگاہ خلافت کی شان و شوکت بھی ماند پڑ گئی، یہاں تک کہ ۴۸۵ھ میں ان کو خلیفہ عباسی (مقتدی باللہ) نے ملک شاہ سلجوقی کی بیگم ترکان خاتون کے پاس (جو اس وقت سلطنت کی مالک تھی) اپنا سفیر بنا کر بھیجا، خلیفہ مستظہر جو مقتدی باللہ کا جانشین تھا، امام سے خاص ربط و ارادت رکھتا تھا، اسی کی فرمائش سے امام غزالیؒ نے باطنیہ کے رد میں کتاب لکھی، اور اس کا نام خلیفہ کی نسبت سے مستظہر ہی رکھا۔

گیارہ سال کی رہ نوردی اور اس کے تجربات

اس انتہائی عروج کا جو کسی علمی و دینی شخصیت کو حاصل ہو سکتا ہے، تقاضا تھا کہ امام غزالیؒ اس پر قیامت کریں اور اسی کے دائرہ کے اندر پوری زندگی گزار دیں، جیسا کہ ان کے بعض اساتذہ نے کیا اور لوگ عموماً کیا کرتے ہیں، مگر ان کی بے چین طبیعت اور بلند حوصلہ طائر بہمت اس بلندی پر راضی نہ تھا، اور دراصل اسی بلندی ہی نے ان کو امام اور حجت الاسلام بنا دیا، دنیا میں جاہ و اعزاز کی قربانی اور مقصد کی دھن اور سچی لگن

کی ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں، امام غزالی نے خود ان حالات و اسباب کو بیان کیا ہے جنہوں نے ان کو ایسا قدم اٹھانے پر آمادہ کیا اور ان کو تعلیم و تدریس کے کام کا نہیں رکھا یہاں تک کہ وہ اقلیم علم کے بادشاہی چھوڑ کر یقینی علم اور دولت باطن کی تلاش میں نکل گئے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر پلٹے "المنقذ من الضلال" میں وہ لکھتے ہیں:-

"عنفوان شباب سے میری طبیعت تحقیقات و معلومات کی طرف مائل تھی، ہر فرقہ اور جماعت سے ملتا، اور اس کے عقائد و خیالات معلوم کرتا رفتہ رفتہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقلید کی بندش ٹوٹ گئی، جو عقائد بچپن سے ذہن میں جمے ہوئے تھے، وہ متزلزل ہو گئے، میں نے خیال کیا کہ عیسائی اور یہودی کچے بھی اپنے عقائد پر پرورش پاتے ہیں، حقیقی علم تو یہ ہے کہ کسی قسم کے شبہ کا احتمال تک نہ رہ جائے، مثلاً مجھے اس بات کا یقین ہے کہ دس کا عدد تین سے زائد ہوتا ہے، اگر کوئی شخص کہے نہیں بلکہ تین زائد ہے اور میرے دعویٰ کی دلیل ہے کہ لاشی کو سانپ بنا سکتا ہوں اور وہ بنا کر دکھا بھی دے تب بھی مجھے اپنے علم میں کوئی شک نہیں ہوگا، مجھے اس پر تعجب ضرور ہوگا لیکن پھر بھی میرا یقین باقی رہے گا کہ دس تین سے زائد ہے، میں نے غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ اس قسم کا یقینی علم صرف حیات اور بدہیات کے دائرہ میں ہے، لیکن جب زیادہ کدو کاوش سے کام لیا تو معلوم ہوا کہ اس میں بھی شک کی گنجائش ہے، میں نے دیکھا کہ جو اس میں سب سے زیادہ قوی حائر بصارت کا ہے، لیکن اس میں غلطی ہوتی ہے، میرا یہ شک یہاں تک بڑھا کہ مجھے محسوسات کے یقینی ہونے کا اطمینان نہیں رہا، پھر میں نے عقلیات پر غور کیا تو وہ مجھے حیات سے بھی زیادہ مشکوک و کمزور نظر آئے، تقریباً دو مہینہ تک میری یہ ارنیابی کیفیت رہی اور مجھ پر سفسطائیت کا غلبہ رہا، پھر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس بیماری سے شفا دی اور طبیعت صحت و اعتدال پر آگئی، اور بدہیات عقلی پر اطمینان پیدا ہو گیا، لیکن یہی استدلال اور ترتیب کی بنا پر نہ تھا، بلکہ ایک جلدانی اور وہی بات تھی، اس مرض سے شفا پانے کے بعد اب میرے سامنے چار گروہ تھے، جو طالب حق معلوم ہوتے تھے، منکملین جو اہل عقل و نظر ہونے

کے دعویٰ تھے باطنیہ جن کا دعویٰ تھا کہ ان کے پاس خاص تعلیمات و اسرار ہیں اور انہوں نے براہ راست امام معصوم سے علم حقائق حاصل کیا ہے، فلاسفہ جن کا کہنا ہے کہ وہی اہل منطق و اہل استدلال ہیں، صوفیہ جو اپنے کو صاحب کشف و شہود کہتے ہیں، میں نے ہر ایک گروہ کی کتابوں اور خیالات کا مطالعہ کیا تو کسی سے بھی مطمئن نہیں ہوا، علم کلام کے متعلق اس فن کے محققین کی تصنیفات پڑھیں اور خود بھی اس موضوع پر تصنیفات کیں، میں نے دیکھا کہ اگرچہ یہ فن اپنے مقصود کو پورا کرتا ہے، لیکن میری تسلی کے لئے وہ کافی نہیں، کیونکہ اس میں ایسے مقدمات پر بنا رکھی گئی ہے، جو فریق مقابل کے پیش کئے ہوئے ہیں، اور منکملین نے ان کو محض تقلیداً تسلیم کر لیا ہے، یا اجماع یا قرآن و حدیث کے نصوص ہیں، اور یہ چیزیں اس شخص کے مقابلہ میں کچھ زیادہ کارآمد نہیں، جو بدہیات کے سوا کچھ اور تسلیم نہ کرتا ہو، فلسفہ کے متعلق رائے قائم کرنے کے لئے پہلے میں نے اس کا تحقیقی مطالعہ ضروری سمجھا، اگرچہ مجھے تصنیف و تدریس کے مشاغل سے بہت کم فرصت ملتی تھی، میرے حلقہ درس میں بغداد میں تین تین سو طالب علم ہوتے تھے، پھر بھی میں نے اس کے لئے وقت نکالا، اور دو سال کے اندر اندر میں نے ان کے تمام علوم کا مطالعہ کر ڈالا، تقریباً ایک سال تک ان پر غور و فکر کرتا رہا، میں نے دیکھا کہ ان کے علوم چھ قسم کے ہیں، ریاضیات، منطقیات، طبیعیات، ریاضیات، اخلاقیات اور الہیات، ابتدائی پانچ علوم کا مذہب سے نسیا و اثبات کا تعلق نہیں، اور مذہب کے اثبات کے لئے ان کے انکار کی ضرورت ہے، طبیعیات میں ان کے بعض نظریات کا کہیں کہیں مذہب سے تضاد ہوتا ہے، مگر وہ چند چیزیں ہیں، اس سلسلہ میں اصولاً یہ عقیدہ رکھنا چاہئے کہ طبیعت اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، وہ خود مختار نہیں، البتہ جو لوگ ان علوم و مضامین میں فلاسفہ کی ذہانت اور باریک بینی دیکھتے ہیں وہ عمومی طور پر ان سے مرعوب ہو جاتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ تمام علوم میں ان کا یہی حال ہوگا، حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص ایک فن میں ماہر ہو، وہ ہر فن میں ماہر ہو، پھر جب ان کی بے دینی اور ان کے انکار کو دیکھتے ہیں تو محض تقلیداً وہ بھی دین کا انکار و استخفاف کرنے لگتے ہیں،

دوسری طرف اسلام کے بعض نادان دوست فلاسفہ کے ہر نظریہ اور ہر دعویٰ کی تردید اپنا فرض اور اسلام کی خدمت سمجھتے ہیں حتیٰ کہ طبیعیات کے سلسلہ میں ان کی تمام تحقیقات کا بھی انکار کرنے لگتے ہیں، اس کا ایک مضرت اثر یہ ہوتا ہے کہ جو لوگ ان علمی نظریات و تحقیقات کی صداقت کے قائل ہیں اور ان کے نزدیک وہ چیزیں پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہیں ان کا اعتقاد خود اسلام کے بارے میں متزلزل ہو جاتا ہے اور بجائے فلسفہ کے انکار کرنے کے وہ اسلام سے بدگمان ہو جاتے ہیں، لے دے کہ جو فن مذہب کے متصادم ہوتا ہے وہ الہیات ہے، اسی میں انھوں نے زیادہ تر ٹھوکریں کھالی ہیں، درحقیقت انھوں نے منطق میں جو شرطیں رکھی تھیں، ان کو وہ الہیات میں نباہ نہیں سکے، اسی لئے اس سخت اختلاف پایا جاتا ہے، غرض میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ فلسفہ سے میری تشفی نہیں ہوگی، اور عقل تنہا تمام مقاصد کا احاطہ نہیں کر سکتی، اور نہ تمام مشکلات کی نقاب کشائی کر سکتی ہے، رہے باطنیہ تو مجھے اپنی کتاب 'مستظہری' کی تالیف کے سلسلہ میں ان کے مذہب کے مطالعہ کرنے کا اچھی طرح موقع ملا، میں نے دیکھا کہ ان کے عقائد کا دار و مدار امام وقت کی تعلیم پر ہے، لیکن امام وقت کا وجود اور اس کی صداقت خود محتاج دلیل ہے، اور یہ دونوں حد درجہ مشتبہ ہیں، اب صرف تصوف باقی رہ گیا میں ہمہ تن تصوف کی طرف متوجہ ہوا، تصوف علمی بھی ہے علمی بھی ہے میرے لئے علم کا معاملہ آسان تھا، میں نے ابوطالب کی قوت القلوب اور عارف محاسبی کی تصنیفات اور حضرت جنید شبلی و بایزید بسطامی وغیرہ کے ملفوظات پڑھے اور علم کے راستے سے جو کچھ حاصل کیا جاتا تھا، وہ میں نے حاصل کر لیا، لیکن مجھے معلوم ہوا کہ اصلی خفایا تک تعلیم کے ذریعہ سے نہیں، بلکہ ذوق و حال اور حالات کی تبدیلی سے پہنچا جاسکتا ہے، جو علوم میرا سرمایہ تھے خواہ وہ شرعی ہوں یا عقلی، ان سے مجھے وجود باری، نبوت اور معاد پر ایمان راسخ حاصل ہو چکا تھا، لیکن یہ کبھی کسی دلیل محض سے نہیں، بلکہ ان اسباب و قرائن اور تجربوں کی بنا پر جن کی تفصیل مشکل ہے، مجھ پر یہ اچھی طرح سے واضح ہو چکا تھا کہ سعادت اخروی کی صورت

صرف یہ ہے کہ نفی اختیار کیا جائے اور نفس کو اس کی خواہشات سے روکا جائے اور اس کی تدریس ہے کہ دار فانی سے بے رغبتی، آخرت کی طرف میلان و کشش اور پوری یکسوئی کے ساتھ توجہ الی اللہ کے ذریعہ قلب کا علاقہ دنیا سے ٹوٹ جائے، لیکن یہ جاہ و مال سے اعراض اور موانع و علاقہ سے فرار کے بغیر ممکن نہیں، میں نے اپنے حالات پر غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں سرتاپا علانیہ دنیوی میں غرق ہوں، میرا سبب افضل عمل تدریس و تعلیم کا معلوم ہوتا تھا، لیکن ٹوٹنے سے معلوم ہوا کہ میری تمام تر توجہ ان علوم پر ہے، ہونہ تو اہم ہیں اور نہ آخرت کے سلسلہ میں کچھ فائدہ پہنچانے والے ہیں، میں نے اپنی تدریس کی نیت کو دیکھا تو وہ بھی خالص لوجہ اللہ تھی، بلکہ اس کا باعث و محرک بھی محض طلب جاہ و حصول شہرت تھا، تب مجھے یقین ہو گیا کہ میں ہلاکت کے غار کے کنارے کھڑا ہوا ہوں، اگر میں نے اصلاح حال کی کوشش نہ کی تو میرے لئے سخت خطرہ ہے، میں ایک عرصہ تک اس سب کو چھوڑ دینے اور بغداد سے نکل جانے کا ارادہ کرتا رہا، لیکن اس کا فیصلہ نہ کر سکا، چھ مہینے اسی کشمکش میں گزر گئے کہ کبھی تو دنیاوی خواہشات کشش کرتیں اور کبھی ایمان کا منادی پکارتا، کہ کوچ قریب ہے، تھوڑی عمر باقی ہے، طویل سفر پیش ہے، اور یہ سب علم و عمل محض ریا و تخیلات ہیں، کبھی نفس کہتا کہ یہ عارضی حالت ہے، اللہ نے جو کچھ جاہ و عزت دے رکھی ہے، چھوڑنے کے بعد اگر پھر واپس آنے کا خیال ہو تو اس کا دوبارہ حصول مشکل ہے، غرض اسی لیت و عمل میں چھ مہینے گزر گئے، یہاں تک کہ اب معاملہ بس سے باہر ہو گیا، زبان بھی رک گئی، جیسے اس میں تالا پڑ گیا ہو، میں کوشش کرتا تھا کہ آنے جانے والوں کی خوشی کے لئے ایک ہی دن پڑھاؤں لیکن زبان بالکل ساتھ نہیں دیتی تھی، اور ایک لفظ بھی نہیں نکلتا تھا، زبان کی بندش سے قلب میں ایک رنج و غم کی کیفیت پیدا ہوئی، جس کے اثر سے قوت ہاضمہ نے بالکل جواب دے دیا، کھانے پینے کی خواہش بالکل جاتی رہی، یہاں تک کہ ایک گھونٹ پانی، کھانے کے ایک لقمہ کا ہضم کرنا بھی میرے لئے دشوار ہو گیا، رفتہ رفتہ تمام توانائے جسمانی پر ضعف کا غلبہ ہوا، یہاں تک کہ اطباء نے علاج سے ہاتھ اٹھایا اور کہا کہ قلب پر

کوئی اثر ہے اور اس سے مزاج متاثر ہو گیا ہے، جب تک قلب سے یہ اثر نہ جائے، اس وقت تک علاج کچھ سو مند نہیں، جو میں نے دیکھا تو میں اس معاملہ میں بالکل بے بس ہوں، تو میں نے اللہ کی طرف رجوع کیا اور اضطرابی کیفیت کے ساتھ اس سے دعا کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس جاہ و مال اور اہل و عیال کا چھوڑ دینا مجھے آسان معلوم ہونے لگا، میں نے مکہ کا قصد ظاہر کیا، اور میرے دل میں یہ تھا کہ میں شام کا سفر کروں گا اور بڑے لطافت ایجل سے میں نے بغداد سے نکلنے کا سامان کیا، اہل عراق کو جب میرا قصد معلوم ہوا تو انہوں نے چاروں طرف سے مجھے ملامت کرنی شروع کی اس لئے کہ کسی کے خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی تھی کہ اس ترک و انقطاع کا کوئی دینی سبب بھی ہو سکتا ہے، اس لئے کہ ان کے خیال میں مجھے دین کا بلند ترین منصب حاصل تھا، "ذَٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ" پھر لوگوں نے طرح طرح کی قیاس آرائیاں شروع کیں، جو مرکز حکومت سے دور تھے، انہوں نے خیال کیا کہ اس میں کچھ حکام کا اشارہ ہے، اور ان کے ایما سے یہ خدمت ترک کی جا رہی ہے، لیکن جن لوگوں کا حکومتی حلقوں سے تعلق تھا، وہ دیکھتے تھے کہ اہل حکومت کو کس قدر میرے قیام پر اصرار ہے، اور ان کی کیسی شدید خواہش ہے کہ میں اپنے کام میں مشغول رہوں، وہ یہ کہتے تھے کہ اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کی اس رونق اور عملی چہل پہل کو کسی کی نظر لگ گئی ہے کہ یہ شخص سب چھوڑ چھاڑ کر جا رہا ہے، غرض میں نے بغداد کو الوداع کہی اور جو کچھ میرے پاس مال و متاع تھا، اس میں سے بقدر کفایت رکھ کر سب بانٹ دیا، بغداد سے میں شام آیا، اور وہاں دو سال کے قریب رہا، وہاں میرا کام عزت و خلوت اور مجاہدے کے سوا کچھ نہ تھا، میں نے علم تصوف سے جو کچھ حاصل کیا تھا، اس کے مطابق نفس کے تزکیہ اخلاق کی درستی و تہذیب اور ذکر اللہ کے لئے اپنے قلب کو مصفا کرنے میں مشغول رہا، مدت تک دمشق کی جامع مسجد میں معتکف رہا، مسجد کے منائے پر چڑھ جاتا، اور تمام دن دروازہ بند کئے وہیں بیٹھا رہتا، دمشق سے میں بیت المقدس آیا، وہاں بھی روزانہ صبح کے اندر چلا جاتا، اور دروازہ بند کر لیتا، سیدنا ابراہیم کی

زیارت کے بعد میری طبیعت میں حج و زیارت کا شوق اور مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ کے برکات سے استفادہ کا خیال ہوا، چنانچہ میں حجاز گیا، حج کرنے کے بعد اہل و عیال کی کشش اور بچوں کی دعاؤں نے مجھے وطن پہنچایا حالانکہ میں وطن کے نام سے کوسوں بھاگتا تھا، وہاں بھی میں نے تنہائی کا اہتمام رکھا، اور قلب کی صفائی سے غافل نہیں ہوا، لیکن حوادث و واقعات اہل و عیال کے افکار اور معاشی ضرورتیں طبیعت میں انتشار پیدا کرتی رہتی تھیں اور دلچسپی اور سکون قلب مسلسل نہیں رہتا تھا، لیکن میں اس سے مایوس نہیں ہوتا تھا، اور وقتاً فوقتاً اس سے لذت یلب ہوتا رہتا تھا، اس برس اسی حالت میں گذر گئے، ان تنہائیوں میں مجھے جو انکشافات ہوئے اور جو کچھ مجھے حاصل ہوا، اس کی تفصیل اور اس کا استقصاء تو ممکن نہیں، لیکن ناظرین کے نفع کے لئے اتنا ضرور کہوں گا کہ مجھے یقینی طور پر معلوم ہو گیا، کہ صوفیاء ہی اللہ کے راستے کے مالک ہیں، ان کی سیرت بہترین سیرت، ان کا طریق سب سے زیادہ مستقیم، اور ان کے اخلاق سب سے زیادہ تربیت یافتہ اور صحیح ہیں، اگر عقلاء کی عقل، حکماء کی حکمت، اور شریعت کے رمز نشا سوں کا علم مل کر بھی ان کی سیرت و اخلاق سے بہتر لانا چاہے تو ممکن نہیں، ان کے تمام ظاہری و باطنی حرکات و سکنات مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہیں اور نور نبوت سے بڑھ کر روئے زمین پر کوئی نور نہیں، جس سے روشنی حاصل کی جائے۔

خلوت سے جلوت کی طرف

ممکن تھا کہ امام غزالی اس خلوت و عزلت کی حالت میں رہ جاتے اور یقیناً عمر بھی روحانی لذت اور یکسوئی کے سکون و اطمینان میں گزار دیتے، لیکن اللہ تعالیٰ کو ان سے جو عظیم الشان کام لینا تھا، اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ اس خلوت سے نکلیں اور درس و تدریس، تالیف و تصنیف اور اجتماعی زندگی اختیار کریں تاکہ خلایق کو نفع ہو، اسحاق و فلسفہ کی تردید اور عقلی و علمی طور پر اسلام کی برتری اور صداقت ثابت کرنے کے لئے خصوصاً جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یقین و مشاہدے کے مقام تک پہنچا دیا تھا، عالم اسلام

میں ان سے زیادہ کوئی موزوں شخصیت نہیں تھی، چونکہ یہ کام خدا کو منظور تھا، اور اسلام کو اس کی سخت ضرورت تھی، اس لئے خود ان کی طبیعت میں اس کا داعیہ اور جذبہ پیدا ہوا، اور ان پر اس چیز کا غلبہ ہوا کہ یہی عزیمت کا کام اور انبیاء علیہم السلام کی نیابت اور وقت کا فریضہ اور افضل عبادت ہے، اپنے ان احساسات کو وہ خود بیان کرتے ہیں، اور خلوت سے جلوت میں آنے کا سبب تحریر کرتے ہیں :-

”میں نے دیکھا کہ فلسفہ کے اثرات بہت مدعیان تصوف کی گمراہی بہت سے علماء کی بے عملی اور مشکلیں کی غلط اور کمزور نمایندگی کی وجہ سے اکثر طبقات کا ایمان متزلزل ہو چکا ہے، اور عقائد پر اچھا خاصا اثر پڑ چکا ہے، بہت سے فلسفہ زدہ لوگ ظاہری احکام کے پابند بھی ہیں، لیکن نبوت اور دین کی حقیقت پر ان کا ایمان نہیں ہے، بعض لوگ محض جسمانی ورزش کے خیال سے نماز پڑھتے ہیں، بعض محض سوسائٹی اہل شہر کی عادت کی پیروی، اور اپنی حفاظت کے لئے بعض احکام شریعی کی مادی منفعیتیں اور ان کے نہ کرنے کے دنیاوی نقصانات بتلاتے ہیں، اور اگر ان نقصانات سے بچا جاسکے تو ان کے ارتکاب میں کوئی حرج نہیں سمجھتے، میں نے دیکھا کہ میں ان شبہات کے دور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہوں اور باسانی اس پر قادر ہوں، یہاں تک کہ ان لوگوں کی پردہ دری مجھے اپنے مطالعہ اور ان کے علوم سے گہری واقفیت کی وجہ سے پانی پینے سے بھی زیادہ آسان معلوم ہوتی ہے، یہ دیکھ کر میرے دل میں شدت سے خیال پیدا ہوا کہ مجھے یہی کام کرنا چاہیے، اور یہی وقت کا فریضہ ہے، میں نے اپنے دل میں کہہ لیا کہ تجھے یہ خلوت و عزلت کب جائز ہے، مرض پھیل گیا ہے، اور طبیب خود بیمار ہیں، اللہ کی مخلوق ہلاکت کے کنارے پہنچ گئی ہے، پھر میں نے کہا کہ عظیم الشان کام تم سے کیسے انجام پاسکے گا، عہد نبوت سے بہت بعد ہو گیا ہے، باطل کا ہر طرف دور دورہ ہے، اگر تم نے خلق خدا کو ان کی محبوب مانوس چیزوں سے ہٹانے کی کوشش کی تو سارا زمانہ تمہارا مخالفت ہو جائے گا، تم تنہا کیسے ان کا مقابلہ کر سکو گے، اور کیسے زندگی بسر کرو گے، یہ تو جب ممکن تھا کہ زمانہ مساعد ہوتا، اور سلطان وقت دین دار اور صاحب اقتدار

ہوتا، میں نے یہ کہہ کر اپنے دل کو سمجھایا، اور اپنے لئے عزلت و خلوت کی زندگی کو جائز قرار دے لیا، لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور منظور تھا، اس نے سلطان وقت کے دل میں خود ہی تحریک پیدا کر دی، اس نے مجھے اس فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لئے نیشاپور پہنچنے کا تاکید حکم دیا، یہ حکم سلطانی کچھ اس نوعیت کا تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے اس کی تعمیل نہ کی تو ناراضی تک نوبت پہنچے گی، میں نے خیال کیا کہ اب میرے لئے عذر باقی نہیں رہا، اب میری گوشہ نشینی اور خلوت پسندی محض سستی اور راحت طلبی اور تن آسانی کے لئے ہوگی، اور آزمائش اور تکالیف سے گریز، حالانکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

”أَحْسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكَوَأَنْ يَقُولُوا الْمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ ۚ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِينَ ۚ تَبٰرَكَ الَّذِي مَلَآ السَّمَاءَ مَا بَيْنَ يَدَيْهِ بِالرُّحِّ ۚ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ۝“

میں نے چند اہل قلوب اور اہل مشاہدات سے بھی اس بارے میں مشورہ کیا، انہوں نے بھی بالانفاقی مجھے ترک عزلت کا مشورہ دیا، اس کی تائید میں بہت سے صلحاء نے متوازن خواب بھی دیکھے، جن سے پتہ چلتا تھا کہ میرا یہ اقدام بڑی خیر و برکت کا باعث ہوگا، اور پانچویں صدی کے شروع میں جس میں ایک ہی مہینہ باقی تھا، کوئی شاید عظیم الشان تجدیدی کام ہوگا، اس لئے کہ حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سرے پر ایسے آدمی کو پیدا کرتا ہے، جو اس امت کے دین کو تازہ کر دیتا ہے، ان سب آثار و قرائن سے مجھے بھی اس کی امید پیدا ہوئی، اللہ تعالیٰ نے میرے لئے نیشاپور کا سفر کر دیا اور میں نے اس کا عظیم کارادہ کر لیا، یہ ۴۹۹ھ کے ماہ ذیقعدہ کا قصہ ہے، بغداد سے ذیقعدہ ۴۸۸ھ میں نکلا تھا، اس طرح سے میری گوشہ نشینی کی مدت اس سال ہوتی ہے،

یہ سب تقدیر الہی کی کار فرمائی تھی، جس طرح بغداد سے نکلنا اور وہاں کے جاہ و اعزاز کو خیر آباد کہنا تصور میں نہیں آتا تھا، لیکن اللہ کے حکم سے وہ سب کچھ آسان ہو گیا، اسی طرح سے اس عزت کے زمانہ میں خلوت سے جلوت کی طرف دوبارہ آنے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوتا تھا، لیکن وقت پر اس کا بھی سامان ہو گیا۔

غرض ذیقعدہ ۱۹۹ھ میں امام صاحب نے پھر نیشاپور کا رخ کیا، اور مدرسہ نظامیہ کی مسندِ درس کو زینت دی اور دوبارہ تدریس و افتادہ کا کام شروع کیا، لیکن اب امام غزالی کے درس و تدریس اور اصلاح و ارشاد اور اس انقلاب سے پہلے کے تدریسی مشاغل اور وعظ و ارشاد میں فرق تھا، پہلے وہ نفس کے تقاضے اور طبیعت کے جذبہ سے کرتے تھے، اب وہ اپنے کو مامور اور آلہ کار سمجھتے تھے، چنانچہ خود پوری صاف گوئی سے لکھتے ہیں۔

”مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اگرچہ علم کی نشر و اشاعت کی طرف میں نے پھر رجوع کیا ہے، لیکن حقیقت اس کو پہلی حالت کی طرف بازگشت کہنا صحیح نہیں ہے، میری اس پہلی اور دوسری حالت میں زمین و آسمان کا فرق ہے، میں پہلے اس علم کی اشاعت کرتا تھا، جو حصول جاہ کا ذریعہ ہے، اور میں اپنے قول و عمل سے اسی کی دعوت دیتا تھا، اور یہی میرا مقصود و نیت تھی، لیکن اب میں اس علم کی دعوت دیتا ہوں، جس سے جاہ سے دست بردار ہونا پڑتا ہے، اب میں اپنی اور دوسرے کی اصلاح چاہتا ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ میں اپنے مقصود تک پہنچوں گا، یا اس سے پہلے میرا کام تمام ہو جائے گا، لیکن اپنے یقین و مشاہدہ کی بنا پر میرا ایمان ہے کہ اصل طاقت اللہ کی طاقت ہے، اسی سے آدمی مگر اہی اور شر سے بچ سکتا ہے، اور ہدایت و طاعت کی طاقت حاصل کر سکتا ہے، دراصل میں نے اپنی طرف سے حرکت نہیں کی، اللہ مجھے حرکت میں لایا ہے، میں نے خود کام نہیں شروع کیا ہے، اللہ نے مجھے کام میں لگایا ہے، میری دعا ہے کہ پہلے اللہ میری اصلاح فرمائے، پھر مجھ سے دوسروں کی اصلاح ہو، پہلے مجھے راہ پر لگائے، پھر مجھ سے دوسروں کی رہنمائی فرمائے، حق مجھ پر منکشف ہو جائے، اور اس کے

فضل سے مجھے اتباع کی توفیق ہو، باطل مجھ پر واضح کرے، اور مجھے اس کی پیروی سے بچائے۔

امام غزالی کا تجدیدی کام

امام غزالی نے اس کے بعد جو مجددانہ کام انجام دیا، اس کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

- ۱۔ فلسفہ اور باطنیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ اور اسلام کی طرف سے ان کی بنیادوں پر حملہ۔
- ۲۔ زندگی و معاشرت کا اسلامی و اخلاقی جائزہ اور ان کی تنقید و اصلاح۔

فلسفہ پر عمل جراحی

ان کے پہلے اور سب سے بڑے کارنامہ کی تفصیل یہ ہے کہ فلسفہ اسیاد، باطنیت کے خلاف اس وقت تک جو کچھ کیا جاتا رہا تھا، اس کی حیثیت صرف مدافعت و جواب ہی کی تھی، اس وقت تک فلسفہ اسلام پر حملہ آور تھا، اور متکلمین اسلام صفائی کے وسیلے تھے، فلسفہ اسلام کی بنیادوں پر تیشہ چلاتا تھا، اور علم کلام سپرینے کی کوشش کرتا تھا، اس وقت تک متکلمین و علماء اسلام کے گروہ میں کسی نے خود فلسفہ کی بنیادوں پر ضرب لگانے کی جرأت نہیں کی، ”فلسفہ جن“ مفروضات پر قائم تھا، ان پر جرح کرنے اور خود ان کی علمی تنقید کرنے کی صدیوں تک کسی کو ہمت نہیں ہوئی، امام ابو الحسن اشعری کو چھوڑ کر جن کو فلسفہ سے براہ راست واسطہ نہیں پڑا، پورے علم کلام کا لہجہ معذرت آمیز اور مدافعتی تھا، امام غزالی پہلے شخص ہیں، جنہوں نے فلسفہ کا تفصیلی و تنقیدی مطالعہ کیا، اس کے بعد مقاصد الفلاسفہ کے نام سے ایک کتاب لکھی، جس میں آسان زبان اور سلجھے ہوئے طریقہ پر منطق، النبیات اور طبیعیات کا خلاصہ پیش کیا، اور پوری غیر جانبداری کے ساتھ فلاسفہ کے نظریات اور مباحث کو مدون کر دیا، کتاب کے مقدمہ میں انہوں نے وضاحت کے ساتھ

لہ المنقذ من الضلال ص ۲۵ تا ۳۰ مختصر ۱۔

لکھ دیا ہے کہ ریاضیات میں قیل و قال کی گنجائش نہیں اور دین کا اس سے نفیاً و اثباتاً کوئی تعلق نہیں، لیکن اصل مذہب کا تصادم الہیات سے ہے، منطقیات میں بھی شاذ و نادر غلطیاں ہیں، اگر کچھ اختلاف ہے تو اصطلاحات کا، طبیعیات میں ضرورت و باطل کی آمیزش ہے، اس لئے ان کا موضوع بحث دراصل الہیات اور کسی قدر طبیعیات ہے، منطق محض تہید و اصطلاحات کے لئے۔

اس کتاب سے فارغ ہو کر جس کی علم کلام کے حلقے میں سخت ضرورت تھی، انھوں نے اپنی معرکہ الآراء کتاب "تہافت الفلاسفہ" لکھی جس کی خاطر انھوں نے "مقاصد الفلاسفہ" لکھی تھی، اس میں انھوں نے فلسفہ کے الہیات و طبیعیات پر اسلامی نقطہ نظر سے تنقید کی اور اس کی علمی کمزوریوں، اس کے استدلال کے ضعف اور فلاسفہ کے باہم تناقض و اختلاف کو پوری جرأت و قوت کے ساتھ ظاہر کیا، اس کتاب میں ان کا لہجہ پُر از اعتماد ان کی زبان طاقت و راوشگفتہ ہے، کہیں کہیں وہ طنزیہ اور شوخ طرزی بیان بھی اختیار کر لیتے ہیں جس کی فلسفہ سے مرعوب حلقوں میں ضرورت تھی اور جو بڑا نفسیاتی اثر رکھتا ہے، اس کے پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ کتاب کا مصنف فلاسفہ کے مقابلہ میں احساس کہتری کے ہر ثابہ سے پاک اعتماد اور یقین سے لبریز اور فلسفہ سے بالکل غیر مرعوب ہے، وہ فلاسفہ یونان کو اپنی صفت اور سطح کا آدمی سمجھتا ہے اور ان سے مساویانہ و حریفانہ باتیں کرتا ہے، اس وقت ایک ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی، جو فلسفہ سے آنکھیں ملا کر بات کر سکے اور بجائے مدافعت اور جواب دہی کے فلسفہ پر پورا وار کرے، امام غزالی نے "تہافت الفلاسفہ" میں یہی خدمت انجام دی ہے، اول سے آخر تک اس کتاب میں ان کا طرز یہی ہے، کتاب کی تہید میں لکھتے ہیں:-

"ہمارے زمانہ میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں، جن کو یہ زعم ہے کہ ان کا دل و دماغ عام آدمیوں سے ممتاز ہے، یہ لوگ مذہبی احکام و قیود کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انھوں نے سقراط و بقراط، افلاطون و ارسطو کے پرہیز نام سے، اور ان کی شان میں ان کے مقلدوں کی مبالغہ آرائیاں اور قصیدہ خوانی سنی، ان کو معلوم ہوا کہ ریاضیاً منطقیاً طبیعیاً و الہیاتاً

میں انھوں نے بڑی موٹنگائیاں کی ہیں اور ان کا عقل و ذہن میں کوئی ہمسرنہ تھا، اس عالی دماغی اور ذہانت کے ساتھ وہ مذاہب اور ان کی تفصیلات کے منکر تھے، اور ان کے نزدیک ان کے اصول و قواعد فرضی و مصنوعی ہیں، بس انھوں نے بھی تقلیداً انکار مذہب کو اپنا شعار بنا لیا، اور تعلیم یافتہ اور روشن خیال کہلانے کے شوق میں مذاہب کا انکار کرنے لگے، تاکہ ان کی سطح عوام سے بلند سمجھی جائے اور وہ بھی عقلا و حکما کے زمرہ میں شمار ہونے لگیں، اس بنا پر میں نے ارادہ کیا کہ ان حکما نے الہیات پر جو کچھ لکھا ہے، اس کی غلطیاں دکھاؤں اور ثابت کروں کہ ان کے مسائل اور اصول با زکیچہ اطفال اور ان کے بہت سے اقوال و نظریات حد درجہ کے مضحکہ خیز بلکہ عبرت انگیز ہیں۔

اس کتاب میں آگے چل کر ان کا زور بیان اور طنز آمیز طریقہ تحریر اور شوخ ہو جاتا ہے اور ذات و صفات باری کے متعلق فلاسفہ کے عجائبات اور عقول و افلاک کا پورا شجرہ نسب لکھ کر جو فلاسفہ نے تصنیف کیا ہے لکھتے ہیں:-

قلنا ما ذکرتموه تحکماً وھی علی التتحقیق
ظلمات فوق ظلمات لوحکاء الانسا
عن منام رأاه لاسند لعلی سوء مزاجہ
تمہارا یہ سارا بیان اور تفصیلات محض دعاوی اور
تحکماً ہیں بلکہ درحقیقت تاریکیوں پر تاریکیاں ہیں اگر
کوئی شخص اپنا ایسا خواب بھی دیکھنا بیان کرے
تو اس کے سو مزاج کی دلیل ہوگی۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:-

لست ادری کیف یقع الجنون من نفسہ
ہذا الاوضاع فضلاً عن العقلاء الذین
یشقون الشعر بزعمہ فی المعقولات
مجھے حیرت ہے کہ دیوانہ آدمی بھی ان خود ساختہ
باتوں پر کیسے قانع ہو سکتا ہے، چہ جائیکہ وہ عقلا
جو بزعم خود معقولات میں بال کی کھال نکالتے ہیں۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

انتھی بهم التعق في التعظيم الى ان
ابطوا كل ما يفهم من العظمة وقرىوا
حاله من حال الميت الذي لا خبر له
بما يجري في العالم الا انه فارق الميت
في شعوره بنفسه فقط، وهكذا يفعل
الله بالزاعين عن سبيله والتاكبين
عن طريق الهدى المنكرين لقوله تعالى
"مَا أَشْهَدُ تُهْمُ خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ
وَالَّذِينَ خَلَقُوا أَنفُسَهُمْ" الظالمين بالله طين
السوء المتعدين ان اور الربوبية
تتعلق على كنهها القوى البشرية
المخرورين بعقولهم زاعمين ان فيها
مذوحة عن تقليد الرسل واتباعهم
فلا حصرم اضطرروا الى الاعتراف بان
لباب معقولاتهم مرجع الى مالوحي
في المنام لتعجب منه

(مبدأ اول) کی تعظیم میں مبالغہ کرنے سے ان کو اس
حد تک پہنچا دیا کہ انھوں نے عظمت کے تمام شرائط و لوازم کو
باطل قرار دے دیا اور اللہ تعالیٰ کو (اپنے فلسفہ میں)
اس مردہ کی طرح بنا دیا جس کو کچھ خبر نہیں کہ عالم میں
کیا ہو رہا ہے، صرف اس بات میں وہ مردہ سے غنیمت ہے
کہ اس کو اپنا شعور ہے (مردہ کو اپنا شعور بھی
نہیں ہوتا) اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کا ایسا ہی
حشر کرتا ہے جو اس کے راستے سے ہٹ جاتے ہیں
اور ہدایت کے راستے سے کتر جاتے ہیں جو
اس آیت کے منکر ہیں، میں نے ان کفار و
مشرکین کو آسمان اور زمین کی پیدائش کے
وقت گواہ نہیں بنایا، اور نہ ان کی پیدائش
کے وقت جو اللہ تعالیٰ سے بدگمانی کرتے ہیں،
اور برا عقائد رکھتے ہیں جن کا خیال ہے کہ ان کو
ربوبیت کی حقیقت پر انسانی قوی حاوی ہو
سکتے ہیں جو اپنی عقلوں پر نازاں ہیں اور سمجھتے ہیں کہ
ان کی موجودگی میں پیغمبروں کی تقلید اور ان کے

اتباع کی ضرورت نہیں لامحالہ اس کا انجام یہ ہوگا
ان کی زبان سے (معقولات کے نام سے) ایسی ایسی
مضحکہ خیز باتیں نکلیں کہ اگر کوئی خواب بھی ایسا بیان
کرے تو لوگ تعجب کریں۔

”تہافت الفلاسفہ کا اثر“

فلسفہ پر یہ دلیل اتنے تنقید اور کسی حد تک تحقیر علم کلام کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز تھا جس کا سہرا
امام غزالی کے سر ہے، بعد میں شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے اس کی تکمیل کی اور فلسفہ اور منطق کی لاش کی تشریح (اپوسٹ
مارٹن) کا فرض انجام دیا، فلسفہ کی جراحی کے اس سلسلہ کا آغاز امام غزالی ہی کی تصنیفات سے ہوتا ہے۔
”تہافت الفلاسفہ“ نے فلسفہ کے خیالی طلسم پر کاری ضرب لگائی، اور اس کی عظمت ذہنی تقدس کو کافی
نقصان پہنچایا، اس کتاب کی تصنیف نے فلسفہ کے حلقوں میں ایک اضطراب اور غم و غصہ پیدا کر دیا، مگر
تسویس تک اس کے جواب میں کوئی شایان شان کتاب تصنیف نہیں ہوئی، یہاں تک کہ چھٹی صدی ہجری
کے آخر میں فلسفہ کے مشہور پرچوش وکیل اور ارسطو کے حلقہ بگوش ابن رشد (م ۵۹۵ھ) نے ”تہافت التہافت“
کے نام سے اس کا جواب لکھا، علماء مغرب کہتے ہیں کہ اگر ابن رشد فلسفہ کی حمایت کے لئے نہ کھڑا ہو جاتا تو
فلسفہ غزالی کے حملوں سے نیم جان ہو چکا تھا، ابن رشد کی حمایت نے اس کو تسویس تک کے لئے پھر زندگی
عطا کر دی۔

باطنیت پر حملہ

فلسفہ کے علاوہ امام غزالی نے فتنہ باطنیت کی طرف بھی توجہ کی انھوں نے قیام بغداد اور

مدرسہ نظامیہ کی تدریس کے زمانہ میں باطنیوں کی تردید میں خلیفہ وقت کے اشارہ سے "المستظہری" تالیف کی تھی جس کا تذکرہ انھوں نے اپنی خودنوشت تملاش حق کی کہانی "المنقذ من الضلال" میں کیا ہے اس کتاب کے علاوہ اس موضوع پر ان کی تین کتابیں اور ہیں، جو غالباً اس بازگشت زمانہ کی تصنیف ہیں "حجتہ الحق"، "مفصل اختلاف"، "قاسم الباطنیہ" ان کی تصنیفات کی فہرست میں اس موضوع پر دو کتابیں "فضائح الاباحیہ" اور "مواہم الباطنیہ" اور بھی ملتی ہیں، باطنیت کے رد کے لئے درحقیقت اہل سنت کے حلقہ میں ان سے زیادہ موزوں آدمی ملنا مشکل تھا، وہ فلسفہ و تصوف اور ظاہری علوم اور حقائق و معارف دونوں کو چوں سے واقف تھے اور باطنیہ کی اسرافروشی اور ان کی عقلی سازش کا آسانی سے پردہ فاش کر سکتے تھے، باطنیہ کا بڑا اثر فلسفہ اور اس کی اصطلاحات تھیں، اس لئے امام غزالی جیسا جامع شخص اور عقلیات کا مبصر ان کی تردید کا کام کر سکتا تھا، چنانچہ اس کام کو انھوں نے بخوبی انجام دیا اور ان کو علمی طور پر بے وقعت اور بے اثر بنا دیا۔

زندگی اور معاشرت کا اسلامی جائزہ

امام غزالی کا دوسرا اصلاحی کارنامہ زندگی و معاشرت کا اسلامی جائزہ اور اس کی اصلاح و تجدید کی کوشش تھی، ان کی اس کوشش کا نمونہ اور کامیاب نتیجہ ان کی زندہ جاوید تصنیف "احیاء علوم الدین" ہے۔

احیاء علوم الدین

تاریخ اسلام میں جن چند کتابوں نے مسلمانوں کے دل و دماغ اور ان کی زندگی پر سب سے زیادہ اثر ڈالا ہے اور جن سے اسلامی حلقے طویل عرصہ تک متاثر رہے ہیں، ان میں "احیاء علوم الدین" کو ممتاز مقام ہے۔ ان تینوں کتابوں کا تذکرہ امام غزالی نے "جواہر القرآن" میں کیا ہے۔

حاصل ہے، حافظ زین الدین العراقی صاحب "لفیہ" (م ۸۵۰ھ) جنھوں نے احیاء کی احادیث کی تخریج کی ہے، کہتے ہیں کہ امام غزالی کی احیاء العلوم اسلام کی اعلیٰ ترین تصنیفات سے ہے، عبدالغافر فارسی جو امام غزالی کے معاصر اور امام الحرمین کے شاگرد ہیں، کہتے ہیں کہ احیاء العلوم کے مثل کوئی کتاب اس سے پہلے تصنیف نہیں ہوئی، شیخ محمد کازرونی کا دعویٰ تھا کہ اگر دنیا کے تمام علوم مٹا دیئے جائیں تو میں "احیاء العلوم" سے ان کو دوبارہ زندہ کر دوں گا، حافظ ابن جوزی نے بھی بعض باتوں سے اختلاف کے باوجود اس کتاب کی تاثیر اور مقبولیت کا اعتراف کیا ہے، اور اس کا خلاصہ منہاج القاصدین کے نام سے لکھا۔

یہ کتاب خاص حالات و کیفیات اور خاص جذبہ کے ساتھ لکھی گئی ہے، بغداد سے انھوں نے طلب حق اور تملاش یقین کا جو سفر شروع کیا تھا، اور جو دس برس کے مجاہدات اور بادیہ پیمانی کے بعد کلبانی پر ختم ہوا، احیاء العلوم اس سفر کی سوغات تھی، جو امام غزالی اہل وطن کے لئے لائے، یہ ان کے قلبی تاثرات، علمی تجربات، اصلاحی خیالات اور وجدانی کیفیات کا آئینہ ہے۔

مولانا شبلی نے الغزالی میں لکھا ہے :-

"بغداد میں ان کو تحقیق حق کا شوق پیدا ہوا، تمام مذاہب کو چھاننا کسی سے تسلی نہیں ہوئی آخر تصوف

کی طرف رخ کیا، لیکن وہ قال کی چیز نہ تھی، بلکہ سرتاپا حال کا کام تھا، اور اس کا پہلا زینہ اصلاح باطن

اور تزکیہ نفس تھا، امام صاحب کے مشاغل اس کیفیت کے بالکل سدراہ تھے، قبول عام و ناموری جاہ و

منزلت، مناظرات و مجادلات اور پھر تزکیہ نفس شتات بینہما۔ ع

اسی رہ کر وہ می روی تو بمنزل نمی رود

آخر سب چھوڑ چھاڑا ایک کلمی پہن بغداد سے نکلے، اور دشت پیمانی شروع کی سخت مجاہدات اور ریاضات کے بعد

بزم راز تک رسائی پائی، یہاں پہنچ کر مکن تھا کہ اپنی حالت میں مست ہو کر تمام عالم سے بے خبر بن جاتے لیکن

۱۳۲۵ھ تعریف الاحیاء بفضل الاحیاء (شیخ عبدالقادر احسنی)

ع بیاد آحریفاں بادہ پیا را

کے لحاظ سے افادہ عام پر نظر پڑی دیکھا تو آئے کا آواگرا ہوا ہے، امیر و عزیز عام و خاص عالم و جاہل، رند و زاہد سب کے اخلاق تباہ ہو چکے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں، علماء جو دلیل راہ بن سکتے تھے، طلب جاہ میں مصروف ہیں، وہ یہ دیکھ کر ضبط نہ کر سکے، اور اس حالت میں یہ کتاب لکھی، دیکھا کہ میں نے دیکھا کہ مرض نے تمام عالم کو چھایا ہے، اور سعادتِ اخروی کی راہیں بند ہو گئی ہیں، علماء جو دلیل راہ تھے، زمانہ ان سے خالی ہوتا جاتا ہے، جو رہ گئے ہیں، وہ نام کے عالم ہیں، جن کو ذاتی اغراض نے اپنا گرویدہ بنا لیا ہے، اور جنہوں نے تمام عالم کو یقین دلایا ہے کہ علم صرف تین چیزوں کا نام ہے، مناظرہ (جو فخر و نمود کا ذریعہ ہے) و عظ (جس میں عوام کی دلچسپی کے لئے رنگین اور مستح فقرے استعمال کئے جاتے ہیں) فتویٰ (جو مقدمات کے فیصل کرنے کا ذریعہ ہے) باقی آخرت کا علم تو وہ تمام عالم سے ناپید ہو گیا ہے، اور لوگ اس کو بھول بھلا چکے، یہ دیکھ کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا، اور مہر سکوت ٹوٹ گئی!

تنقید و احتساب

کتاب کی تالیف سے جو اصلاح و تربیت امام غزالی کے پیش نظر تھی، اس کے لئے آمادگی اور شوق اور اپنی اور اپنے ماحول کی اصلاح کا تقاضا پیدا کرنے کے لئے ضروری تھا کہ ان کمزوریوں اور خرابیوں کی نشاندہی کی جائے، جو علمی و دینی حلقوں اور مسلم معاشرہ میں بالعموم پھیلی ہوئی تھیں، نیز اس حقیقت کو آشکارا کیا جائے کہ نفس و شیطان نے کس کس طرح سے مختلف طبقوں کو فریب دے رکھا ہے، دینی مفاہیم و حقائق کس طرح تبدیل ہو گئے ہیں، لوگ حقائق و مقاصد سے ہٹ کر ظواہر و اشکال اور رسوم میں کس طرح گرفتار ہیں، اور مقصد اصلی سعادتِ اخروی اور رضائے الہی سے کس طرح غافل ہیں، اس کے لئے انھوں نے

اپنے زمانہ کی زندگی اور معاصر سوسائٹی کا پورا جائزہ لیا، اور اس کی بے لاگ تنقید کی، اور ہر طبقہ کے امراض اور مخالطوں کو صفائی کے ساتھ بیان کیا، مقاصد اور وسائل و آلات میں فرق کیا، علوم میں دنیاوی علوم اور دینی علوم اور پھر علوم محمودہ اور علوم مذمومہ، فرض اور فرض کفایہ کی تقسیم کی، وقت کے فریضہ اور اصل کام کی طرف توجہ دلائی، اہل دولت اور اغنیاء کی کوتاہیوں اور ان کی مخصوص بیماریوں کو کھول کر بیان کیا، اسلام میں حکام پر جرات کے ساتھ تنقید کی، اور ان کے جبر و ظلم، خلاف شرع اعمال و قوانین کی مذمت کی، اس کے علاوہ جمہور و عوام کے امراض اور مختلف طبقوں اور مقامات کے منکرات، مذموم عادات اور مخالفت دین روم و بدعت کی تفصیل کی، اس طرح یہ کتاب اسلام میں پہلی مفصل و مدلل کتاب ہے، جس میں پوری زندگی اور گزشتے ہوئے اسلامی معاشرہ کا قوت کے ساتھ احتساب کیا گیا ہے، اور اخلاقی بیماریوں کے عوارض و اسباب و ان کا طریق علاج بتایا گیا ہے،

علماء و اہل دین

امام غزالی کے نزدیک اس عالمگیر فساد، دینی و اخلاقی انحطاط کی سب سے بڑی ذمہ داری علماء پر ہے، جو ان کے نزدیک مت کا نمک ہیں، اگر نمک بگڑ جائے تو اس کو کون سی چیز درست کر سکتی ہے، بقول شاعر:-

یامعشر القراء یا ملح البلد ما یصلح الملح ازا الملح فسد

اے جماعت علماء! وہ جو شہر کا نمک ہے۔ بھلا یہ تیرا کب تک ہی بگڑ جائے تو پھر اس کی اصلاح کس سے کی جائے

ایک جگہ امراضِ قلب کی کثرت اور عام غفلت کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

الثالثة وهو الداء العضال فقد تیر اسبب اور وہ لاعلاج مرض کی حیثیت رکھتا

الطیب فان الاطباء هم العلماء ہے، یہ ہے کہ مرض موجود ہیں اور طبیب مفقود،

وقدم مرضوا فی هذا الاعصار مرضاً طبیب علماء ہیں، اور وہ خود اس زمانہ میں بری

شدیداً و عجوزاً عن علاجہ۔ طرح بیماریاں اور علاج سے عاجز ہیں۔

ان کے نزدیک سلاطین و حکام کی خرابی کا سبب بھی علماء کی کمزوری اور اپنے فرائض سے غفلت ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں۔

وبالمجملۃ اتمّ فسدت الرعیۃ
بفساد الملوك وفساد الملوك
بفساد العلماء فلولا القضاء الشوع
والعلماء الشوع لقل فساد الملوك
خوفامن انكارهم۔
خلاصہ یہ ہے کہ رعیت کی خرابی کا سبب سلاطین کی خرابی ہے، اور سلاطین کی خرابی کا سبب علماء کی خرابی ہے اس لئے کہ اگر خدا ترس قاضی اور علماء سو نہ ہوتے تو سلاطین اس طرح نہ بگڑتے اور ان کو علماء کی روک ٹوک کا کھٹکا ہوتا۔

ان کو علماء وقت سے شکایت ہے کہ وہ علماء سلف کی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور کلمہ حق عند سلطان جائز کا فریضہ انجام نہیں دیتے، ان کے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ خود بہت سے علماء دنیا طلبی اور جاہ طلبی کا شکار ہو گئے ہیں، وہ سلاطین وقت اور ارباب حکومت کے سامنے علماء حق کی جرات و بیباکی اور احتساب و انکار کے موثر واقعات نقل کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں:-

یہ تھا علماء کا طرز عمل اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی شان، ان کو سلاطین کی شان و شوکت کی ذرا پرواہ نہ تھی، وہ اللہ تعالیٰ کے فضل پر اعتماد رکھتے ہیں، اور ان کو اطمینان تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی حفاظت فرمائے گا، اور وہ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ پر بھی راضی تھے کہ ان کو شہادت نصیب ہو، چونکہ ان کی نیت خالص تھی، اس لئے ان کے کلام سے پتھر موم ہو جاتے تھے اور بڑے سے بڑے سنگل متاثر ہوتے تھے، اب تو حالت یہ ہے کہ طمع دنیا نے علماء کی زبانیں گنگ کر رکھی ہیں اور وہ خاموش ہیں، اگر بولنے بھی ہیں تو ان کے اقوال و حالات میں مطابقت نہیں ہوتی، اس لئے کوئی اثر نہیں ہوتا، اگر آج بھی وہ خلوص و صداقت سے کام لیں، اور علم کا حق ادا کرنے کی کوشش کریں تو ان کو ضرور کامیابی ہو، کیونکہ رعیت کی خرابی سلاطین کی خرابی

کا نتیجہ ہے، اور سلاطین کی خرابی علماء کی خرابی کا نتیجہ ہے، اور علماء کی خرابی کی وجہ دولت اور جاہ کی محبت کا غلبہ ہے، اور جس پر دنیا کی محبت غالب آجائے وہ ادنیٰ درجہ کے لوگوں پر بھی احتساب اور روک ٹوک نہیں کر سکتا، چہ جائیکہ سلاطین و اکابر!۔

امام غزالی کے زمانہ میں ایک عالم فقیہ کی جزئیات اور اخلاقی مسائل میں مشغول تھا، مباحثہ و مناظرہ کا بازار گھر گھر اور ملک کے چپے چپے پر گرم تھا، مجالس و تقریبات اور بادشاہوں کے درباروں کی رونق بھی انہی مذہبی و فقہی مباحثوں اور مناظروں سے تھی، اس بارہ میں علماء و طلبہ کا انہماک اور غلوائتا بڑھ گیا تھا کہ تمام دوسرے علوم و مشاغل اور خدمت دین کے شعبے نظر انداز ہوتے جا رہے تھے، حدیث ہے کہ اصلاح نفس تہذیب اخلاق اور سعادت اخروی کا جس علم اور کوشش پر انحصار تھا، اس سے بھی توجہ ہٹ گئی تھی، امام غزالی اس صورت حال کی تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

«اگر کسی فقیہ سے ان مضامین (صبر و شکر، خوف و جوار و غیرہ) بالغرض و حسد و کینہ، ناشکری، دغا، فریب وغیرہ) میں سے کسی کی بابت حتیٰ کہ اخلاص و توکل اور ریا سے بچنے کے طریقوں کے متعلق سوال کیا جائے جس کا جاننا اس کے لئے فرض عین ہے، اور اس کی طرف سے غفلت کرنے میں آخرت کی تباہی کا خطرہ ہے تو وہ جواب نہ دے سکے گا، اور اگر آپ لعان و ظہار سبق وری کو دریافت کریں تو وہ ایسی ایسی باریک جزئیات کے دفتر کے دفتر سائے گا جس کی ضرورت مدتوں پیش نہیں آتی، اور اگر کبھی ضرورت پیش آجائے تو شہر میں ان کے متعلق فتویٰ دینے والا، اور بتانے والا ہر وقت موجود ہے، لیکن یہ عالم دن رات انہی جزئیات کے سلسلہ میں محنت کرتا رہے گا، اور ان کے حفظ و درس میں مشغول رہے گا اور اس چیز سے غفلت برتے گا، جو دینی حیثیت سے اس کے لئے ضروری ہے، اگر اس سے کبھی اس بارہ میں سوال ہوتا ہے تو کہتا ہے کہ میں اس علم میں اس لئے مشغول ہوں کہ وہ علم دین ہے اور فرض کفایہ ہے اور وہ اس کے تعلیم و تعلم کے بارہ میں اپنے کو بھی

مغالطہ دیتا ہے اور دوسروں کو بھی، حالانکہ سمجھدار آدمی خوب جانتا ہے کہ اگر اس کا مقصد فرض کفایہ کے حق کو ادا کرنا ہو، اور اپنی ذمہ داری سے عمدہ برآہونا ہونا تو وہ اس فرض کفایہ پر فرض عین کو مقدم رکھنا، بلکہ دوسرے فرض کفایہ بھی ہیں جن کو مقدم ہونا چاہئے مثلاً کتنے شہر ہیں جن میں صرف غیر مسلم طبیب ہیں جن کی شہادت احکام فقہ میں قبول نہیں کی جاسکتی لیکن ہم نہیں دیکھتے کہ کوئی عالم (اس کی اور ضرورت کو محسوس کر کے) علم طب کی طرف توجہ کرتا ہو اس کے بالمقابل علم فقہ یا مخصوص خلافیات و جدیدیات پر طلبہ ٹوٹ پڑتے ہیں، حالانکہ شہر ایسے علماء سے بھرا ہوا ہے جن کا مشغلہ فتویٰ نویسی اور مسئلہ بنانا ہے، میرے سمجھ میں نہیں آتا کہ علماء دین ایسے فرض کفایہ میں مشغول ہونے کو کیسے درست سمجھتے ہیں جس کو ایک جماعت کی جماعت سنبھالے ہوئے ہے اور ایسے فرض کفایہ کو انھوں نے کیسے چھوڑ رکھا ہے جس کی طرف کوئی توجہ کرنے والا نہیں، کیا اس کا سبب اس کے علاوہ اور کچھ ہے کہ طب کے ذریعہ سے اوقات کی تولیت و وصیتوں کی تنفیذ اور تنظیم کے مال کی نگرانی و انتظام اور منصب قضا و افتاء پر تقرر اور معصروں اور محشمیوں میں فوقیت و امتیاز اور دشمنوں اور حریفوں پر حکومت و غلبہ حاصل ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

ایک دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں:-

کوئی شہر بھی ایسا نہیں ہے جہاں کچھ ایسے کام نہ ہوں جو فرض کفایہ کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کی طرف توجہ کرنے والا کوئی نہیں، اور علماء کو ان کی طرف مطلق التفات نہیں زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں ایک طبیب کو لیجئے کہ اکثر اسلامی شہروں میں مسلمان طبیب موجود نہیں جن کی شہادت شرعی امور میں معتبر ہو، علماء اس مشغلہ سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے، اس طرح سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی فرض کفایہ ہے (لیکن متروک ہو رہا ہے)۔

وہ ایک جگہ عام بہالت و غفلت، دین سے ناواقفیت کا نقشہ کھینچتے ہوئے اور تبلیغ اور عمومی تعلیم کی ضرورت ظاہر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:-

”اس شخص کے لئے جس کو اپنے دین کی واقعی فکر ہے، یہ (تبلیغ و تعلیم) خود ایسا مشغلہ ہے کہ پھر اس نادرا واقعہ جزئیات دور از کار تفصیلات اور ان علوم میں موثر گامی کرنے کی فرصت ہی نہیں ہو سکتی جو خود فرض کفایہ ہیں۔“

امام غزالی محققانہ و مورخانہ حیثیت سے اس کی وجہ بتلاتے ہیں کہ اختلافی مسائل نے پچھلے دور میں کیوں اس قدر اہمیت اور مقبولیت حاصل کر لی، اور علماء نے اس کو اپنی ذہانتوں اور محنتوں کا میدان بنا لیا، اور ان کی بہترین توجہات اس میں صرف ہونے لگیں، امام غزالی کے نزدیک اس کے کچھ تاریخی اسباب ہیں، اور ان کے نتیجہ میں ایسا ہونا بالکل قدرتی بات ہے، وہ تحریر فرماتے ہیں:-

”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے جانشین حضرات خلفائے راشدین خود بڑے عالم فقہ اور صاحب فتویٰ تھے ان کو شاذ و نادر کسی خاص موقع پر دوسرے اہل علم صحابہ سے مدد لینے کی ضرورت پیش آتی تھی، اس لئے علماء صحابہ علوم آخرت کے لئے فارغ اور ان میں مہمک تھے، اگر کوئی فتویٰ کا موقع پیش آتا تو وہ ایک دوسرے پر جمول کرتے اور بہترین توجہ الی اللہ رہتے جیسا کہ ان کے حالات میں منقول ہے، جب ان لوگوں کی نوبت آتی جو خلافت کا استحقاق اور قابلیت نہیں رکھتے تھے اور ان میں خود فیصلہ کرنے اور فتویٰ دینے کی صلاحیت نہیں تھی تو ان کو مجبوراً دوسرے علماء سے مدد لینی پڑی اور ان کو ساتھ رکھنا پڑا، تاکہ ان سے وہ فتویٰ حاصل کرتے رہیں، علماء تابعین میں ابھی ایسے لوگ زندہ تھے جو قدیم روش پر تھے، اور جن میں دین کی حقیقت اور سلف کی شان تھی، جب ان کو بلا یا جاتا تو وہ گریز کرتے، اور اعراض کرتے، خلفاء (بنی امیہ و بنی عباس) کو ان کو تلاش کرنا پڑتا، اور عہدہ قضا اور حکومت کے لئے ان سے اصرار کرنے کی کوششیں پیش آتی، ان کے زمانہ کے لوگوں نے جب علماء کی یہ شان، سلاطین و حکام کا ایسا رجوع اور اہل علم کا یہ استغناء اور بے پرواہی دیکھی تو وہ سمجھے کہ حصول جاہ و عزت کے لئے فقہ کا علم بہترین نسخہ ہے، اسی سے حکام کا تقرب اور قضا و افتاء کا منصب حاصل ہوتا ہے پس وہ اسی طرف توجہ ہو گئے، انھوں نے حکام کے سامنے خود اپنی پیشکش کی اور

ان سے مراسم پیدا کئے، اور عہدوں اور انعامات کے خود امیدوار بنے، بعض کو تو کچھ ہاتھ نہ آیا، بعض کامیاب ہوئے، جو کامیاب بھی ہوئے وہ امیداری کی ذلت سے محفوظ نہیں رہے اور ان کو اپنے مقام سے نیچے اترنا، اور عیاض اور بتذل سطح پر آنا پڑا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علماء جو پہلے مطلوب تھے، اب طالب بن گئے پہلے حکام سے استغناء اور اعراض کی وجہ سے معزز تھے، اب ان کی طرف متوجہ ہونے کی وجہ سے ذلیل و خوار ہو گئے، البتہ اس کلیہ سے ہر دور میں کچھ اللہ کے بندے مستثنیٰ رہے ہیں۔

ان زمانوں میں سب سے زیادہ اہمیت اور توجہ احکام اور فتاویٰ کی طرف تھی اور انتظامات اور مقدمات کے سلسلے میں ان کی ضرورت بھی زیادہ تھی اس کے بعد بعض رؤسا و حکام کو اصول و عقائد سے کچھ پیچیدہ ہوئی اور اس کا شوق ہوا کہ ہر فریق کے دلائل و مباحث میں اور ان کا بحث و مباحثہ دیکھیں، لوگوں کو ان رؤسا و حکام کے اس ذوق کا علم ہوا تو وہ علم کلام کی طرف رجوع ہوئے، مصنفین نے اس موضوع پر بہ کثرت تصنیفات کیں اور مناظرے کے اصول و قواعد کو مرتب کیا، اور رد و قدح کو ایک فن بنا دیا، ان لوگوں کا یہ بیان تھا کہ ان کا مقصود دین کی طرف سے مدافعت و جواب ہی سنت کی نصرت اور بدعت کی تردید و مخالفت ہے، ٹھیک جیسے ان لوگوں کے پہلے کے لوگ یہ کہتے تھے کہ فتاویٰ میں شمولیت سے مقصود محض دین، خدمتِ خلق اور بندگانِ خدا پر شفقت اور خیر خواہی ہے، اس کے بعد کچھ رؤسا و حکام ایسے ہوئے، جو علم کلام و مناظرہ کو بنظر استعجاب نہیں دیکھتے تھے، ان کا خیال تھا کہ اس سے تعصب، جنگ و جدال اور بعض اوقات خونریزی و فساد کی نوبت آجاتی ہے، ان کو فقہی بحث و مناظرہ سے رغبت تھی، اور اس تحقیق کا شوق تھا کہ خصوصیت کے ساتھ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی میں کس کا مذہب زیادہ صحیح ہے، لوگوں نے دیکھ کر کلام و عقائد کو بالائے طاق رکھ دیا، اور اختلافی مسائل بالخصوص امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کے اختلافات کو موضوعِ سخن بنا لیا، اور امام مالک، امام سفیان ثوری اور امام احمد وغیرہ کے مذاہب اختلافی کو نظر انداز کر دیا (اس لئے کہ ان کے اختلافات سے حکام کو کچھ پیچیدگی نہیں) ان کا کہنا تھا کہ ان کا مقصد یہ ہے کہ شریعت کی باریکیوں کو

ظاہر کریں، مذاہب کے وجوہ و اسباب کو بیان کریں، اور فتاویٰ کے اصول کو مرتب و مدون کریں، انھوں نے اس میں کثرت سے تصنیفات کیں، اور استنباطات کئے، اور مجادلہ اور تصنیف کے فن کو ترقی دی، اور شیخہ ابھی تک جاری ہے، ہمیں معلوم نہیں کہ آئندہ اللہ تعالیٰ کیا دکھائے گا، اور اس میں کیا تغیر ہوگا تو دراصل اختلافی مسائل اور مناظرہ سے علماء کی کچھ پیچیدگی اور ان کے انہماک کا سبب یہ ہے جو ہم نے بیان کیا، اگر اہل دنیا اور ارباب اقتدار کو (امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کے علاوہ) کسی اور امام یا (اختلافی مسائل و مناظرہ کے علاوہ) کسی اور علم سے کچھ پیچیدگی ہو جائے تو علماء کبھی اسی کی طرف جھک پڑیں گے، اور اس کی وجہ یہی بیان کریں گے کہ ان کا مقصد علم دین اور قربتِ خداوندی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اس کے بعد امام غزالی نے تفصیل کے ساتھ مناظرہ اور حجت و مجادلہ کے اخلاقی و روحانی نقصانات و مفسدات اور اس کے شرور و آفات بیان کئے، وہ عرصہ تک اس میدان کے شہسوار رہ چکے تھے، اس لئے اس سلسلے میں ان کا بیان چشم دید شہادت کی حیثیت رکھتا ہے، اور مشاہدات اور ذاتی تجربات پر مبنی ہے۔ اس سلسلے میں ایک بڑا منظرہ الفاظ کا تھا، امام غزالی کے زمانہ کے علوم و مرصعہ اور ان کی بگڑی ہوئی شکلوں کے لئے جو الفاظ عنوان کا کام دیتے تھے، وہ قدیم الفاظ تھے، جو قرآن و حدیث، صحابہ کے کلام اور علماء سلف کی سیرتوں میں بہ کثرت آتے ہیں، مثلاً اختلافی مسائل فقہ کی نادر و وقوع جزئیات اور باریکیوں کے لئے بے تکلف "فقہ" کا لفظ استعمال ہوتا تھا، ہر طرح کے علمی اشغال اور شرعی و غیر شرعی علم کے لئے مطلقاً علم کا لفظ بولا جاتا تھا، علم کلام اور اس کے فلسفیانہ مباحث کو "توحید" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، بے سرو پا روایات و سطحیات اور عبارات آرائی و رنگین بیانی کو "تذکرہ" کے لفظ سے یاد کیا جاتا تھا، ہر طرح کے نامانوس مضامین اور پیچیدہ عبارتوں کو "حکمت" کا خطاب یا جاتا تھا، اور پھر ان سب خود ساختہ اعمال و اشغال پر وہ سب فضائل چسپاں کئے جاتے تھے، جو قرآن و حدیث میں ان علوم کی حقیقتوں کے بارہ میں وارد ہوئے ہیں، مثلاً فقہ

کی اس بگڑی ہوئی شکل (محض اختلافات و جزئیات کے لئے) قرآن مجید کی آیت "لِيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ" اور حدیث "مَنْ يُرِدِ اللهُ بِهِ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ" فلسفہ اور پانچویں صدی کے علم کلام کے لئے "وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا" کی بشارت، جاہل اور ناخدا ترس اعظموں کے عامیانہ مواعظ کے لئے "فَذَكِّرْ إِنَّمَا أَنْتَ مُذَكِّرٌ" اور دوسری آیات و احادیث منطبق کی جاتی تھیں امام غزالی نے اس مغالطہ کا پردہ چاک کیا اور تفصیل سے بتلایا کہ یہ الفاظ اپنی اصل حقیقت کھو چکے ہیں اور اپنے اصل مفہوم سے دور ہوتے ہوئے کہیں سے کہیں پہنچ گئے ہیں قرون اولیٰ میں ان کا جو مفہوم تھا، اس سے علماء کے ان موجودہ مشاغل کو کوئی مناسبت نہیں ان کی یہ بحث الفاظ کے سفر کی ایک پچسپ روداد اور اصطلاحات اور عنوانات کے تغیر کی ایک سبق آموز تالیخ ہے اور بہت سی غلط فہمیوں کے ازالہ کا ذریعہ ہے جو علمی اور دینی حلقوں میں اس وقت پھیلی ہوئی تھیں۔

حکام و سلاطین

دوسرا جو امام غزالی کے نزدیک اس عالمگیر فساد، اخلاقی انحطاط اور دینی تنزل کا ذمہ دار تھا، وہ اہل حکومت اور سلاطین و امراء کا طبقہ تھا، امام غزالی سے دو سو برس پہلے حضرت عبدالستار ابن مبارک نے انہی دونوں (علماء و سلاطین) کے گروہوں کو دین کا گائٹنے والا قرار دیا تھا۔

وهل افسد الدين الا الملوك والبارسوء وهاذا

امام غزالی نے ایک ایسے زمانہ میں کہ بادشاہ مطلق العنان اور ہر طرح کے قوانین و ضوابط سے بالاتر تھے اور ان پر اعتراض کرنا موت کو پیام دینا تھا، اس طبقہ کا پوری جرأت کے ساتھ احتساب کیا اور ان پر آزادانہ تنقید کی، ان کے زمانہ میں بادشاہوں کے عطیوں اور پیشکشوں کو قبول کرنے کا عام رواج

لے چنانچہ فلسفہ کی درسی کتابوں پر حتیٰ کہ طب کی بعض بعض کتابوں کے سرورق پر اب بھی یہ آیت نظر آتی ہے۔

تھا، امام غزالی نے اموال سلطانی کو ناجائز اور بالعموم مشتبہہ اور حرام بتلایا۔ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں۔

اغلب اموال السلاطین حرام فی ہذا الاعصار، والحلال فی ایدیہم
 بادشاہوں کے مال اس زمانہ میں عموماً حرامت سے خالی نہیں، حلال مال ان کے پاس یا تو سب سے ہوتا ہی نہیں یا بہت کم ہوتا ہے۔
 معدوم و عزیز۔
 دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

ان اموال السلاطین فی عصرنا حرام کلہا و اکثرہا و کفیت لا و الحلال
 سلاطین کے مال ہمارے زمانہ میں یا تو سب حرام ہیں یا ان میں کا بڑا حصہ اور کچھ تعجب کی بات نہیں اس لئے کہ
 هو الصدقات والفقح والغنیمۃ ولا
 حلال مدین زکوٰۃ ہے اور مال غنیمت کی ہیں اور ان کا
 وجود لہا و لیس یدخل منہا فی ید السلطان
 کہیں جو نہیں اور ان میں سے کوئی چیز بادشاہ تک پہنچنے
 ولم یبق الا الجزیۃ وانہا تؤخذ بالوعاء
 نہیں پاتی لے کے صرف جزیہ کی مدد اور اس کا حال
 من الظلم لا یعمل اخذہا بہ فاذہم مجاوزون
 یہ ہے کہ وہ مختلف نظامانہ طریقوں سے وصول کیا جاتا ہے
 حد و الشرع فی الماخوذ و الماخوذ منہ
 جن سے اس کا وصول کرنا جائز ہی نہیں مال سلطنت
 والوفاء لہ بالشرط ثم اذا نسیب ذالک
 حد و شریعت تجاوز کرتے ہیں نہ مال کی مقدار میں شریعت
 الی ما ینصب الیہم من الخراج المضروب
 کا کچھ پاس کیا جاتا ہے نہ ذی جن سے وصول کیا جاتا ہے
 علی المسلمین ومن المصادرات والرشا
 اس بارہ میں شریعت کے احکام کا خیال کیا جاتا ہے نہ اس کے
 صنوف الظلم لم ینلغ عشر مصشرا
 شرائط پورے کی جاتے ہیں پھر مسلمانوں پر مقرر شدہ خراج
 مالوں اور جائیدادوں کی ضمنی رشوت اور انواع واقسام
 عشیرۃ۔

کے ظلم سے ان پر سونے چاندی کی جو بارش ہوتی ہے، اس کو

اس جزیہ کو بھی کوئی نسبت نہیں۔

امام غزالی اس سے ترقی کر کے یہاں تک لکھتے ہیں کہ سلاطین وقت سے ان رقوم کا قبول کرنا بھی مناسب نہیں جن کے متعلق تحقیق یا گمان غالب ہے کہ وہ مشتبہہ اور ناجائز نہیں ہیں، اس لئے کہ اس میں بہ کثرت دینی مفسد ہیں، اس موقع پر گذشتہ عہد کی مثالیں دی جاسکتی تھیں کہ سلف میں بعض علماء و صلحاء نے اپنے زمانہ کے خلفاء و سلاطین کی پیشکش بعض اوقات قبول کی ہیں، امام غزالی اس عہد کے ملوک و سلاطین اور ان دونوں زمانوں کے حالات کا فرق بیان کرتے ہیں :-

”دور اول کے ظالم سلاطین خلفاء راشدین کے عہد کے قرب کی وجہ سے اپنے ظالمانہ رویہ کا احساس رکھتے تھے، اور ان کو صحابہ و تابعین کی دجوئی اور استمالت کا خیال رہا کرتا تھا، اور اس بات کی فکر رکھتے تھے کہ وہ کسی طرح ان کے عطیے اور انعامات قبول کر لیں، وہ ان کے پاس یہ رقمیں اور نذرانے بغیر ان کی طلب کے اور ان کی شان اور مرتبہ پر جبراً آئے بغیر ان کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے، بلکہ ان کے قبول کر لینے پر ان کے احسان مند ہوتے تھے، اور سرت کا اظہار کرتے تھے، وہ حضرات بھی ان چیزوں کو لے کر تقسیم کر دیا کرتے تھے، وہ سلاطین کی اغراض میں ان کا ساتھ نہیں دیتے تھے، نہ ان سے ملاقات کرنے آتے تھے، نہ ان کے ساتھ اجتماع کو پسند کرتے تھے، نہ ان کو ان کی درازی عمر اور جاہ و اقبال کے باقی رہنے کی خواہش تھی، بلکہ وہ ایسے ظالموں کے لئے بد دعا کرتے تھے، ان کے بارہ میں آزادانہ اظہار خیال کرتے تھے، اور ان کے منہ پر ان کے خلاف شرع امور پر ٹوک دیا کرتے تھے، اور تردید کرتے تھے، اس لئے اس کا خطرہ نہ تھا کہ جننا ان کو سلاطین سے فائدہ پہنچا ہے، اتنا ہی ان کو سلاطین کے اس تعلق سے دینی نقصان پہنچے گا، اس لئے ان کے قبول کرنے میں کوئی قباحت نہ تھی۔

لیکن اس کے برعکس آج سلاطین ان ہی لوگوں کے ساتھ یہ فیاضی کرتے ہیں، جن کے متعلق ان کو یہ امید ہوتی ہے کہ وہ ان سے کام لے سکیں گے، ان سے ان کو سہارا حاصل ہوگا، وہ ان سے اپنی اغراض پوری کر سکیں گے، ان سے ان کے درباروں اور مجلسوں کی رونق بڑھے گی، اور وہ ہمیشہ دعا گوئی، ثنا خوانی اور

حاضر و غائب ان کی تعریف و توصیف میں لگے رہیں گے، اس سلسلہ میں پہلا درجہ سوال کی ذلت کا ہے، دوسرا خدمت کے لئے آمد و رفت کا، تیسرا تعریف و دعا گوئی کا، چوتھا یہ کہ ضرورت کے وقت ان کے اغراض میں ان کی مدد کی جائے، پانچواں حاضر باشی اور دربارداری جلوس کی شرکت، چھٹا اظہار محبت و دوستی، اوٹھواں حریفوں کے مقابلہ میں ان کی امداد و نصرت، ساتواں ان کے ظلم اور ان کے عیوب اور بد اعمالیوں کی پردہ پوشی، اگر کوئی شخص ان میں سے کسی درجہ کے لئے تیار نہیں ہے، تو خواہ وہ امام شافعی کے مرتبہ کا ہو، یا سلاطین ایک پیسہ بھی ان پر خرچ کرنا گوارا نہیں کریں گے، اس لئے اس زمانہ میں ان بادشاہوں سے ایسے مال کا قبول کرنا بھی جائز نہیں جس کے متعلق یہ علم ہے کہ وہ حلال ہے، اس لئے کہ اس کے وہ نتائج ہوں گے جن کا اوپر ذکر ہوا ہے، اس مال کا تو کیا ذکر جس کے متعلق معلوم ہے کہ حرام یا مشتبہہ ہے، اب اگر کوئی شخص ان سلاطین کے اموال کو جرات کے ساتھ قبول کرتا ہے، اور صحابہ و تابعین کی مثال دیتا ہے، تو وہ درحقیقت فرشتوں کو لوہاروں پر قیاس کرتا ہے، اس لئے کہ ان کے اموال کو قبول کرنے کے بعد ان سے ملنے جلنے اور اختلاف کی ضرورت پیش آئے گی، ان کا لحاظ کرنا پڑے گا، ان کے اہلکاروں اور عمال کی خدمت کرنا پڑے گی، اور ان سے دینا اور ان کے سامنے جھکنا گوارا کرنا پڑے گا، پھر ان کی تعریف اور ان کے در پر حاضری دینے سے چارہ نہیں، اور یہ سب معصیت کی باتیں ہیں۔

جب گذشتہ بیان سے سلاطین کی آمدنی کے ابواب اور اس میں سے حلال و حرام کی... تفصیل معلوم ہوگی، تو اگر کسی طرح یہ ممکن ہو کہ انسان شاہی رقوم میں سے اتنا جز قبول کرے جو حلال ہے، اور وہ اس کا مستحق ہے، اور وہ رقم اس کے پاس گھر بیٹھے آتی ہو، اور کسی حاکم یا ملازم کی تلاش و خدمت اور ان سلاطین و حکام کی تعریف و تصدیق کی ضرورت بھی نہ ہو، اور نہ ان کی امداد و اعانت کی شرط ہو، تو پھر (مسئلہ کے اعتبار سے) ایسی رقم کا قبول کرنا حرام نہیں ہے، لیکن دوسری خرابیوں اور بعد کے نتائج کے لحاظ سے کمزور ضرور ہے۔

ایک دوسری جگہ سلاطین سے کنارہ کشی اور ان کے افعال و مظالم سے نفرت کی تبلیغ کرتے ہیں:-
 الحالة الثانیة ان يعتزل عنهم فلا يراهم
 ولا يرونه وهو الواجب والسلامة
 فيه فعليه ان يعتقد بغضهم على
 ظلمهم ولا يحب بقائهم ولا يثنى
 عليهم فلا يستخبر عن احوالهم ولا يتقرب
 الي المصلين بهم-
 دوسری حالت یہ ہے کہ انسان ان سلاطین سے الگ
 تھلگ رہے کہ ان کا سامنا ہی نہ ہونے پائے اور یہ واجب
 ہے اور اسی میں حفاظت انسان کو ان کے مظالم کی بنا
 پر ان سے بغض کا اعتقاد رکھنا چاہئے وہ نہ ان کی
 زندگی کا فوہا ہشمن نہ ہونے ان کی تعریف کرنے نہ ان کے
 حالات کی جستجو رکھے نہ ان کے مقربین سے میل جول۔

شخصی سلطنت اور جابر و مستبد بادشاہوں اور خود مختار وزراء و حکام کے اس دور میں کہ جب
 پوری کی پوری قوم اور اس کے بیش قیمت سے بیش قیمت افراد کی زندگی ان کے رحم و کرم پر تھی اور جب شہہ
 پر قتل عام ہو سکتا تھا، امام غزالی کی یہ صاف گوئی اور سلطنت کے نظام مایات، آمد و صرف پر یہ کھلی
 ہوئی تنقید اور علماء کو سلاطین و حکام کے عطیوں کو قبول نہ کرنے کی ترغیب و تبلیغ (جو حکومت سے
 عدم تعاون اور اظہار ناراضگی یا بے تعلقی کی علامت سمجھی جاتی تھی) ایک چھا خاصا جہاد تھا جس کی
 نزاکت کا اندازہ اخبارات اور تقریروں کی آزادی کے اس عہد اور جمہوری اور دستوری (خواہ
 برائے نام) دور میں صحیح طور پر نہیں لگایا جاسکتا۔

امام غزالی نے صرف تحریر و تصنیف پر اکتفا نہیں کی، بلکہ جب ان کو بادشاہ وقت
 سے ملنے کا اتفاق ہوا تو بھرے دربار میں بھی انھوں نے کلمہ حق بلند کیا، ملک شاہ سلجوقی کا
 بیٹا سلطان سنجر لوہے خراسان کا فرمانروا تھا، امام غزالی نے ملاقات کے وقت اس سے
 خطاب کر کے کہا کہ:-

”افسوس کہ مسلمانوں کی گردنیں مصیبت اور تکلیف سے ٹوٹی جاتی ہیں اور تیرے گھوڑوں کی

گردنیں طوقہائے زریں کے بار سے لہے

محمد بن ملک شاہ کو جو سنجر کا بڑا بھائی اور اپنے وقت کا سب سے بڑا بادشاہ تھا، ایک ہدایت نامہ لکھ کر
 بھیجا جس میں اس کو حاکمانہ ذمہ داریوں، خوفِ خدا اور اصلاحِ ملکی کی طرف متوجہ کیا۔

مشرقی سلطنتوں میں عموماً حکومت کا تمام نظم و نسق چونکہ وزراء کے ہاتھ میں ہوتا تھا، اور وہی
 در و بست حکومت کے منتظم اور ذمہ دار ہوتے تھے اس لئے انہی کی اصلاح و توجہ سے مملکت کی اصلاح
 ہو سکتی تھی، امام غزالی اس حقیقت سے واقف تھے اس لئے انھوں نے سلاطین سلجوقیہ سے زیادہ ان کے وزراء
 کی طرف توجہ کی ان کو مفصل خطوط اور ہدایت نامے لکھے اور بڑی جرأت و صفائی کے ساتھ حکومت کی بدظیموں
 حقوق کی پامالی، حکام کی مردم آزاری، اہل کاران دولت کی دولت ستانی، ذمہ داروں کی غفلت کی طرف
 توجہ دلائی اور خدا کا خوف دلا کر اور کچھلے وزراء اور صدور حکومت کا انجام یاد دلا کر اصلاح و تنظیم کی طرف
 متوجہ کیا، ان کے خطوط شخصی جرأت، اظہار حق اور تاثیر و قوت انشاء و تحریر کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔
 فخر الملک کو ایک خط میں لکھتے ہیں:-

”بدان کہ این شہرا ز قحط و ظلم ویران بود و تاخیر تو از اسفرائین و دامنہاں بود ہمہ می ترسیدند و در ہفتان
 از بیم غلہ می فروختند و ظالماں از مظلوماں عذری خواستند اکنون کہ اینجا رسیدی ہمہ ہر اس و خوف بر خاست
 و در ہفتان و خازان بند بر غلہ دوکان نہادند و ظالماں دلگیر شدند اگر کسی کار این شہر بخلاف این
 شکایت می کند دشمن دین تست بدان کہ دعلے مردمان طوس بہ نیکی و بدی مجرب است و عمید را این نصیحت
 بسیار کردم پذیرفت تا حال و مے عبرت ہمہ گشت بشو این سخنہائے تلخ با منفعت از کسی کہ او طبع گاہ خویش را
 بہمہ سلاطین و داع کردہ است تا این سخن می تواند گفت و قدر این بشناس کہ نہ ہمانا از کسے دیگر شنوی

لے مکتوبات امام غزالی ۱۹۱ء سے یہ ہدایت نامہ ایک رسالہ کی شکل میں ہے، اور نصیحت الملوک کے نام سے موسوم ہے

چونکہ محمد شاہ کی زبان فارسی تھی اس لئے یہ کتاب بھی فارسی زبان میں ہے۔

بدانکہ ہر کس کہ خبریں ہی گوید با تو طبع وے حجاب است میان او و کلمہ سہی“
مجمیر الدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

”اما فریاد رسیدن خلق بر عموم واجب است کہ کا ظلم از حد گذشتہ و بعد ازاں کہ من شاہد این حال
می بودم قریب یک سال است کہ از طوس ہجرت کردہ ام تا باشد کہ از مشاہدہ ظالمان بے رحمت
و بے حرمت خلاص یابم چون بحکم ضروری معاودت افتاد ظلم بچنان متواتر است“
پھر وزراء سابقین کا انجام لکھ کر مجیر الدین کو متنبہہ کرتے ہیں۔

”و بحقیقت شناسد کہ ہیچ وزیر بدین بلا مبتلا نبود کہ فے در روزگار ہیچ وزیر آن ظلم و خرابی نہ
رفت کہ اکتوں می رود، و اگرچہ فے کارہ است و لیکن در خبرچین است کہ چون ظالمان را روز قیامت
مواخذہ کنند ہم متعلقان را وہم ایشان را بدان ظلم بگیرند، مسلمانان را کار با ستخوان رسیدت گل گشتند
و ہر دینارے کہ قسمت کردند اضعاف آن از رحمت بشد و بسلاطین زبید و در میانہ ارذال عوامان و
ظالمان ہر دند“

مسلمانوں کے دوسرے طبقے

طبقہ علماء و طبقہ سلاطین و حکام کے علاوہ انھوں نے عام زندگی کا بھی جائزہ لیا ہے، اس میں جس قدر
غیر دینی عناصر بدعات و منکرات، مغالطے اور خود فریبیاں داخل ہو گئی ہیں، ان کی تنقید کی ہے، احیاء العلوم
کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ علمی اشتغال اور عالمانہ زندگی کے باوجود وہ اس وقت کی سوسائٹی اور
عام زندگی سے واقف ہیں، اور ان کا زندگی کا مطالعہ بڑا وسیع اور ہمہ گیر ہے، انھوں نے مسلمانوں کی عمومی
زندگی اور امت کے مختلف طبقات اور ان کی مختلف بیماریاں اور کمزوریوں کی جو نشاندہی کی ہے، اس سے
ان کی قوت مشاہدہ اور قوت نظر کا اندازہ ہوتا ہے، انھوں نے ایک مستقل باب ان منکرات کی تفصیل میں

لکھا ہے، جو عادات میں داخل ہو چکے ہیں، اور لوگوں کو ان کا منکر (خلافت شرع و اخلاق) ہونا محسوس نہیں
ہوتا، اس سلسلہ میں انھوں نے پوری شہری زندگی پر نظر ڈالی ہے، اور اس کے نمایاں منکرات کا تذکرہ کیا ہے، اور
مساجد سے لے کر بازاروں، سڑکوں، حمام اور دعوت کی محفلوں تک کے منکرات کو شمار کر دیا ہے۔

انھوں نے احیاء العلوم کا ایک مستقل حصہ (کتاب فی الغرور) ان لوگوں کے متعلق لکھا ہے جو مختلف قسم کے
مغالطوں اور فریب نفس میں مبتلا ہیں، اس سلسلہ میں انھوں نے ہر طبقہ کے فریب خوردہ اشخاص اور ان کی
غلط فہمیوں اور خود فریبیوں کا حال بیان کیا ہے، اور ان کے بعض ایسے نفسیاتی امراض اور خصوصیات کا
ذکر کیا ہے، جن کو صرف ایک دقیق النظر مصلح اور ایک تجربہ کار ماہر نفسیات ہی دیکھ سکتا ہے، اس باب میں
انھوں نے علماء، عباد و زہاد، امراء و اغنیاء اور اہل تصوف سب کا جائزہ لیا ہے، اور سب کے خصوصی امراض اور
بے اعتدالیوں کا پردہ فاش کیا ہے، اور ہر ایک کے متعلق بڑے پتہ کی باتیں لکھی ہیں، جس سے ان کی ذہانت
دقیقہ رسی اور حقیقت شناسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان کے زمانہ کے علمائے جن جن علوم کے اشتغال میں حد سے تجاوز کر رکھا تھا، مثلاً فقہی جزئیات و
خلائیات علم کلام و مباحثہ و مجادلہ، وعظ و تذکیر، علم حدیث اور اس کے متعلقات نحو، لغت، شعر و مفردات
کی تحقیق و حفظ میں غلو و مبالغہ اور زاہدوں کے ملفوظات و حالات کے یاد رکھنے پر اکتفا، اس سب پر انھوں نے
تنقید کی، اور ان کو اپنے ان مضامین کے بارہ میں جو غلط فہمی اور غوش گمانی تھی، اس کی تحقیق کی، اور حقیقت
حال بیان کی، اور آخر میں اپنا یہ تجربہ بیان کیا، جو بالکل قرن قیاس ہے کہ ”دنیاوی علوم مثلاً طب حساب
اور صنعتوں کے علم میں اس قدر غوش گمانی اور خود فریبی نہیں ہے، جتنی علوم شرعیہ میں ہے، اس لئے کہ کسی شخص کا یہ
خیال نہیں ہے کہ دنیاوی علوم فی نفسہ ذریعہ مغفرت ہیں، بخلاف علوم شرعیہ کے کہ وہ اپنے نتائج و مقاصد
سے قطع نظر کر کے بجائے خود بھی ذریعہ مغفرت و تقرب سمجھے جاتے ہیں، اپنے زمانہ کے عباد و زہاد اور اہل تصوف

کو بھی انھوں نے بڑی گہری نظر سے دیکھا ہے اور ان کی بڑی باریک باریک کوتاہیوں، خوش فہمیوں اور خود فریبیوں کو محسوس کیا ہے ان کے بہت سے ظاہری اعمال و رسوم کی تہ میں ان کو نفس پرستی، جاہ طلبی، ریا کاری، ظاہری نقالی اور بے روح رسمیت نظر آئی ہے اور انھوں نے بڑی صفائی کے ساتھ اس کو ظاہر کر دیا۔ اہل دولت اور اغنیاء پر بھی انھوں نے بڑی صحیح گرفت کی ہے اور اس سلسلہ میں ان کے قلم سے حقائق نکل گئے ہیں، ایک جگہ فرماتے ہیں:-

”ان دولت مندوں میں بہت سے لوگوں کو حج پر روپیہ صرف کرنے کا بڑا شوق ہوتا ہے، وہ بار بار حج کرتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اپنے پڑوسیوں کو بھوکا چھوڑ دیتے ہیں اور حج کرنے چلے جاتے ہیں، حضرت عبداللہ بن مسعود نے صحیح فرمایا ہے کہ اخیر زمانہ میں بلا ضرورت حج کرنے والوں کی کثرت ہوگی، سفر ان کو بہت آسان معلوم ہوگا، روپیہ کی ان کے پاس کمی نہ ہوگی، وہ حج سے محروم و تہی دست واپس آئیں گے، وہ خود ریتوں اور چٹیل میدانوں کے درمیان سفر کرتے ہوں گے، اور ان کا ہمسایہ ان کے پہلو میں گرفتار بلا ہوگا، اس کے ساتھ کوئی سلوک اور غمخواری نہیں کریں گے۔“

ابو نصر تمار کہتے ہیں کہ ایک شخص بشر بن الحارث کے پاس آئے اور کہا کہ میرا قصد حج کا ہے، آپ کا کچھ کام ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ تم نے خرچ کے لئے کیا رکھا ہے؟ اس نے کہا ہاں دو ہزار درہم بشر نے کہا کہ تمہارا حج سے مقصد کیا ہے؟ انہار زہد یا شوق کعبہ یا طلب رضا، اس نے کہا طلب رضا انھوں نے فرمایا کہ اچھا اگر میں تمہیں ایسی تدبیر بتا دوں کہ تم گھر بیٹھے اللہ کی رضا حاصل کر لو، اور تم یہ دو ہزار درہم خرچ کر دو، اور تم کو یقین ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہوگی تو کیا تم اس کے لئے تیار ہو؟ اس نے کہا بخوشی فرمایا کہ اچھا پھر جاؤ، اس مال کو ایسے دس آدمیوں کو دے دو جو مقروض ہیں، وہ اس سے اپنا قرض ادا کر دیں، فقیر اپنی حالت درست کرے صاحب عیال اپنے بال بچوں کا سامان کرے، یتیم کا منتظم یتیم کو کچھ دے کر اس کا دل خوش کرے اور

اگر تمہاری طبیعت گوارا کرے تو ایک ہی کو پورا مال سے آؤ اس لئے کہ مسلمان کے دل کو خوش کرنا، بیکس کی امداد کسی کی مصیبت دور کرنا، کمزور کی اعانت، سونفلی جوں سے افضل ہے، جاؤ جیسا میں تم سے کہا ہے ویسا ہی کر کے آؤ ورنہ اپنے دل کی بات ہم سے کہو، اس نے کہا کہ شیخ سچی بات یہ ہے کہ سفر کا رجمان غالب ہے، بشر سن کر مسکرائے اور فرمایا کہ مال جب گندہ اور مشتبہ ہوتا ہے تو نفس تقاضا کرتا ہے، کہ اس سے اس کی خواہش پوری کی جائے اور وہ اس وقت اعمال صالحہ کو سامنے لاتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے عہد فرمایا ہے کہ صرف متیقن کے عمل کو قبول فرمائے گا۔

دولت مندوں کا ایک گروہ بر بنائے نخل دولت کی حفاظت میں مشغول رہتا ہے، اور ایسی بدنی عبادت سے اس کو دیکھی ہوتی ہے جس میں کچھ خرچ نہیں، مثلاً دن کا روزہ، رات کی عبادت اور تم قرآن وہ بھی فریب میں مبتلا ہیں، اس لئے کہ تہلک نخل ان کے باطن پرستوں ہے اور اس کے ازالہ کے لئے مال کے خرچ کرنے کی ضرورت ہے، لیکن وہ ایسے اعمال میں مشغول ہیں، جس کی ان کو کوئی خاص ضرورت نہیں، اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک شخص کے کپڑے کے اندر سانپ گھس گیا ہے، اور اس کا کام تمام ہونے والا ہے، اور وہ سلنجین کے تیار کرنے میں مشغول ہے تاکہ صفر کو تسکین ہو، حالانکہ جو سانپ کا مارا ہے، اس کو سلنجین کی ضرورت کب پڑے گی؟ بشر سے کسی نے کہا کہ فلاں دولت مند کثرت سے روزہ رکھتا ہے، اور نمازیں پڑھتا ہے، انھوں نے فرمایا کہ بیچارہ اپنا کام چھوڑ کر دوسروں کے کام میں مشغول ہے، اس کے مناسب حال تو یہ تھا کہ بھوکوں کو کھانا کھلاتا، مساکین پر خرچ کرتا، یہ اس سے افضل تھا کہ اپنے نفس کو بھوکا رکھتا ہے اور اپنے لئے (نفلی) نمازیں پڑھتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دنیا بھی سمیٹنے میں مشغول ہے اور فقیر کو محروم رکھتا ہے۔

عوام کے امراض اور خود فریبیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”عوام دولت مندوں اور فقرا میں سے کچھ لوگ ہیں جن کو مجالس و عطا کی شرکت سے دھوکا لگا ہے، ان کا اعتقاد ہے کہ محض ان مجالس میں شرکت کافی ہے، انھوں نے اس کو ایک معمول بنا لیا ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ عمل اور نصیحت پذیری کے بغیر بھی محض مجالس و عطا میں شرکت باعث اجر ہے، وہ بڑے دھوکہ میں مبتلا ہیں، اس لئے کہ مجالس و عطا کی فضیلت محض اس لئے ہے کہ اس سے خیر کی ترغیب ہوتی ہے، اگر اس سے خیر کی آمادگی اور اس کا جذبہ نہیں پیدا ہوتا تو اس میں کچھ خیر نہیں، رغبت بھی اس لئے محمود ہے کہ وہ عمل کی محرک ہے، اگر اس میں عمل پر آمادہ کرنے کی قوت نہیں تو اس میں بھی کوئی خیر نہیں، جو چیز کسی مقصد کا ذریعہ ہوتی ہے اس کی قیمت محض مقصد کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے ہے، اگر وہ مقصد اس سے پورا نہ ہو تو وہ بے قیمت ہے، کبھی واعظ سے مجالس و عطا اور گریہ و بکا کی فضیلتیں سن کر اس کا دھوکا ہوتا ہے، کبھی کبھی اس پر عورتوں کی طرح ایسی رقت طاری ہوتی ہے، اور وہ رونے لگتا ہے، لیکن عزم کا ہمیں پتہ نہیں ہوتا، کبھی کبھی کوئی ڈرنے والی بات سنتا ہے اور وہ تالیاں پیٹتا ہے، اور کہتا ہے، الہی تو بہ! اخیایا تیری پناہ، اور وہ سمجھتا ہے کہ اس نے حق ادا کر دیا، حالانکہ وہ دھوکہ میں ہے، اس کی مثال اس مریض کی سی ہے، جو کسی طبیعے کے مطب میں بیٹھتا ہے، اور نسخے سنتا رہتا ہے، لیکن اس سے اس کو صحت نہیں ہو سکتی، یا ایک بھوکا آدمی کسی سے کھانے کے انواع و اقسام کی فہرست سنتا ہے، اس سے اس کی بھوک نہیں مٹ سکتی، اور اس کا پیٹ نہیں بھر سکتا، اسی طرح سے طاعات و اعمال کی تشریح و تفصیل کا سنتے رہنا اللہ کے یہاں کچھ کام نہیں آئے گا، اسی طرح سے ہر وعظ جو تمہاری حالت میں ایسا تغیر نہ پیدا کرے جس سے تمہارے اعمال میں تغیر ہو جائے، اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف انابت اور رجوع (قوی ہو یا ضعیف) پیدا ہو، اور دنیا سے بے رغبتی اور اعراض پیدا ہو، وہ وعظ تمہارے لئے وبال اور تمہارے خلاف ایک دلیل کا کام دے گا، اگر تم خالی فونی وعظ کو وسیلہ نجات اور ذریعہ مغفرت سمجھتے ہو، دھوکہ میں

ایک اصلاحی و تربیتی کتاب

لیکن احیاء العلوم نری تنقیدی کتاب نہیں ہے، وہ اصلاح و تربیت کی ایک جامع اور مفصل کتاب ہے، اس کے مصنف نے ایک ایسی کتاب تالیف کرنے کی کوشش کی ہے، جو ایک طالب حق کے لئے اپنی اصلاح و تربیت اور دوسروں کی تعلیم و تبلیغ کے لئے تنہا کافی ہو سکے، اور بڑی حد تک ایک وسیع اسلامی کتب خانہ کی قائم مقامی کر سکے، اور دینی زندگی کا دستور العمل بن سکے، اس لئے یہ کتاب عقائد و فقہ، تزکیہ نفس و تہذیب خلاق اور حصول کیفیت احسانی (جس کے مخصوص نام تصوف ہے) تینوں شعبوں کی جامع ہے، اس کتاب کی ایک نمایاں صفت اس کی تاثیر ہے، مولانا شبلی کے اس تاثر میں ہزاروں پڑھنے والے شریک ہوں گے کہ ”احیاء العلوم“ میں یہ عام خصوصیت ہے کہ اس کے پڑھنے سے دل پر عجیب اثر ہوتا ہے، ہر فقرہ نشتر کی طرح دل میں چھب جاتا ہے، ہر بات جادو کی طرح تاثیر کرتی ہے، ہر لفظ پر وجد کی کیفیت طاری ہوتی ہے، اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہ کتاب جس زمانہ میں لکھی گئی، خود امام صاحب تاثیر کے نشہ میں سرشار تھے، مصنف کے ان حالات و کیفیات کا (جو اس سفر اور کتاب کی تصنیف کے زمانہ میں ان پر طاری تھیں، اور جن سے یہ کتاب متاثر ہوئی ہے) پڑھنے والوں پر بعض اوقات یہ اثر پڑتا ہے کہ دل دنیا سے بالکل اچاٹ ہو جاتا ہے، زہد و تقشف کا ایک شدید اور بعض اوقات غیر معتدل رجحان پیدا ہوتا ہے، خوف و ہیبت کی ایسی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، جو کبھی کبھی صحت و مشاغل پر اثر انداز ہوتی ہے، یہ اس کا نتیجہ ہے کہ خود مصنف پر اس کتاب کی تصنیف کے زمانہ میں ہیبت کا غلبہ تھا، اس لئے ہیبت سے مشائخ مبتدلوں کو اس کتاب کے مطالعہ کا مشورہ نہیں دیتے، اعتدال کامل اور توازن صحیح تو صرف سیرت نبویؐ اور احادیث سے امام غزالی چونکہ شافعی ہیں اور فقہ شافعی کا اس زمانہ میں زور بھی تھا، اس لئے اس کتاب میں انھوں نے فقہ شافعی ہی کو

کے مجموعہ کے مطالعہ اور کسی نمونہ کا دل کی صحبت و تربیت ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

اجیاء العلوم اور فلسفہ اخلاق

امام غزالی صرف ایک بلند پایہ فقیہ ایک صاحب جہاد متکلم اور ایک صاحب دل صوفی نہیں ہیں، اخلاقیات اسلامی اور فلسفہ اخلاق کے ایک نامور مصنف اور ایک دقیق النظر اور نکتہ رس ماہر اخلاق و نفسیات بھی ہیں، اخلاق اسلامی اور فلسفہ اخلاق کی کوئی تاریخ ان کے تذکرہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی، اجیاء العلوم اس موضوع پر بھی ان کا ایک کارنامہ ہے، امراض قلب اور کیفیات نفسانی پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ ان کی وقت نظر اور سلامت فکر کا نمونہ ہے، یہاں اس کا بھی ایک نمونہ پیش کیا جاتا ہے۔

حب جاہ

اجیاء العلوم میں "بیان سبب کون الجاہ محبوباً بالطبع حتی لا یخلو عنہ قلب الا بشدید المجاہدۃ" (جاہ انسان کو کیوں طبعی طور پر محبوب ہے، یہاں تک کہ شدید مجاہدہ کے کسی قلب کا بھی اس سے خالی ہونا مشکل ہے) کے عنوان سے تحریر فرماتے ہیں:-

"معلوم ہونا چاہئے کہ جس بنا پر سونا چاندی اور مال کی بقیہ اقسام محبوب ہیں، بعینہ اسی بنا پر جاہ بھی محبوب ہوتا ہے، بلکہ جس طرح سونا چاندی سے زیادہ محبوب ہے، خواہ وہ مقدار میں برابر ہی کیوں نہ ہوں، اسی طرح جاہ کو مال پر فوقیت حاصل ہونا چاہئے، یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ درہم و دینار کی ذات میں کوئی کشش اور معنویت نہیں، اس لئے نہ وہ کھانے کے کام کے ہیں، نہ پینے کے، نہ شادی بیاہ کے، نہ پوشاک لباس کے، اپنی

لے ملاحظہ ہو ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ استاد جامعہ القاہرہ کی تصنیفات "تاریخ الاخلاق" اور "فلسفۃ الاخلاق"

وصلاتہا بالفلسفۃ الغریبیۃ"

ذات کے لحاظ سے تو وہ اور تکبیاں برابر ہی ہیں، لیکن ان دونوں میں کشش اور محبوبیت محض اس بنا پر ہے کہ وہ محبوبات کا ذریعہ اور خواہشات کی تکمیل کا سامان ہیں، یہی معاملہ جاہ کا ہے، اس لئے کہ جاہ دلوں کی تسخیر کا نام ہے، اور جس طرح سے سونے چاندی کی ملکیت ایسی قدرت عطا کرتی ہے جس سے انسان اپنے تمام اغراض و مقاصد تک پہنچ سکتا ہے، اسی طرح سے بندگان خدا کے قلوب کی تسخیر تمام اغراض و مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ ہے، اسی بنا پر سونا چاندی اور جاہ انسان کو محبوب ہے۔

لیکن محبوبیت میں شریک ہونے کے ساتھ جاہ کو مال پر کئی وجوہ سے ترجیح حاصل ہے، اور اس کی محبوبیت مال کی محبوبیت سے کہیں بڑھی ہوئی ہے، اس کے تین نمایاں اسباب ہیں، پہلا سبب تو یہ ہے کہ جاہ کے ذریعہ سے مال تک پہنچنا، مال کے ذریعہ سے جاہ تک پہنچنے کے مقابل میں آسان ہے، کھلی ہوئی بات ہے کہ ایک عالم یا زاہد جس کا اعتقاد لوگوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا ہے، اگر مال حاصل کرنا چاہے تو اس کے لئے کوئی بڑی بات نہیں اس لئے کہ لوگوں کے مال و دولت ان لوگوں کے دلوں کے تابع ہوتے ہیں، اب اگر ان کے دل کسی کے تابع ہو جائیں تو ان کے مال بھی اسی کے تابع ہو جائیں گے، اور وہ اپنی دولت بھی اسی کے قدموں پر نثار کر دیں گے، اس کے برخلاف ایک کم مرتبہ اور ذلیل آدمی جس میں کمال کی کوئی صفت نہیں ہے، اگر اس کو کوئی خزانہ بھی مل جائے اور اس کو وہ جاہ حاصل نہیں ہے، جس سے وہ اپنے مال کی حفاظت کر سکے، اگر اس مال کے ذریعہ جاہ تک پہنچنا چاہے گا تو نہیں پہنچ سکے گا، اس لئے کہ جاہ مال کا آلہ اور وسیلہ ہے، جو جاہ کا مالک ہے، وہ باسانی مال کا بھی مالک بن سکتا ہے، لیکن جو مال کا مالک ہے، وہ ہر حالت میں جاہ کا مالک نہیں بن سکتا، اس لئے جاہ مال سے زیادہ محبوب ہوا۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ مال کے لئے ہر وقت خطرہ ہے کہ وہ کسی آزمائش میں آجائے، چوری یا غصے کے ذریعہ تلف ہو جائے، یا دشادہ اور ظالم بھی اس کی تاک میں لگے رہتے ہیں، یوں بھی اس کو محاسنوں، پہرہ داروں اور محفوظانہ قوتوں کی ضرورت ہے، پھر بھی اس کے لئے ہزار خطرے ہیں، لیکن دل جب کسی کا غلام بن جائے

توان کے لئے کوئی آفت نہیں وہ دراصل محفوظ خزانے ہیں جو چوروں غارت گروں اور غاصبین کی دست رس سے باہر ہیں ملکیتوں میں سب محفوظ ملکیت زمین اور جائداد ہے، لیکن اس میں بھی غاصبانہ اور ظالمانہ کارروائیوں کا خطرہ ہے اور پیرہ اور حفاظت کی اس کو بھی ضرورت ہے، لیکن دلوں کے خزانے خود ہی محفوظ و مامون ہیں اور جاہ کو کسی غصب سرفہ کا خطرہ نہیں ہاں دلوں پر بھی تھوڑا بہت تصرف کیا جاسکتا ہے اور جس سے عقیدت مندی ہے اس کی طرف سے اعتقاد پھیرا جاسکتا ہے اور بدگمانی پیدا کی جاسکتی ہے، لیکن اس کا ازالہ مشکل نہیں اور ایسا عمل ہر ایک کے لئے آسان نہیں۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ قلوب کی ملکیت میں از دیاد و نمو اور اضافہ ہوتا رہتا ہے اور اس کے لئے کسی محنت و جفاکشی کی ضرورت نہیں اس لئے کہ قلوب جب کسی شخص کے علم یا عمل کی وجہ سے اس کے حلقہ گموش اور مقصد ہو جاتے ہیں تو زبانیں اس کے کلمات کا کلمہ پڑھنے لگتی ہیں لوگ و مسروں سے اس کا تذکرہ کرتے ہیں اور نئے نئے دل اس کے مفتوح ہوتے جاتے ہیں، اسی بنا پر انسان طبعی طور پر شہرت اور ناموری کا دلدادہ ہے اس لئے کہ جب اس کا چرچا دوسرے شہروں اور ملکوں میں ہوتا ہے، نئے نئے دل نکار ہوتے ہیں اور اس کے حلقہ گموش بنتے ہیں، اسی طرح اس کی محبت و عظمت ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہوتی اور بڑھتی رہتی ہے اور کہیں جا کر کئی نہیں بر خلاف مال کے کہ جو جتنی مقدار کا مالک ہے اس کا مالک ہے اس میں بغیر سمحت و محنت اور جانفشانی کے اضافہ نہیں ہو سکتا، لیکن جاہ خود بخود نمود پذیر ہے اور اس کی کوئی حد نہیں مال میں ٹھہراؤ اور وقوف ہے، جاہ پھلتا پھولتا رہتا ہے، اسی لئے جب جاہ میں ترقی ہو جاتی ہے اور شہرت عام حاصل ہو جاتی ہے اور لوگ کسی شخص کی تعریف میں رطب اللسان ہوتے ہیں تو مال دولت اس کی نظر میں ہیچ ہو جاتا ہے، یہ تو مال کی جاہ پر ترویج کے نمایاں اسباب ہیں اگر تفصیل کی جائے تو اور بہت سے وجوہ نکلیں گے۔

اگر کوئی شخص کہے کہ اس تقریر کا نتیجہ تو یہ ہے کہ انسان کو مال و جاہ سے اسی قدر محبت ہونی

چاہئے کہ ان کے ذریعہ لذتیں حاصل کر کے اور کلفتیں دور کر دے، اس لئے کہ مال و جاہ محبوبہ کا ذریعہ ہیں اور محبوبات کے حصول کا ذریعہ بھی محبوب ہوتا ہے، لیکن اس کی کیا وجہ ہے کہ بات یہیں جا کر نہیں رکتی اور انسان اموال کے جمع کرنے، خزانہ پر خزانہ اور ذخیرہ پر ذخیرہ کرنے میں مصروف رہتا ہے، یہاں تک کہ وہ ضروریات کی سرحد کو بھی پار کر جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کا وہ حال ہو جاتا ہے (جو حدیث شریفہ میں بیان کیا گیا ہے) کہ اگر بندے کے پاس سونے کی دو گھاٹیاں ہوں تو وہ تیسری کا خواہشمند ہوگا اسی طرح سے انسان جاہ میں وسعت و ترقی کی فکر میں رہتا ہے اور اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی شہرت ان دور دراز ملکوں تک بھی پہنچ جائے، جن کے متعلق وہ قطعی طور پر جانتا ہے کہ وہ ان ملکوں میں کبھی قدم بھی نہیں رکھے گا، اور کبھی وہاں کے رہنے والوں سے ملاقات کی بھی امید نہیں کہ ان کی تعظیم سے اس کو خوشی حاصل ہوگی یا وہ اپنی دولت اس پر خرچ کریں گے، یا اس کی غرض برآری کریں گے، یہ سب جانتے ہوئے بھی اس کو اس بڑی خوشی حاصل ہوتی ہے اور دل میں اس کا مزہ لیتا رہتا ہے کہ اس کا ان ملکوں میں چرچا ہو، اور اس کو وہاں جاہ حاصل ہو، بظاہر یہ ایک حماقت کی بات معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ یہ ایک ایسی چیز کی خواہش ہے جس کا دنیا آخرت میں کوئی فائدہ نہیں آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ واقعی جاہ کی ایسی محبت دلوں کی ایک عمومی کیفیت ہے جس کا ازالہ ممکن نہیں اس کے دو سبب ہیں، ایک علی جنس کا ادراک سب کر سکتے ہیں ایک یعنی جو بڑا سبب ہے لیکن اتنا نازک ہے کہ غیبی تو غیبی ذکی بھی اس کو بمشکل محسوس کر سکتے ہیں، اس لئے کہ اس کا تعلق نفس و طبیعت کی ایک ایسی خاصیت ہے جس کا علم ہر ایک میں اور ان اشخاص کو ہے جو طبائع انسانی کی گہرائیوں میں غوطہ کھا سکتے ہیں پہلا سبب تو یہ ہے کہ انسان فطرۃً محبوب کے بارہ میں بدگمان واقع ہوا ہے اور خطرات کو دور کرنا چاہتا ہے

عشق است و ہزار بدگمانی

انسان کی بسر اوقات کے لئے خواہ ضروری سامان موجود ہو، لیکن اس کی آرزوئیں بہت

طویل ہوتی ہیں اس کے دل میں بار بار خطرہ گذرتا ہے کہ جو مال فی الحال اس کی ضروریات کے لئے کافی ہے شاید تلف ہو جائے اور اس کو دوسرے مال کی ضرورت ہو جب اس کے دل میں اس کا خیال آتا ہے تو اس کے دل میں فکر و غم کا جوش اٹھتا ہے، خیلش اس کی بھی دور ہو سکتی ہے جب اس کو دوسرے مال کے مل جانے سے اطمینان حاصل ہو جائے کہ اگر یہ پہلا مال ضائع ہو گیا، یا اس پر کوئی آفت آئی تو یہ دوسرا مال موجود ہے، اپنی ذات سے بچھی اور زندگی کی محبت کی بنا پر اپنی زندگی کا بہت طویل اندازہ لگاتا ہے اور نئی نئی ضرورتوں کے پیش آنے کا حتی رکھتا ہے اور نئے نئے خطروں اور نئی نئی آفتوں کو فرض کرتا رہتا ہے اور ان کے تصور سے لرزہ براندام رہتا ہے، اس لئے ان خطروں کو زائل کرنے کے وسائل سوچتا رہتا ہے، اور اس کا سب سے بڑا وسیلہ اس کی نظر میں یہ ہے کہ مال اتنا کثیر ہو کہ اگر اس کے کسی حصہ پر کوئی زد پڑے تو دوسرے حصہ سے وہ اپنا کام نکال سکے، یہ خوف اور فکر مندی اس کو مال کی کسی مخصوص مقدار پر قانع نہیں ہونے دیتی، اور وہ کسی حد پر بھی جا کر نہیں ٹھہرتا یہاں تک کہ ساری دنیا کو اپنی ملک بنا لینے کی ہوس پیدا ہو جاتی ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ”دو حریص ایسے ہیں، جو کبھی سیر نہیں ہوتے، علم کا حریص، اور مال کا حریص“ بعینہ یہی علت دور دراز کے شہروں اور بیگانہ لوگوں کے دلوں میں اعتقاد اور جاہ پیدا ہونے کی خواہش میں ہوتی ہے، حسب جاہ کامرین بھی ان خیالی خطرات کو سوچتا رہتا ہے، جو پیش آسکتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ اس کو اپنے وطن کو خیر باد کہنا پڑے، ممکن ہے کہ دوسرے ملکوں کے لوگ اس کے شہر میں آجائیں اور اس کو ان سے کام پڑ جائے، اور جب تک یہ سب کچھ ممکن ہے اور یہ کوئی ناممکن الوقوع بات نہیں ہے کہ اس کو ان کی ضرورت پڑے، نفس کو اس بات کی فرحت و لذت ہوتی ہے کہ اس کا اعتقاد اور عظمت ان بعید الوطن لوگوں کے دل میں قائم ہے جن سے کبھی کام پڑ سکتا ہے۔

دوسرا سبب جو زیادہ طاقت ور ہے، وہ یہ کہ روح ایک مرربانی ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہے
 ”وَيَسْئَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي“ حکم ربانی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ علوم
 مکاشفہ کے اسرار میں سے ہے، اور اس کے اظہار کی اجازت نہیں، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی
 حقیقت کا اظہار نہیں فرمایا، لیکن اس کی حقیقت کا علم حاصل کئے بغیر بھی تم کو اتنا معلوم ہو سکتا ہے کہ
 قلب میں ایک تو بہسی صفات (کھانے پینے اور جماع) کا میلان پایا جاتا ہے، ایک میلان درندوں کی صفات
 قتل و ضرب و ایذا کا، اور ایک شیطانی صفات کمر و فریب کا اور اسی کے ساتھ ایک میلان صفار بوبیت
 کبر و عظمت، عزت و تبحر اور سر بلندی کا بھی پایا جاتا ہے، اس لئے کہ قلب انسانی مختلف اصول و عناصر
 سے مرکب ہے، جن کی شرح و تفصیل میں بڑی طوالت ہے، قلب میں امر ربانی کا جو حصہ ہے، اس کی بنا پر انسان
 کے اندر طبعی طور پر بوبیت کی خواہش پائی جاتی ہے، بوبیت کیا ہے؟ کمال میں کیتائی اور مستقل وجود جو
 کسی کا شرمندہ احسان نہ ہو، اس لئے کمال صفات الوہیت میں سے ہے، اور وہ انسان کو باطبع محبوب ہے
 اور کمال یہی ہے کہ وجود میں کیتا ہو، اس لئے کہ وجود میں کسی اور کی شرکت یقیناً ایک نقص ہے، آفتاب کا
 کمال یہ ہے کہ وہی ایک آفتاب ہے، اگر کوئی دوسرا آفتاب ہوتا، تو یہ اس آفتاب کے چہرہ کمال کے لئے داغ
 ہوتا، اس لئے کہ وہ اپنی شان آفتابی میں کیتا نہ ہوتا اور وجود کی کیتائی اللہ تبارک تعالیٰ ہی کو حاصل
 ہے، اس لئے اس کے سامنے کوئی موجود (حقیقی) نہیں، اس کے علاوہ جو کچھ بھی ہے، وہ اس کی قدرت کا
 ایک کرشمہ ہے، جو اپنے بل بوتے پر نہیں رہ سکتا، وہ اسی کے سہارے قائم ہے، تو درحقیقت اس کے
 سامنے کوئی موجود ہی نہیں، اس لئے کہ محبت کے لئے رتبہ کی مساوات ضروری ہے، اور رتبہ کی مساوات
 کمال کے لئے نقص ہے، کامل وہی ہے، جس کا کوئی ہم مرتبہ نہ ہو، اور جس طرح سے آفتاب کے نور کی تابش
 آفاق عالم میں آفتاب کا نقص نہیں بلکہ اس کا کمال ہے، آفتاب کے لئے نقص تو دوسرے ہم مرتبہ آفتاب کا
 وجود ہے، جبکہ اس کی ضرورت بھی نہیں، اسی طرح سے عالم میں ہر چیز کا وجود انوار قدرت کی تابش کا فیضان

ہے یہ سب تاج ہیں، منبوع نہیں، پس ربوبیت کی شان وجود کی یکتائی ہے اور یہی کمال ہے انسان بھی بالطبع اس بات کا خواہشمند ہے کہ وہ کمال میں یکتا ہو، بعض مشائخ صوفیہ نے فرمایا ہے کہ ہر انسان کے باطن میں وہی بات مضمر ہے جس کو فرعون نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ "اَنَا رَبُّكُمْ الْأَعْمَلُ" لیکن اس کو اس کا موقع نہیں ملتا، عبودیت نفس اسی لئے نفس پر شاق اور ربوبیت اسی لئے طبعاً سہل اور مرغوب ہے یہ اسی نسبت ربانی کی وجہ سے ہے جس کی طرف "قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي" میں اشارہ ہے۔

لیکن جب انتہائے کمال تک پہنچنے سے عاجز رہا تو اس کے کمال کی خواہش بالکل زائل نہیں ہوئی، اب بھی وہ کمال کا خواہشمند اور متمنی ہے اور اس کو کمال سے بالذات لذت حاصل ہوتی ہے، کمال کے علاوہ کسی اور مقصود کی خاطر نہیں (جس کا کمال ذریعہ ہے) بلکہ نفس کمال کی خاطر دنیا میں جو کبھی موجود ہے، اس کو اپنی ذات سے محبت اور اپنی ذات کے کمال سے محبت اور ہر ایک کو ہلاکت اور فنا مرغوب ہے، اس لئے کہ اس میں اپنی ذات اور اپنی صفات کمال کا فنا سمجھتا ہے، کمال تو یہی ہے کہ وجود میں یکتائی حاصل ہو اور تمام موجودات پر غلبہ اور حکمرانی، اس لئے کہ کامل ترین کمال یہ ہے کہ دوسرے کا وجود تمہارا ہی رہن منت ہو، اگر وہ تمہارا رہن منت نہیں ہے تو کم از کم اتنا ہو کہ تم اس پر غالب ہو، اس بنا پر سب پر غلبہ حاصل کرنا انسان کو طبعی طور پر محبوب ہے، اس لئے کہ یہ کمال کی ایک قسم ہے، ہر موجود جو اپنی ذات کا شناسا ہے، وہ اپنی ذات کا عاشق ہے، اور اپنی ذات کے کمال کا بھی عاشق ہے، اور اس سے اس کو لذت حاصل ہوتی ہے، اگر کسی چیز پر غلبہ کے معنی میں کہ تم اس پر اثر ڈال سکو اپنے ارادہ کے مطابق اس میں تغیر کر سکو اور اپنی مرضی کے مطابق اس میں تصرف کرو، انسان چاہا تو یہ تھا کہ اس کو تمام موجودات پر غلبہ حاصل ہو جائے لیکن موجودات میں کچھ موجود ایسے ہیں جو

لے مولانا روم نے اس مضمون کو بیان کیا ہے:-

نفس مارا کمتر از فرعون نیست / ایک اور اعون مارا اعون نیست

کسی تغیر کو قبول نہیں کرتے، جیسے اللہ کی ذات و صفات اور بعض موجود ایسے ہیں جو تغیر کو قبول کرتے ہیں، لیکن ان پر مخلوق کی کوئی دست رس نہیں، اور اس پر ان کا کوئی زور نہیں چلتا، جیسے افلاک کو اکب، ملکوت، سماوا، نفوس، ملائکہ، جن و شیاطین اور جیسے پہاڑ و سمندر اور ان کے بیچ کی چیزیں، تیسری قسم وہ ہے جس میں انسان اپنی قدرت سے تغیر کر سکتا ہے، جیسے زمین اور اس کے اجزا اور معدنیات، نباتات، حیوانات اور انہی میں سے انسانوں کے دل بھی ہیں، جو بدن ہی کی طرح تاثر اور تغیر قبول کرتے ہیں، جب موجودات کی ایک قسم وہ ہوئی جن پر انسان تصرف کی قدرت رکھتا ہے، جیسے ارضیات اور ایک وہ جن پر قدرت نہیں رکھتا، جیسے ذات الہی، ملائکہ، افلاک، تو انسان کے اندر اس کی خواہش پیدا ہوئی کہ وہ کم سے کم آسمانوں کا زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرے، ان کی حقیقت کو سمجھے، اور ان کے اسرار کو فاش کرے، اس لئے کہ یہی ایک طرح کا غلبہ ہے، اس لئے جس کا پورا پورا علم حاصل ہو جاتا ہے، وہ علم کے ماتحت ہو جاتا ہے، اور عالم ایک طرح سے غالب کی شان رکھتا ہے، (گویا اس علم سے اس کے جذبہ حکومت و استعلاء کی کسی درجہ میں تسکین ہوتی ہے) اسی بنا پر اس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت، ملائکہ، افلاک، کو اکب، عجائب، سموات، سیاروں اور سمندروں کے عجائبات وغیرہ کے علم کا شوق ہوتا ہے، اس لئے کہ یہ ایک طرح کا تغلب ہی اور تغلب کمال کی ایک قسم ہے، اسی بنا پر تم دیکھتے ہو گے کہ جو شخص کوئی عجیب چیز بنا نہیں سکتا، وہ کم سے کم اس کے بنانے کا طریقہ جاننے کا خواہشمند ہوتا ہے، (گویا اس طرح سے وہ صنعت کی خواہش کی تسکین کرتا ہے) جو شرط نچ وضع کرنے سے عاجز ہے، وہ کم سے کم شرط نچ کھیلنے کا طریقہ سیکھ لینا چاہتا ہے، اور یہ جاننا چاہتا ہے کہ شرط نچ کیسے بنائی گئی ہے، جو شخص کسی ہندسہ یا شعبہ یا جراثیم کے آئے کو دیکھتا ہے، اور وہ محسوس کرتا ہے کہ وہ ایسا آکر بنانے سے قاصر ہے، تو وہ اس کے بنانے کی کیفیت جاننا چاہتا ہے، اس کو اپنے اس عجز سے تکلیف اور علم کے کمال سے لذت حاصل ہوتی ہے، گویا وہ اس کی کمی اس سے پوری کرنا چاہتا ہے۔

دوسری قسم جس پر انسان قدرت حاصل کر سکتا ہے، جیسے ارضیات وغیرہ تو وہ طبعی طور پر ان پر غلبہ اور اتنی قدرت حاصل کرنا چاہتا ہے کہ ان میں اپنی غشاہ کے مطابق تصرف کر سکے، ان کی بھی دو قسمیں ہیں، اجسام اور ارواح، اجسام تو روپیہ پھیساں ہے، ان کے بارہ میں تو انسان یہ چاہتا ہے کہ اس کو ان میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار ہو، وہ ان کو اٹھا بٹھا سکے، جس کو چاہے دے جس کو چاہے نہ دے، اس لئے کہ یہ قدرت ہے، اور قدرت کمال ہے، اور کمال صفات ربوبیت میں سے ہے اور ربوبیت بالطبع محبوب، اسی لئے اس کو اموال کی محبت، چاہے اس کو اپنے پہننے کھانے اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے کبھی بھی اس کی ضرورت نہ ہو، اسی طرح سے غلام رکھنا، اور آزاد شریف لوگوں کو اپنا غلام بنانا خواہ زبردستی اور غلبے سے ہو، یہاں تک کہ ان کے اجسام اور ان کی ذات میں تصرف کر سکے، یعنی بیکارے سکے، چاہے ان کے دل غلام نہ بنیں، اس لئے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ان غلاموں کے دل میں اس کا اعتقاد نہیں ہوتا، اور ان کو اس سے محبت نہیں ہوتی، لیکن کبھی محض غلبے کی محبت کا قائم مقام بن جاتا ہے، انسان کو ایسا عیب اب بھی لذت اور عزیز ہے، جو زبردستی کی بنا پر ہو، اس لئے کہ اس میں قدر کا اظہار ہوتا ہے اور انسان اس کا دیوانہ ہے۔

دوسری قسم آدمیوں کے نفوس اور قلوب ہیں، اور یہ روعے زمین کی سب سے زیادہ بیش قیمت اور نفیس چیز ہے، اور انسان چاہتا ہے کہ اس کو ان قلوب پر غلبہ و قدرت حاصل ہو جائے تاکہ وہ اس کے لئے مسخر ہو جائیں، اور اس کے ایک اشارہ پر کام کریں، اس لئے کہ اس میں غلبہ کمال پایا جاتا ہے، اور صفات ربوبیت سے مشابہت ہے، قلوب صرف محبت سے مسخر ہوتے ہیں اور محبت کمال کے اعتقاد سے پیدا ہوتی ہے، اس لئے کہ ہر کمال محبوب ہے، اور کمال اس لئے محبوب ہے کہ وہ صفا الہیہ میں ہے، اور صفا الہیہ انسان کو بالطبع محبوب ہے، اس لئے کہ انسان میں ایک نسبت ربانی پائی جاتی ہے، اور یہ نسبت غیر فانی ہے، نہ موت اس کو ختم کر سکتی ہے، اور نہ مٹی اس پر قابو پا سکتی ہے، یہی نسبت ربانی ایمان و معرفت کا محل ہے، وہی بقائے الہی تک پہنچنے والی ہے، اور وہی اس کے لئے کوشش کرنے والی ہے، جاہ کے معنی قلوب کا مسخر ہونا ہے، اور جس کے لئے قلوب مسخر

ہو گئے، اس کو ان پر قدرت و استیلا حاصل ہو گیا، اور قدرت و استیلا کمال ہے، اور کمال اوصاف ربوبیت میں سے ہے، پس قلب کو جو چیز بالطبع محبوب ہے، وہ کمال ہے، خواہ علم سے حاصل ہو، خواہ قدرت سے، مال و جاہ بھی اسباب قدرت میں ہیں، اس لئے کہ وہ محبوب و سلیم ہیں، اور محبوب کا وسیلہ بھی محبوب ہوتا ہے، پھر نہ معلوم کی کوئی انتہا ہے، نہ مقدرات کی کوئی انتہا ہے، اور جب تک کہ ایک چیز بھی دنیا میں باقی ہے، جو معلوم کی جا سکتی ہے، اور ایک چیز بھی دنیا میں موجود ہے، جس پر قدرت حاصل کی جا سکتی ہے، تو نہ شوق کو سکون، اور نہ نقص کو زوال، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دو چیزیں کبھی آسودہ نہیں ہو سکتے،

محاسبہ نفس

کتاب کا موثر ترین حصہ وہ ہے، جہاں امام غزالی نصیحت اور ترغیب و ترہیب پر قلم اٹھاتے ہیں، اور دنیا کی بے ثباتی، آخرت کی عظمت، ایمان و عمل صالح کی ضرورت، اصلاح و تہذیب نفس کی اہمیت اور امراض قلبی و نفسانی کی مضرت کی طرف توجہ دلاتے ہیں، اس موقع پر وہ بیک وقت ایک شیوہ بیان، اعجاز ایک نکتہ شناس حکیم اور ایک تجربہ کار و ماہر نفسیات معالج کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں، جو اپنے مخاطبین کے حالات اور کمزوریوں اور ضرورتوں سے خوب واقف ہے، وہ ان کی طرف سے ان سے بہتر و کالت کرتا ہے، اور بڑی قابلیت اور انصاف کے ساتھ ان کے عذر اور دلائل پیش کرتا ہے، پھر ایک ماہر مقلق و عالم نفسی کی طرح ان میں سے ایک ایک کا جواب دیتا ہے، پھر ایک شفیق معالج اور ایک خیر خواہ مری کی طرح ان کا علاج تجویز کرتا ہے، اس لئے ان کے مواعظ صرف و اعظانہ تاثیر ہی کا نمونہ نہیں، حکمت و بلاغت کا بھی نمونہ ہیں، ہر دور میں ہزاروں آدمیوں نے ان کے مواعظ و مکالمات سے فائدہ اٹھایا ہے، اور کثیر التعداد آدمیوں کی اصلاح و انقلاب کا ذریعہ بنے ہیں، کتاب کے آخری چوتھے حصہ (ربیع رابع) میں اس کا بڑا ذخیرہ ہے، یہاں اس کا ایک قبلا

پیش کیا جاتا ہے، جہاں انہوں نے نفس کو زبرد تو بیچ کی ہے اور پڑھنے والوں کو تعلیم دی ہے کہ ان کو اپنے نفس سے کس طرح مکالمہ کرنا چاہئے اور منزلِ آخرت کے لئے کس طرح اس کو تیار کرنا چاہئے۔ المرابطۃ السادسة فی توبیح النفس و معاتبہا "عنوان کے تحت نفس سے مکالمہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:-

• اے نفس ذرا انصاف کر اگر ایک یہودی تجھ سے کہہ دیتا ہے کہ فلاں لذیذ ترین کھانا تیرے لئے مضر ہے تو تو صبر کرتا ہے اور اسے چھوڑ دیتا ہے اور اس کی خاطر تکلیف اٹھاتا ہے، کیا انبیاء کا قول جن کو معجزات کی تائید حاصل ہوتی ہے اور فرمان الہی اور صحفِ سماوی کا مضمون تیرے لئے اس سے بھی کم اثر رکھتا ہے، جتنا کہ اس یہودی کا ایک قیاس و اندازہ، عقل کی کمی اور علم کی کمی اور کوتاہی کے ساتھ تعجب ہے اگر ایک بچہ کتا ہے کہ تیرے کپڑوں میں بچھو ہے تو بغیر دلیل طلب کیے اور سوچے سمجھے اپنے کپڑے اتار پھینکتا ہے، کیا انبیاء علماء اولیاء اور حکماء کی متفقہ بات تیرے نزدیک اس بچہ کی بات سے بھی کم وقعت رکھتی ہے؟ یا جہنم کی آگ اس کی بیڑیاں، اس کے گرز اس کا عذاب اس کا زقوم، اور اس کے آنکڑے، اس کے سانپ، بچھو اور زہریلی چیزیں تیرے لئے ایک بچھو سے بھی کم تکلیف دہ ہیں جس کی تکلیف زیادہ سے زیادہ ایک دن یا اس سے کم رہتی ہے، عقلمندوں کا شیوہ نہیں، اگر کہیں بہائم کو تیری حالت کا علم ہو جائے تو وہ تجھ پر ہنسیں اور تیری دانائی کا مذاق اڑائیں، پس اگر اے نفس! تجھ کو یہ سب چیزیں معلوم ہیں اور ان پر تیرا ایمان ہے تو کیا بات ہے کہ تو عمل میں تساہل اور ٹال مٹول سے کام لیتا ہے حالانکہ موت کمین گاہ میں منتظر ہے کہ وہ بغیر مہلت کے تجھے اُچکے جائے اور فرض کر کہ تجھے سو برس کی مہلت بھی مل گئی ہے تو کیا تیرا خیال ہے کہ جس کو ایک گھاٹی طے کرنی ہے اور وہ اس گھاٹی کے نشیب میں اطمینان سے اپنے جانور کو کھلا رہا ہے وہ کبھی بھی اس گھاٹی کو طے کر سکے گا، اگر تو یہ گمان رکھتا ہے تو تو کس قدر نادان ہے ایسے شخص کے بارہ میں تیری کیا رائے ہے جو علم حاصل کرنے کی غرض سے پردیس کا سفر کرتا ہے اور وہاں کسی سال بیکاری اور تعطیل میں گزار دیتا ہے اس خیال سے کہ وطن کی واپسی کے سال سب علم حاصل کرے گا، تو اس کی عقل پر ہنستا ہے اور اس کے

اس وہم کا مذاق اڑاتا ہے کہ علم و تفقہ اتنی قلیل مدت میں حاصل ہو جائے گا، یا اقتضا کا منصب بغیر علم و تفقہ کے توکل کی برکت سے ہاتھ آجائے گا، پھر اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ آخر عمر کی کوشش مفید ہوتی ہے اور بلند درجات تک لے جاتی ہے، تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہی آج کا دن تیری عمر کا آخری دن ہو تو اس دن تو اس کام میں کیوں مشغول نہیں ہوتا، اگر اللہ تعالیٰ نے تجھے بتلا بھی دیا ہے کہ تجھے مہلت دے دی گئی ہے، تو پھر بھی عجلت کرنے سے کیا چیز مانے ہے اور آج کل، آج کل، کرنے کی کیا وجہ ہے، یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ تجھے اپنی خواہشات نفس کی مخالفت مشکل معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اس میں محنت و مشقت ہے، کیا تو اس دن کا منتظر ہے، جب خواہشات کی مخالفت تیرے لئے آسان ہو جائے گی، ایسا دن تو اللہ تعالیٰ نے مطلق پیدا ہی نہیں کیا اور نہ پیدا کرے گا، جنت ہمیشہ ناگوار یوں اور مکاہ سے گھری ہے گی، اور مکاہ کبھی نفس کے لئے آسان نہیں ہو سکتے ایسا ہونا محال ہے، کتنا ایسا ہوتا ہے کہ تو کہتا ہے کہ کل سے یہ کام کریں گے، تجھے معلوم نہیں کہ جو کل آپکی ہے، وہ گذشتہ دن کے حکم میں ہے، جو کام تو آج انجام نہیں دے سکا، کل اس کا انجام دینا تیرے لئے اور بھی مشکل ہے، اس لئے کہ شہوت کی مثال ایک تناور درخت کی سی ہے جس کو آدمی اکھاڑنا اپنا فرض سمجھتا ہے، اگر کوئی اس کے اکھاڑنے سے عاجز ہو گیا، اور اس نے اس کو کل پر رکھا تو اس کی مثال اس نوجوان کی سی ہے، جس سے ایک رخت اکھاڑا نہیں گیا، اور اس نے اس کام کو دوسرے سال کے لئے ملتوی کر دیا، وہ جانتا ہے کہ جتنا زمانہ گزے گا درخت مستحکم اور اس کی جڑیں مضبوط اور وسیع ہو جائیں گی، اور اکھاڑنے والے کی کمزوری اور ضعف میں اضافہ ہوگا، ظاہر ہے کہ جس کو شباب میں نہیں اکھاڑ سکا، اس کو بڑھاپے میں کیا اکھاڑے گا، بڑھاپے کی ورزش اور محنت بہت تکلیف دہ ہوتی ہے، بھیر پیے کی تربیت و اصلاح ایک عذاب ہے، سرسبز شاخ لچک کھتی ہے اور جھکائی جاسکتی ہے، جب کھجکھجے گی، اور ایک زمانہ گزر جائے گا تو اس کا موڑنا ناممکن ہو جائے گا، پس اگر اے نفس! تو ان حقائق پر ایمان نہیں رکھتا، اور پہل انکاری سے کام لیتا ہے، تو تجھے کیا ہو گیا ہے کہ حکمت و دانش کا دعویٰ دار ہے، اس سے بڑھ کر حماقت اور کیا ہو سکتی ہے، غالباً تو یہ کہہ کر استقامت سے

روکنے والی چیز شہوت پرستی اور آلام و مصائب پر بے صبری ہے، اگر یہی بات ہے تو نیری غباوت کتنی بڑھی ہوئی ہے اور نیر اعذر کتنا لنگ ہے اگر تو اپنے قول میں سچا ہے تو ایسی لذت کیوں نہیں تلاش کرتا جو تمام کدورتوں اور آلائشوں سے پاک ہو اور ابدالاً بذاتک کے لئے ہو، اور یہ نعمت جنت ہی میں حاصل ہو سکتی ہے، اگر تو خواہشات کا حریص ہے اور تجھے لذت ہی عزیز ہے تو ان کی خاطر بھی تجھے نفس کی وقتی خواہشات کی مخالفت کرنی چاہئے، اس لئے کہ بسا اوقات ایک لقمہ کئی لقموں سے محروم کر دیتا ہے تیرا کیا خیال ہے، اس مرضی کے بائے میں جس کو طبیعت نے صرف تین روز کے لئے ٹھنڈے پانی سے پرہیز بتایا ہو تاکہ وہ صحت حاصل کر سکے، پھر زندگی بھر ٹھنڈے پانی کا لطف اٹھائے، اس نے اس کو خبردار کر دیا ہو کہ ٹھنڈا پانی اس حالت میں اس کے لئے سخت مضر ہے، اگر اس نے بد پرہیزی کی تو زندگی بھر اس ٹھنڈے پانی سے اس کو ہاتھ دھولینا پڑے گا، اس وقت سچ سچ بتلا عقل کا تقاضا کیا ہے؟ کیا اس کو تین صبر کر لینا چاہئے، تاکہ زندگی آرام سے گزرے، یا اپنی خواہش پوری کر لینی چاہئے، پھر تین سو دن یا تین ہزار دن برابر اس نعمت سے محروم رہے؟ تین دن کی کبھی پوری عمر کے مقابل میں وہ حقیقت نہیں جو تیری پوری عمر کی ابدالاً بذاتک زندگی کے مقابل میں ہے (جو اہل جنت اور اہل جہنم کی مدت ہے) کیا تو کہہ سکتا ہے کہ خواہشات نفسانی کے ضبط کرنے کی تکلیف، طبقات جہنم میں عذابِ نار سے زیادہ سخت اور طویل ہے؟ جو شخص ایک معمولی تکلیف بھی نہیں برداشت کر سکتا، وہ عذابِ الہی کو کیسے برداشت کر سکتا ہے!

میں دیکھتا ہوں کہ تو دو وجہ سے اپنے نفس کو ڈھیل دیتا ہے، ایک کفرِ ظنی، اور ایک صریح حماقت، کفرِ ظنی یہ ہے کہ یوم حساب پر تیرا ایمان کمزور ہے، اور ثواب عقاب سے تو ناواقف ہے، اور صریح حماقت اللہ تعالیٰ کی تدبیر مخفی اور اس کے استدراج کا خیال کئے بغیر اس کے عضو و کرم پر اعتماد ہے، اس کے باوجود کہ تو روٹی کے ایک ٹکڑے، غلہ کے ایک انہ اور زبان سے نکلے ہوئے ایک کلمہ کے لئے خدا تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کے لئے تیار

نہیں ہوتا، بلکہ اس کے حصول کے لئے ہزار عین کرتا ہے، اور اسی جہالت کی وجہ سے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا مصداق ہے کہ الکلیس من دان نفسه وعمل لما بعد الموت والاعحق من اتبع نفسه هو اھا و تمثی علی اللہ الامانی (ہوشیار وہ ہے جو اپنے نفس کا عیب سہ کرے، اور لوگ بعد کی زندگی کے لئے عمل کرے، اور احمق وہ ہے جو اپنے نفس کو اپنی خواہشات کے پیچھے لگا دے اور اللہ پر آرزوئیں باندھنا ہے) افسوس اے نفس! تجھ کو زندگی کے دام ہم رنگ زمین سے ہوشیار رہنا چاہئے تھا، اور شیطان سے فریب نہیں کھانا چاہئے تھا، تجھے اپنے اوپر ترس کھانا چاہئے تھا، اپنی فکر کا حکم دیا گیا ہے، دیکھ تو اپنے اوقات ضائع نہ کر، تیرے پاس گنی چنی سانس ہیں، اگر تیری ایک سانس بھی رائگاں گئی تو گویا تیرے سرمایہ کا ایک حصہ ضائع ہو گیا، پس غنیمت سمجھ صحت کو مرض سے پہلے، فراغت کو مصروفیت سے پہلے، دولت کو غربت سے پہلے، شباب کو ضعفی سے پہلے، زندگی کو ہلاکت سے پہلے اور آخرت کے لئے تیاری کر، اسی لحاظ سے جتنا تجھے وہاں رہنا ہے، اے نفس! کیا جب موسم سرما سر پر آجاتا ہے تو اس پوری مدت کے لئے تو تیاری نہیں کرتا، خوراک کا ذخیرہ، لباس کی ضروری مقدار اور ایندھن کا ایک ٹھیکہ جمع نہیں کر لیتا، تو تمام ضروری سامان جاڑے کا ہیا کر لیتا ہے، اور اس بھروسہ پر نہیں رہتا کہ بادہ جڑا اول اور ایندھن کے بغیر جاڑا گزارے گا، اور تجھ میں اس کی طاقت ہے، کیا تیرا گمان ہے کہ جہنم کی زہریر جاڑوں کی سخت سردی سے کم ہے، ہرگز نہیں، اور اس کا کوئی امکان نہیں، شدت و برودت میں ان دونوں کے درمیان کوئی تناسب نہیں، کیا تو سمجھتا ہے کہ تو بغیر سعی کے اس سے نجات حاصل کرے گا، جیسے کہ سردی بغیر اونی کپڑے، بادہ آگ اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کے بغیر نہیں جاتی، اسی طرح دوزخ کی گرمی اور سردی تو حید کے قلعہ اور طاعت کے خندق کے بغیر نہیں جاسکتی، اور اللہ تعالیٰ کا یہ کرم ہے کہ اس نے تجھے حفاظت کی تدابیر سے آگاہ کر دیا ہے، اور اسبابِ سان کر دیئے ہیں، اس کا کرم یہ نہیں کہ وہ سرے سے عذاب ہی کو مال دے، اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا قانون یہی ہے، وہ جاڑا پیدا کرتا ہے تو اس کے لئے آگ بھی پیدا کرتا ہے، اور تجھے حقیقاً کے طریقہ پر

پتھر کے آگ نکالنے کا طریقہ بھی بتاتا ہے کہ تو ان طریقوں سے فائدہ اٹھائے اور اپنے کو ٹھنڈک سے محفوظ رکھے اور جیسے کہ لکڑی خریدنا اور اونی کپڑے حاصل کرنا، خدا کی ضرورت نہیں انسانوں کی ضرورت ہے اسی طرح طاعت و عبادت سے بھی خدا مستغنی ہے اور یہ تمہارا فریضہ ہے کہ اس کے وسیلہ سے نجات حاصل کرو، "مَنْ أَحْسَنَ فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا وَأَلَّهُ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ" (جس نے اچھائی کی تو اپنے نفس کے لئے اور جس نے برائی کی، اس کا بوجھ بھی اسی پر ہے اور اللہ جہاں والوں سے بے پروا ہے) تیری خرابی ہولے نفس اجمالت کی قبا چاک کر اور اپنی آخرت کو اپنی دنیا پر قیاس کر "فَمَا خَلَقَكُمْ وَلَا يَعْتَكُمُ إِلَّا كَفَيْكُمْ وَأَهْدَىٰٓ وَأَكْبَرُ" تمہارا پیدا کرنا اور تمہارا برباد کرنا ایک جان کی طرح ہے "كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ" (جیسے ہم نے پیدا کیا تھا پھر اسے دہراتے ہیں) كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ (جیسے اس نے تم کو ابتدا میں پیدا کیا تھا، ویسے ہی پھر تم واپس ہو جاؤ گے)۔

احیاء کے ناقد

شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے احیاء العلوم کی اجمالی تعریف و اعتراف کیا ہے اور لکھا ہے کہ کلامہ فی الاحیاء غالبہ جیدہ (احیاء میں عموماً ان کا کلام اچھا ہے) اس کے ساتھ وہ چار باتوں میں اس کتاب پر تنقید کرتے ہیں ان کی پہلی تنقید اس پر ہے کہ اس میں فلاسفہ کے بہت سے اقوال آگئے ہیں اور توحید نبوت اور معاد سے متعلق ان کے بعض خیالات و بیانات شامل ہو گئے ہیں ان کے نزدیک امام غزالی فلاسفہ کے اثرات سے ضرور کچھ نہ کچھ متاثر ہوئے ہیں وہ اگرچہ ان کے بڑے ناقد اور مخالفت میں مگر ان کی تصنیفات میں ان کے خیالات کی (غیر شعوری طور پر) کہیں کہیں جھلک جاتی ہے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی جس فلسفہ و فلاسفہ کے بارہ میں چونکہ بہت تیز ہے اس لئے کچھ عجیب نہیں کہ ان کے معیار سے امام غزالی کی بعض چیزیں فلسفہ سے متاثر ہوں۔

دوسری تنقید یہ ہے کہ اس میں بعض ایسے کلامی مباحث ہیں جو ابن تیمیہ کے نزدیک کتاب سنت کی روح کے پورے طور پر مطابق نہیں ہیں اور ان کے معیار پر پورے نہیں اترتے، تیسری تنقید یہ ہے کہ اس میں اہل تصوف کے بعض تشددانہ اقوال اور مغالطے ہیں، چوتھی چیز یہ ہے کہ احیاء میں بہت سی ضعیف احادیث و آثار ہیں بلکہ موضوع روایات تک ہیں، اس کے باوجود شیخ الاسلام لکھتے ہیں:-

وفیه مع ذلك من کلام المشائخ الصوفیۃ اس کا وجود احیاء میں ان مشائخ صوفیہ کا جو صاحب العارفین المستقیمین فی اعمال القلوب معرفت استقامت تہی اعمال قلوب کے بارہ میں بہت سا الموافق للکتاب والسنة ما هو اکثر مما ایسا کلام ہے جو کتاب سنت کے موافق ہے اور جس کا یرد منه فلهذا اختلفت فیہ اجتهاد اکثر حصہ قابل قبول ہے اسی بنا پر اس کتاب کے بارہ میں علماء مختلف رائے رکھتے ہیں اور سب الناس و تناسر عوافیہ۔ اس کے مخالف نہیں۔

علامہ ابن جوزی کی بھی بڑی تنقید ضعیف اور موضوع روایتوں پر ہے ان کے نزدیک اس کی وجہ امام صاحب کا حدیث سے عدم اشتغال ہے، حافظ زین الدین العراقي صاحب الفیہ نے احیاء کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے کہ اس کی احادیث کی تخریج کی، ہر راوی اور حدیث کا درجہ اور اس کی حیثیت بیان کر دی ہے۔ ابن جوزی نے امام غزالی کے بعض تاریخی مسامحات اور فرغ و گذشتوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث کی طرح ان کو تاریخ سے بھی اشتغال کا موقع نہیں ملا تھا۔

ان کا دوسرا اعتراض اس پر ہے کہ بعض امراض قلب (ریا و حب جاہ) وغیرہ کے علاج کے سلسلہ میں اور نفس کشی اور اصلاح کے لئے انھوں نے صوفیہ کے بعض ایسے واقعات نقل کر دیے ہیں جو قابل تقلید نہیں ہیں اور فقہی حیثیت سے ان کا جواز بھی ثابت ہونا مشکل ہے، ان نقائص کے باوجود وہ

۱۔ فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ ص ۱۹۵، اور التاج المکمل نواب صدیق حسن خاں ص ۳۸۸

احیاء العلوم کی اہمیت و مقبولیت کے قائل ہیں اور انھوں نے خود منہاج القاصدین کے نام سے اس کا اختصار کیا ہے جس میں انھوں نے قابل اعتراض چیزوں کو حذف کر دیا ہے، لیکن اس خلاصہ میں اصل کتاب کی روح اور اس کی تاثیر باقی نہیں رہی ہے۔

امام غزالی اور علم کلام

امام غزالی جس مجتہدانہ دماغ کے آدمی تھے، اس کے لئے یہ مشکل تھا، کہ وہ متقدمین کے مباحث و تحقیقات کے ناقل محض یا ترجمان و شراح بن کر رہ جائیں اور کہیں ان کی شخصیت نمودار نہ ہونے پائے بد قسمتی سے چوتھی صدی میں علم کلام کا حلقہ بھی (جس کو تمام دوسرے علمی اداروں سے زیادہ اپنے زمانہ کی عقلی اور علمی سطح کے ساتھ چلنے کی ضرورت تھی) جمود و تقلید کا شکار ہو گیا تھا، متکلمین اشاعرہ کو نہ صرف اس پر اصرار تھا کہ ان کے نتائج تحقیقات اور ان کے عقائد تسلیم کئے جائیں بلکہ اس پر بھی اصرار تھا کہ ان عقائد کے ثبوت کے لئے امام ابو الحسن اشعری اور علامہ ابو بکر باقلانی وغیرہ نے جو مقدمات و دلائل قائم کئے ہیں ان کو بھی بعینہ تسلیم کیا جائے اور ان کے علاوہ دوسرے مقدمات و دلائل سے کام نہ لیا جائے امام غزالی نے اپنی تصنیفات میں مجتہدانہ انداز میں اصول و عقائد پر گفتگو کی، اور ان کے ثبوت کے لئے انھوں نے بعض ایسے نئے مقدمات و دلائل قائم کئے، جو ان کے نزدیک زیادہ موثر و دلپذیر تھے، صفات باری تعالیٰ..... نبوت، معجزات، تکلیفات شرعیہ، عذاب و ثواب، برزخ، قیامت کے متعلق انھوں نے نئے متکلمانہ انداز سے گفتگو کی، اور ان کے ثبوت کے لئے انھوں نے بہت سے متکلمین کی طرح احتمال آفرینیوں، تشکیکات اور منطقی مقدمات و نتائج کے بجائے زیادہ عام فہم اور اطمینان بخش دلائل فراہم کئے، اور اس سلسلہ میں انھوں نے پیشرو متکلمین کے استدلال زبان اور اصطلاحات اور ان کی ترتیب کی پابندی نہیں کی، اور اس طرح اشعری علم کلام کی تجدید کی خدمت انجام دی، جس کے لئے متکلمین اشاعرہ کو ان کا ممنون اور

ان کی عظیم الشان دینی خدمت کا معترف ہونا چاہئے تھا، مگر چونکہ انھوں نے یہ کام عام متکلمین کی روش سے ہٹ کر انجام دیا تھا، اور کہیں کہیں امام ابو الحسن اشعری اور ان کے نامور تبعین کی تحقیقات سے اختلاف پایا جاتا تھا، اس لئے اشعری مکتب فکر (جس سے خود امام صاحب منسلک اور منسوب تھے) ان کے اس علم کلام اور ان دلائل و مقدمات پر چلن پھین تھیں، اور اس حلقہ کے بہت سے پرچوش علماء اس میں "زلیخ و ضلال" اور منسلک سلف سے بعد و انحراف محسوس کرتے تھے، احیاء العلوم کی تالیف اور اس کی غیر معمولی اشاعت و مقبولیت کے بعد اس مسئلہ پر اشعری علماء میں چھ میگوئیاں بہت بڑھ گئیں، اور بہت سے لوگوں کو امام صاحب کے عقائد میں شبہات پیدا ہونے لگے، کسی مخلص نے امام صاحب کو خط لکھا اور اس صورت حال کی اطلاع دینے ہوئے اپنی قلبی تکلیف کا اظہار کیا، امام صاحب نے ان کو مفصل جواب دیا، ایک منقول رسالہ (فیصل التفرقة بین الامتلاہم والنہدۃ) کے نام سے موجود ہے، اس کے شروع میں وہ تحریر فرماتے ہیں:-

برادر شفیق! احاسدین کا گروہ جو میری بعض تصنیفات (متعلق باسراء دین) پر نکتہ چینی کر رہا ہے، اور خیال کرتا ہے کہ یہ تصنیفات قبلے اسلام اور مشائخ اہل کلام کے خلاف ہیں، اور یہ کہ اشعری کے عقیدے سے بال برابر بھی ہٹنا کفر ہے، اس پر جو تم کو صدمہ ہوتا ہے اور تمہارا دل جلتا ہے، میں اس واقعہ ہوں لیکن عزیز من! تم کو صبر کرنا چاہئے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مطاعن سے نہ بچ سکے تو میرا کیا ہستی ہے، جس شخص کا یہ خیال ہے کہ اشاعرہ یا معتزلہ یا حنابلہ یا اور دیگر فرقوں کی مخالفت کفر ہے تو سمجھ لو کہ وہ اندھا منکر ہے، اس کی اصلاح کی کوشش میں اپنے اوقات ضائع نہ کرو، اس کو خاموش کرنے کے لئے مخالفین کا دعویٰ کافی ہے، اس لئے کہ تمام مذاہب (کلامیہ) میں اشعری سے اختلافات پائے جاتے ہیں، اب اگر کوئی دعویٰ کرتا ہے کہ تمام تفصیلات و جزئیات میں اشعری کا اتباع ضروری ہے اور ادنیٰ مخالفت بھی کفر ہے، تو اس سے سوال کرو کہ یہ کہاں سے ثابت ہو کہ حق اشعری کے ساتھ مخصوص ہے، اور انہی کی اتباع میں منحصر ہے، اگر ایسا ہے تو وہ شاید باقلانی کے کفر کا فتویٰ دیں گے،

اس لئے کہ صفت بقا میں ان کو اشعری سے اختلاف ہے اور ان کا خیال ہے کہ وہ ذات الہی سے زائد کوئی صفت نہیں ہے اور پھر سوال یہ ہے کہ باقلانی ہی اشعری کی مخالفت کر کے کیوں کفر کے مستحق ہیں، اشعری باقلانی سے اختلاف کی بنا پر کیوں کفر کے مستحق نہیں اور حق ان میں سے کسی ایک میں کیوں منحصر سمجھا جائے اگر کہا جائے کہ اشعری مقدم ہیں تو خود اشعری سے معتزلہ مقدم ہیں تو پھر معتزلہ کو برحق ہونا چاہئے یا یہ محض علم و فضل کے تفاوت کی بنا پر ہے تو بتلایا جائے کہ علم و فضل کا موازنہ کرنے کے لئے کون سا ترازو ہے جس کی وجہ سے ایک شخص اپنے پیشوا کو علم و فضل میں سب سے بلند مرتبہ مانتا ہے اگر باقلانی کو اشعری سے اختلاف کرنے کی اجازت ہے تو باقلانی کے بعد آنے والے اس حق سے کیوں محروم رہیں اور اس میں کسی ایک شخص کی تخصیص کیوں کی جائے؟

علم کلام پر مجتہدانہ گفتگو اور اس میں بیش بہا اضافہ کرنے کے بعد امام غزالی اپنی سلامت طبع، حق پسندی اور ذاتی تجربوں کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچے کہ علم کلام کا فائدہ بہت محدود ہے اور بعض اوقات اس کا ضرر اس کے نفع سے زیادہ ہے نیز وہ ایک وقتی اور ضرورت کی چیز ہے اور ایک دوا ہے جس کی صحیح المزاج اور سلیم الطبع انسانوں کو ضرورت نہیں، عمومی چیز جو ایک صالح غذا کا حکم رکھتی ہے اور جس سے کوئی انسان مستثنیٰ نہیں، وہ قرآن مجید کا طرز بیان اور استدلال ہے جس سے سب کو اپنا اپنا حصہ ملتا ہے اور کوئی اس سے محروم نہیں، إجماع العوام عن علم الکلام میں جو ان کی آخری تصنیف ہے لکھتے ہیں۔

فأدلة القرآن مثل الغذاء وينتفع به كل انسان وأدلة المتكلمين مثل الدواء وينتفع به أعماد الناس ويستغربه الأكثر بل أدلة القرآن كالماء الذي ينتفع به قرائي دلائل غذا کی طرح ہیں جس سے انسان فائدہ اٹھاتا ہے اور تکلمیوں کے دلائل دوا کی طرح ہیں جس سے کوئی کوئی فائدہ اٹھاتا ہے اور اکثر آدمیوں کو اس نفع سے محروم ہوتا ہے بلکہ قرآنی دلائل کی مثال پانی کی سی ہے

القصبی الرضیع والترجل القوی
وسائر الأدلة كالاطعمة التي ينتفع
بها الاقوياء صرة ويمرضون بها الضعی
ولا ينتفع بها الصبيان اصلاً

جس سے دودھ پیتا بچہ اور طاقتور آدمی کیسا فائدہ
اٹھاتے ہیں باقی دلائل (کلامیہ) کھانے کے نفع و اقسام
کی طرح ہیں کہ کبھی ان سے طاقتور آدمیوں کو فائدہ پہنچتا ہے
اور کبھی ضرر اور بچوں کے لئے وہ مطلقاً کارآمد نہیں۔

علم کلام سے جو نقصان پہنچا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے اپنا مشاہدہ اور تجربہ بیان کرتے ہیں۔
والدلیل علی تضرر الخلق به المشاهدة
والعیان والتجربة وماتار من الشر
منذ نبخ المتكلم وقت مناعة الكلام مع
سلامة العصر الاول من الصعابة عن مثل
ذالك۔
لوگوں کو علم کلام سے جو نقصان پہنچا ہے اس کی
دلیل خود مشاہدہ اور تجربہ ہے اہل تجربہ جانتے ہیں کہ
جب سے تکلمیں پیدا ہوئے اور علم کلام کا چرچا ہوا
کیسی مصیبت آئی اور خرابی پھیلی جیسا کہ یاد دہاؤں اس
خرابی سے محفوظ تھا۔

تدریس کے لئے دوبارہ اصرار اور امام غزالی کی معذرت

ذوالقعدہ ۱۲۹۹ھ میں امام غزالی نے نیشاپور کے مدرسہ نظامیہ کی مسند درس کو دوبارہ آباد کیا تھا، یہ
سنجر سلجوقی (پسر ملک شاہ) کی سلطنت اور فخر الملک (پسر نظام الملک) کی وزارت عظمیٰ کا زمانہ تھا،
(فخر الملک) محرم ۵۵۷ھ میں ایک باطنی کے ہاتھ سے شہید ہوا، اس کی وفات کے تھوڑے ہی دن بعد
امام نے مدرسہ نظامیہ کی تدریس سے کنارہ کشی کی اور اپنے وطن طوس میں سکونت اختیار کی، گھر کے پاس ہی
ایک مدرسہ اور خانقاہ کی بنیاد ڈالی، جہاں تعلیم و تربیت میں مشغول ہو گئے۔
۵۵۷ھ میں سلطان محمد بن ملک شاہ نے جب نظام الملک کے بڑے بیٹے احمد کو وزیر اعظم مقرر کیا تو

لے إجماع العوام عن علم الکلام ص ۲۰
۲۵ ایضاً

اس نے امام صاحب کو پھر بغداد میں بلانا چاہا، امام غزالی کی جگہ مدرسہ نظامیہ میں اگرچہ پرکردی گئی تھی، مگر خالی تھی، امام غزالی کا جانشین پورے عالم اسلامی میں ملنا مشکل تھا، مدرسہ نظامیہ سلطنت عباسیہ کی زینت اور بغداد کی آبروتھی، اس نقصان کا احساس سب کو تھا، بارگاہِ خلافت سے بھی اس کی تحریک ہوئی کہ امام غزالی مدرسہ نظامیہ کو پھر زینت بخشیں، تو امام الدین نظام الملک وزیر اعظم نے خود خط لکھا، اور مدرسہ نظامیہ کی اہمیت اور مرکزیت بیان کی، اور خود خلیفہ عباسی کی طرف سے اس خواہش کا اظہار کیا، وہ لکھتا ہے:

”ونیز از سر اے عزیز مقدس نبوی (یعنی ایوانِ خلافت) ذریعت نمودند وندبیر آن را با العنا فرمودند“

وایں خطاب صادر شد تا صدر الدین بہ تحفظ این خبر بخوابد اجل زین الدین حجۃ الاسلام، فرید الزمان ابو حامد بن محمد الغزالی ادام اللہ تملک، اہتمام نہ گیرد از انچہ او یگانہ جہاں وقودہ عالم وانگشت نامے روزگار است“

اس فرمان پر دربارِ خلافت کے تمام ارکان کے دستخط ثبت تھے، اور یہ ظاہر کیا گیا تھا، کہ حاشیہ بوسانِ خلافت اور ارکانِ سلطنت سب امام صاحب کے قدم کے لئے چشم براہ ہیں، احمد بن نظام الملک نے خود امام صاحب کو جو خط لکھا، اس کا حاصل یہ تھا کہ اگرچہ آپ جہاں تشریف رکھیں گے، وہی جگہ درس گاہ عام بن جائے گی، لیکن جس طرح آپ مفتدلے روزگار ہیں آپ کی قیام گاہ بھی وہی شہر ہونا چاہئے جو عالم اسلام کا مرکز اور قبلہ گاہ ہو، تاکہ تمام دنیا کے ہر حصہ کے لوگ آسانی و ہاں پہنچ سکیں، اور ایسا مقام صرف دارالسلام بغداد ہے۔“

امام صاحب نے ان خطوط و فرامین کے جواب میں ایک طول طویل خط لکھا، اور بغداد میں نہ آنے کے متعدد عذر لکھے: ایک یہ کہ یہاں (طوس میں) ڈیڑھ سو مستعد طلبہ مصروف تحصیل ہیں، جن کو بغداد جانے میں زحمت ہوگی، دوسرے یہ کہ جب میں پہلے بغداد میں تھا تو میرے اہل و عیال نہ تھے، اب بال بچوں کا جھگڑا ہے، اور یہ لوگ کہ وطن کی زحمت نہیں اٹھا سکتے، تیسرے یہ کہ میں نے مقام خلیل میں عہد کیا ہے کہ کبھی مناظرہ و مباحثہ نہ کروں گا، اور بغداد میں مباحثہ کے بغیر چارہ نہیں، اس کے سوا دربارِ خلافت میں سلام کرنے کے لئے حاضر ہونا ہوگا، اور

لے صدر الدین محمد نظام الملک طوسی کا پوتا اور سلطان سنجر کا وزیر اعظم تھا، جس کی حکومت میں طوس واقع تھا۔

میں اس کو گوارا نہیں کر سکتا، سب سے بڑھ کر یہ کہ میں مشاہرہ اور وظیفہ قبول نہیں کر سکتا، اور بغداد میں میری کوئی جائداد نہیں، غرض خلافت اور سلطنت کی طرف سے گو بہت کچھ کہہ ہوئی، لیکن امام صاحب نے صاف انکار کیا، اور گوشہ عافیت سے باہر نہ نکلے۔

بقیہ زندگی اور وفات

امام غزالی نے یہ زمانہ علمی و دینی اشتغال میں گزارا، ان میں اب بھی طالب علمانہ روح تھی، وہ حدیث کی طرف ایسی توجہ نہیں کر سکے تھے، جیسی انھوں نے علوم عقلیہ اور بعض علوم نقلیہ کی طرف کی تھی، اس زمانہ میں ان کو اپنی اس کمی کو پورا کرنے کا خیال ہوا، چنانچہ ایک مشہور محدث حافظ عمر بن ابی الحسن ارضی کو اپنے یہاں مہمان رکھ کر ان سے صحیح بخاری و صحیح مسلم کا درس لیا، اور اس کی سند حاصل کی، یہ اخیر زمانہ ان کا حدیث کے مطالعہ اور اشتغال میں گذرا، ابن عساکر کہتے ہیں:-

وكانت خاتمة امره اقبالة على حديث
ان کی زندگی کا آخری کام یہ تھا کہ وہ حدیث نبوی

المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم وعبائتہ
کی طرف پوری طرح متوجہ ہوئے، اور علماء حدیث

اہلہ و مطالعۃ الصعیبین البغاری و مسلم
کی ہم نشینی اختیار کی، اور صحیحین (بخاری و مسلم) کا

الذین هما حجۃ الاسلام۔
مطالعہ شروع کیا جو اسلام میں سند کا درجہ رکھتی ہیں

انتقال سے ایک سال پہلے ۵۰۵ھ میں انھوں نے ”المستصفیٰ“ لکھی، جو اصول فقہ کے ارکان ثلاثہ میں شمار کی جاتی ہے، اور علماء نے اس کے ساتھ بڑی اعتناء کی ہے، یہ ان کی آخری تصنیف ہے۔

امام غزالی نے طبران میں ۱۴۲ ہجری الاخریٰ ۵۰۵ھ کو ۵۵ سال کی عمر میں انتقال کیا، اور

لے الغزالی ص ۲۱ ۵۲ تبیین کذب المفتری ص ۲۹۶ ۵۳ تبیین کتابین جو اصول فقہ کے تین ستون سمجھے جاتے ہیں

حسبے بل ہیں، ابوالحسین البصری کی (المعتد) امام احرار کی (البرہان) اور امام غزالی کی (المستصفیٰ)۔

یہ گنج گرانما یہ اسی خاک میں ودیعت ہوا، ابن جوزی نے ان کے انتقال کا واقعہ ان کے بھائی احمد غزالی کی روایت سے اس طرح بیان کیا ہے :-

”دو شنبہ کے دن وہ صبح کے وقت بستر خواب اٹھے، وضو کر کے نماز پڑھی، پھر کفن منگوا یا، اور آنکھوں سے لگا کر کہا ”آقا کا حکم سر آنکھوں پر یہ کہہ کر پاؤں پھیلا دیئے لوگوں نے دیکھا تو روح پرواز کر چکی تھی“

امام غزالی کی دو ممتاز خصوصیتیں

امام غزالی کی دو خصوصیتیں بڑی ممتاز ہیں، اخلاص، علو ہمت، ان کے اخلاص کا اعتراف موافق و مخالف سب کو ہے، اور وہ ان کی تصنیفات کے لفظ لفظ سے پکتا ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اگرچہ ان کے ناقد ہیں، اور ان کی بہت سی چیزوں سے ان کو اختلاف ہے، لیکن اس کے باوجود وہ ان کو کبار مخلصین میں شمار کرتے ہیں، ان کی کتابوں کی تاثیر اور مقبولیت کی اصل وجہ ان کا یہی اخلاص ہے، اسی اخلاص نے ان سے اقلیم علم کی مسند شاہی ترک کر والی، اور برسوں دشت و بیاباں کی خاک چھنوائی، اور باوجود طلبی و اصرار کے بادشاہوں کے دربار اور اپنے وقت کے سب سے بڑے اعزاز سے روگرداں اور بے نیاز رکھا، انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ آخری چیز جو صدیقین کے قلب سے نکلتی ہے، وہ حب جاہ ہے، ان کی آخری زندگی شہادت دیتی ہے کہ وہ اس مقام سے محروم نہیں رہے۔

علو ہمت ان کی زندگی کا طغرائے امتیاز ہے، انھوں نے علم و عمل کے دائرہ میں اپنے زمانہ کی سطح اور اپنے ہم عصروں کی کسی منزل پر قناعت نہیں کی، وہ علم و عمل کے جس ترقی یافتہ مقام پر پہنچے، ان کا ان میں یہی صدائی کہ

ع مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

علوم نقلیہ میں بھی وہ اپنے زمانہ اور اپنے معاصرین کی عام سطح سے بہت بلند ہیں، فقہ و اصول فقہ میں

انھوں نے جو تصنیفات کیں، صدیوں تک علماء ان کی شرح و تفسیر میں مشغول رہے، پھر اپنے زمانہ کے رواج اور علمائے نقلیات کے دستور کے خلاف انھوں نے علوم عقلیہ کی طرف توجہ کی، اور منطق و فلسفہ کا اس طرح مطالعہ کیا کہ بقول قاضی ابوبکر بن العربی فلسفہ کے جگر اور فلاسفہ کے شکم میں اتر گئے اور پھر ان کی تنقید و تردید میں ایسی کتابیں لکھیں، جن سے اس کی عمارت ایک صدی تک متزلزل رہی۔

عمل کے سلسلہ میں اپنی ذہنی، علمی، اخلاقی، اور روحانی ترقی و تکمیل کا انھوں نے کوئی گوشہ فرو گذار نہیں کیا، علمی تبحر اور جامعیت و کمال کے ساتھ اپنے وقت کے ایک مخلص و مبصر شیخ طریقت شیخ ابوعلی فارسی (م ۵۴۷ھ) سے بیعت کی، اور تصوف کی تعلیم حاصل کی، پھر اس راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر کے اس کے مقاصد و غایات کو پہنچنے اور اذواق صحیحہ سے لذت آشنا ہوئے۔

اصلاح و انقلاب کے سلسلہ میں صرف تصنیف و تالیف پر اکتفا نہیں کی، بلکہ ایک نئی اسلامی سلطنت کی داغ بیل پڑنے میں بھی ان کا ہاتھ ہے، مولانا شبلی لکھتے ہیں :-

”امام صاحب کو ان باتوں پر تسلی نہ تھی، وہ دیکھتے تھے کہ موجودہ سلطنتوں کا سرے سے خمیر ہی بگڑ گیا ہے، اس لئے جب تک اسلامی اصول کے موافق ایک نئی سلطنت نہ قائم کی جائے، اصل مقصد نہیں حاصل ہو سکتا، لیکن امام صاحب کو ریاضت، مجاہدہ اور مراقبہ سے اتنی فرصت نہ تھی کہ ایسے بڑے کام میں ہاتھ ڈال سکتے، اتفاق یہ کہ جب جبار العلوم شائع ہوئی اور ۱۸۵۷ء میں اسپین میں پہنچی تو علی بن یوسف بن تاشیفین نے جو اسپین کا بادشاہ تھا، تعصب اور تنگ دلی سے اس کتاب کے جلانے کا حکم دیا، اور نہایت بیدریگی اس حکم کی تعمیل کی گئی، امام صاحب کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی، تو سخت رنج ہوا، اسی اثنا میں اسپین سے ایک شخص امام صاحب کی خدمت میں تحصیل علم کے لئے آیا جس کا نام محمد بن عبداللہ تومرت تھا، یہ ایک نہایت محرز خاندان کا آدمی تھا، اور اس کے آبا و اجداد ہمیشہ سے آزادی پسند اور صاحبِ حوصلہ چلے آئے تھے

امام صاحب کی خدمت میں رہ کر اس نے تمام علوم میں نہایت کمال پیدا کیا، اور اپنے ذاتی حوصلہ یا اہانتا
 کی فیض صحبت سے یہ ارادہ کیا کہ اسپین میں علی بن یوسف کی سلطنت کو مٹا کر ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالے
 یہ خیال اس نے امام صاحب کے سامنے پیش کیا، امام صاحب نے چونکہ خود ایک عادلانہ سلطنت کے خواہشمند
 تھے، اس لئے کو پسند کیا لیکن پہلے یہ دریافت کیا کہ اس مہم کے انجام دینے کے اسباب بھی یہاں ہیں یا نہیں
 محمد بن عبداللہ نے اطمینان دلایا، تو امام صاحب نے نہایت خوشی سے اجاز دی، علامہ ابن خلدون اس واقعہ کے متعلق لکھتے ہیں۔
 وبقی فیما زعموا بالحمد الخوالی وفاقاً
 بیجا کہ لوگوں کا خیال ہے وہ ابو حامد غزالی سے ملتا
 بذات صدرہ فارادہ علیہ لما کان فیہ
 ان اپنے دلی خیالات کے متعلق مشورہ کیا، امام صاحب نے
 الاسلام یومئذ باقطار الارض من اختلال
 اس کی تائید کی، کیونکہ اس زمانہ میں اسلام تمام دنیا

لے چونکہ محمد بن عبداللہ نے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کی اور اسی اصول پر قائم کی جو امام غزالی کا منشا تھا، اس لئے اس کا
 ایک مختصر سا حال طبقات الشافعیہ ابن اسکی سے نقل کرتے ہیں :-

”محمد بن عبداللہ اصلاً مغرب کا رہنے والا تھا، اول اپنے وطن میں نشوونما پایا، پھر مشرق کا سفر کیا اور فقہ و کلام کی تحصیل کی، وہ تہمت
 پر ہیزگار عابد اور قناعت پسند تھا، قانع تحصیل ہو کر امام المعروف و نہی عن المنکر پر کمر بستہ ہوا، مصر میں پہنچا تو اس سختی سے لوگوں کو مناجہ سے
 روکا کہ لوگ اس کے دشمن ہو گئے، اور اس کو شہر بدر کر دیا، مصر سے اسکندریہ اور چند روز وہاں اقامت کی پھر بلاد مغرب کی طرف روانہ ہوا
 شہر میں ہمدیہ پہنچا، اور اپنے کام میں مشغول ہوا، وہاں چل کر بجایہ اور بجایہ سے مراکش گیا، یہاں بھی نہایت آزادی امر بالمعروف کی حد
 انجام دی، یہاں تک کہ خود شاہی خاندان سے متعرض ہوا، بادشاہ وقت علی بن یوسف تاشیفین نے اس کو دربار میں طلب کیا، دربار
 کے علماء نے اسے کہا کہ ایسے عادل اور منصف بادشاہ کی حکومت ناراضی کی کیا وجہ بیان کر سکتے ہو، محمد بن عبداللہ نے نہایت جوش
 کے ساتھ کہا کہ کیا اس شہر میں علانیہ شراب کی خرید و فروخت نہیں ہوتی؟ اور کیا تہمتوں کے مال پر دست رازی نہیں کی جاتی؟ اس کی
 پر جوش تقریر سے بادشاہ بھی متاثر ہوا، یہاں تک کہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، محمد مراکش سے نکل کر اغمت میں آیا، اور
 رفتہ رفتہ ایک جماعت کثیر اس کے ساتھ ہو گئی، پھر تمل میں قیام کر کے قبیلہ مصاہب کی اعانت سے سلطنت کی بنیاد ڈالی، شروع کی اور کامیاب ہوا۔“

الدولة وتقويض اركان السلطان
 الجامع للأمة المقيم للمصلحة بعد ان سألہ
 عن له من العصاة والقبائل التي
 يكون بها الاعتزاز والمنعة -
 میں ضعیف ہو رہا تھا، اور کوئی ایسا سلطان موجود
 نہ تھا، جو تمام امت کو فراہم کر سکے اور میں اسلام کو
 قائم رکھے لیکن پہلے امام صاحب نے اسے پوچھ لیا کہ تمہارے
 پاس اتنا سرمایہ اور جمعیت ہے یا نہیں جس سے
 قوت اور حفاظت ہو سکے۔

غرض محمد بن عبداللہ نے تو مرت نے واپس جا کر امام بالمعروف کے شعار سے ایک نئی سلطنت کی بنیاد
 ڈالی، جو مدت تک قائم رہی، اور موحدین کے لقب سے پکاری جاتی تھی، علی بن یوسف کی حکومت میں جو روئے تھی
 بہت پھیل گئی تھی، فوج کے لوگ علانیہ لوگوں کے گھروں میں گھس جاتے تھے، اور عفت مآب خاتونوں کے ناموس
 کو برباد کرتے تھے، علی بن یوسف کے خاندان میں ایک مدت سے یہ الظاد دستور چلا آتا تھا کہ مرد منہ پر نقاب ڈالتے
 تھے، اور عورتیں کھلے منہ پھرتی تھیں، اس لحاظ سے یہ لوگ ملتین کہلاتے تھے، محمد بن تو مرت نے اول اول نہی
 دونوں بدعتوں کے مٹانے پر کمر باندھی، اور رفتہ رفتہ اسی سلسلہ میں ملتین کی حکومت برباد ہو کر ایک نئی سلطنت
 قائم ہو گئی، محمد بن تو مرت نے خود فرمانروائی کا قصد نہیں کیا، بلکہ ایک لائق شخص کو جس کا نام عبدالمؤمن تھا تخت نشین کیا،
 عبدالمؤمن اور اس کے خاندان نے جس طرز پر حکومت کی، وہ بالکل اس اصول کے موافق تھی، جو امام غزالی کی
 متنا تھی، ابن خلدون کتاب الثالوث اخبار بربر، فصل ثالث میں عبدالمؤمن اور اس کی اولاد کے متعلق لکھتے ہیں :-
 ”ان کی حکومت کا یہ انداز تھا کہ علماء کی عزت کی جاتی تھی، اور تمام واقعات اور معاملات میں ان سے مشورہ لے کر
 کا کیا جاتا تھا، داد و خواہوں کی فریاد سنی جاتی تھی، رعایا پر اعمال ظلم کرتے تھے تو ان کو سزا دی جاتی تھی، ظالموں کا
 ہاتھ روک دیا گیا تھا، شاہی ایوانوں میں سجدیں تعمیر کی گئی تھیں، تمام سرحدی ناکے جہاں یورپ کا ڈانڈا ملتا تھا
 فوجی طاقت سے مضبوط کر دیے گئے تھے، اور غزوات و فتوحات کو روز افزوں ترقی تھی۔“

امام غزالی کا عالم اسلام پر اثر

ان علمی و عملی کمالات، طاقتور اور جامع شخصیت کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے عالم اسلام پر بڑا گہرا اثر ڈالا، ان کی عہد آفریں تصنیفات اور مباحث نے علمی حلقوں میں ایک ذہنی توجہ اور فکری حریت پیدا کر دی اور ان کو نئی غذا اور طاقت پہنچائی، اسلام کی جو چند شخصیتیں صدیوں تک عالم اسلام کے دل و دماغ پر اور اس کے علمی و فکری حلقوں پر حاوی رہی ہیں، ان میں سے ایک امام غزالی کی شخصیت بھی ہے، جن کی اثر آفرینی علمی پایہ ان کی تصنیفات کی اہمیت اور تاثیر مخالف اور موافق سب کو تسلیم رہی ہے، صدہا انقلابات کے بعد ان کا نام اور کام آج بھی زندہ ہے، اور ان کی تصنیفات ایک بڑے حلقہ میں وسیع اور مقبول ہیں، اور پڑھنے والوں کو آج بھی متاثر کرتی ہیں۔

عمومی دعوت و تذکیر کی ضرورت و اصلاح عام اور بغداد کے داعی الی اللہ

امام غزالی کی موثر شخصیت ان کے علمی و اصلاحی کارناموں کی عظمت کے باوجود عمومی دعوت و تذکیر کی ضرورت باقی تھی، مسلمانوں کی بڑی تعداد علمی شبہات اور خصوصی امراض کے بجائے عام اخلاقی کمزوریوں، علمی کوتاہیوں اور غفلت اور جہالت کا شکار تھی، اور اس کا جلد مدد و اضوری تھا، اس لئے فوری طور پر ایک سحر بیان خطیب اور ایک ایسی بلند روحانی شخصیت کی ضرورت تھی، جس کا عوام سے زیادہ ربط ہو، اور جو اپنی دعوت و مواعظ، تزکیہ و اصلاح سے جمہور اہل اسلام میں دینی روح، اور نئی ایمانی زندگی پیدا کر دے، مطلق العنان حکومت چار سو برس تک مسلمانوں کے اخلاق کو متاثر کیا تھا، اور بڑی تعداد میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس کا مقصد زندگی حصول دولت یا جاہ و عزت تھا، اور جو اگرچہ اعتقادی طور پر خدا و آخرت کا منکر نہ تھا، مگر عملاً خدا فراموش، آخرت سے غافل اور عیش میں مست تھا، عجمی تہذیب و معاشرت

نے بھی اسلامی زندگی میں اپنے پیچھے گڑ اور رکھے تھے، اور عجمی عادات اور جاہلی رسوم جزو زندگی بن گئی تھیں، زندگی کا معیار بہت بلند ہو گیا تھا، سوسائٹی کے مطالبات بہت بڑھ گئے تھے، حکام رس مزاج شناس موقع پرست لوگوں کی ایک مستقل قوم پیدا ہو گئی تھی، متوسط طبقہ امر کے نقش قدم پر تھا، اور عوام اور محنت کش متوسط طبقہ کے اخلاق و عادات متاثر ہو رہے تھے، جن کو وسائل معیشت حاصل تھے، وہ غلط طریقہ پر ان کو استعمال کر رہے تھے، اور زندگی سے تمتع اور لطف اندوزی میں مصروف تھے، جو امیرانہ ٹھکانے سے محروم تھے، وہ کوفت میں مبتلا تھے، اور اپنے کو چوپایہ سے بدتر سمجھتے تھے، اہل دولت ایشیا و ہمدردی اور جذبہ شکر سے خالی اور تنگ حال اور محنت کش، صبر و قناعت اور یقین و خودداری محروم ہوتے جا رہے تھے، اس طرح زندگی ایک بحرانی کیفیت میں مبتلا تھی، اس وقت ایک ایسی دعوت کی ضرورت تھی جو دنیا طلبی کے بحران کو کم کرے، ایمان کو بیدار کرے اور آخرت کے یقین کو ابھارے، خدا طلبی کا ذوق پیدا کرے، اللہ تعالیٰ کی سچی معرفت اس کی بندگی اور رضامندی میں عالی ہمتی اور بلند جوصلگی سے کام لے، اور اس راستہ میں سبقت کرنے کی دعوت دے، توحید کامل کو واضح بیان کیا جائے، اہل دنیا اور ارباب دولت کی بے وقعتی، اور اسباب کی کمزوری کو طاقت اور وضاحت سے بیان کیا جائے۔

داعی کی علمی صلاحیتیں

پانچویں صدی تا بیسویں صدی اسلام میں علوم و فنون کی ترقی میں خاص امتیاز رکھتی ہے، اس صدی میں دینی، عقلی، اور ادبی علوم میں بڑے بڑے باکمال اور المذہبن پیدا ہوئے ہیں، اسی صدی کے آخر میں علامہ ابو اسحق شیرازی (م ۴۰۶ھ) اور امام غزالی (م ۵۰۵ھ) جیسے تبحر عالم اور صاحب فنون، ابو الوفا ابن عقیل (م ۵۱۳ھ) جیسے فقیہ اور محقق، عبد القادر جیلانی (م ۵۴۱ھ) جیسے صاحب ذوق اور مجتہد فن، ابو زکریا تبریزی (م ۵۳۸ھ) جیسے لغوی اور نحوی، ابو القاسم انحریری (م ۵۱۶ھ) جیسے شارح اور صاحب طرز نظر آتے ہیں، جنھوں نے صدیوں دماغوں اور مذاقوں پر حکومت کی ہے، اس مردم خیز عہد اور بغداد جیسی شاداب سرزمین میں

وقیح دینی خدمت کے لئے اور ذہنوں اور طبیعتوں کا رخ موڑنے کے لئے اعلیٰ علمی صلاحیتوں اور جامع کمالات شخص کی ضرورت تھی، جو اس عصر کے تمام مروجہ علوم میں بلند پایہ رکھتا ہو، اور جس کی روحانی عظمت کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اس کے علم و فضیلت کی بھی تحقیر ممکن نہ ہو، وہ اس زمانہ کی معیاری اور بلند زبان میں گفتگو کرتا ہو، اس کی مجلس میں ہر ذوق کے لوگوں کو حفظ حاصل ہو، اور کوئی اس کو "عابد جاہل" یا "واعظ بے علم" کہہ کر نظر انداز نہ کر سکے، پھر ضعیف الایمان لوگوں کو اس کی مجلس و عطا اور حلقہ درس میں یقین کی قوت، ایمان کی حرارت، اہل شک و ارتباب کو شرح صدر کی دولت، مضطرب بے چین طبیعتوں اور مجروح دلوں کو سکون قلب کی نعمت، حقائق و معارف کے طالبین و ثائقین کو دقیق علوم اور لطیف مضامین کا خزانہ، بے عملوں اور افسردہ دلوں کو جذبات اور عمل کے محرکات اور قوت عمل حاصل ہو۔

بغداد کے دُوداعی

اس پر از کمالات دور میں اللہ تعالیٰ نے دین کی دعوت اور مسلمانوں میں از سر نو ایمانی حرکت و حرارت اور توبہ و انابت کی کیفیت پیدا کرنے کے لئے دو ہستیوں کو پیدا کیا، جن کی ذات سے دین کو بڑی قوت حاصل ہوئی، ان میں ایک کا نام نامی سیدنا عبد القادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہے، دوسرے عبدالرحمن بن ابوحزی ہیں، ذوق و رجحان طبع کے اختلاف کے باوجود دونوں نے اپنے زمانہ میں مسلمانوں کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے دین کو ان سے بڑا نفع پہنچایا، اس میں بھی خدا کی بڑی حکمت تھی کہ بغداد ان کے قیام و دعوت کا مرکز تھا، جو عالم اسلام کا مرکز اعصاب و راس کا علمی و سیاسی دارالسلطنت تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو خدمت کے لئے طویل عمر اور وسیع میدان بھی عطا فرمایا۔

مذہب جنسلی کے لئے یہ بڑے فخر کی بات ہے کہ دونوں صاحبوں کا تعلق اسی مذہب کی فقہ و اصول سے ہے۔

حضرت شیخ عبد القادر جیلانی

تعلیم و تکمیل

سیدنا عبد القادر جیلانی کی ولادت گیلان میں ۴۷۱ھ میں ہوئی، آپ کا نسب س واسطوں سے سیدنا امام حسن رضی اللہ عنہ پر منتهی ہوتا ہے، ۱۸ سال کی عمر میں غالباً ۴۸۸ھ میں بغداد تشریف لائے، یہی وہ سال ہے جس سال امام غزالی نے تلاش حق و حصول یقین کے لئے بغداد کو خیر باد کہا تھا، محض اتفاقاً نہیں کہ ایک جلیل القدر امام سے جب بغداد محروم ہوا تو دوسرا جلیل القدر صلح اور داعی الی اللہ کا وہاں ورود ہوا، آپ بغداد میں پوری عالی ہمتی اور بلند جوصلگی کے ساتھ تحصیل علم میں مشغول ہو گئے، عبادت و مجاہدات کی طرف طبعی کشش کے باوجود آپ نے تحصیل علم میں قناعت و زہد سے کام نہیں لیا، ہر علم کو اس کے باکمال استادوں اور صاحب فن عالموں سے حاصل کیا، اور اس میں پوری دستگاہ پیدا کی، آپ کے اساتذہ میں ابو الوفاء ابن عقیل، محمد بن احسن الباقلانی اور ابو زکریا تبریزی جیسے نامور علماء و ائمہ فن کا نام لے جیلان یا گیلان کو ولیم بھی کہا جاتا ہے، یہ ایران کے شمالی مغربی حصہ کا ایک صوبہ ہے، اس کے شمال میں روسی سرزمین تالیس واقع ہے، جنوب میں برزکا پہاڑی سلسلہ ہے، جو اس کو آذربائیجان اور عراق عجم سے علیحدہ کرتا ہے، جنوب میں ازبکان کا مشرقی حصہ ہے، اور شمال میں بحر قزوین کا مغربی حصہ، وہ ایران کے بہت خوبصورت علاقوں میں شمار ہوتا ہے (دائرة المعارف)۔

نظر آتا ہے، طریقت کی تعلیم شیخ ابوالخیر حماد بن مسلم الدباس سے حاصل کی، اور قاضی ابوسعید مخزومی سے تکمیل کی اور اجازت حاصل کی۔

اصلاح و ارشاد اور رجوع عام

ظاہری و باطنی تکمیل کے بعد اصلاح و ارشاد کی طرف متوجہ ہوئے، ہند درس، اور سند ارشاد کو بیک وقت زینت دی، اپنے استاد و شیخ شیخ مخزومی کے مدرسہ میں تدریس اور وعظ کا سلسلہ شروع کیا، بہت جلد مدرسہ کی ترویج کی ضرورت پیش آگئی، مخلصین نے عمارت میں اضافہ کر کے اس کو آپ کی مجالس کے قابل بنا دیا، لوگوں کا اس قدر ہجوم ہوا کہ مدرسہ میں تل رکھنے کی جگہ نہ رہی، سارا بغداد آپ کے مواعظ پر ٹوٹ پڑا، اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایسی وجاہت و قبولیت عطا فرمائی جو بڑے بڑے بادشاہوں کو نصیب نہیں، شیخ موفق الدین ابن قدامہ صاحب مغنی کہتے ہیں کہ میں نے کسی شخص کی آپ سے بڑھ کر دین کی وجہ سے تعظیم ہوتے نہیں دیکھی، بادشاہ اور وزراء آپ کی مجالس میں نیاز مندانہ حاضر ہوتے، اور ادب سے بیٹھ جاتے، علماء و فقہاء کا کچھ شمارہ تھا، ایک ایک مجلس میں چار چار سو دو اتیس شمار کی گئی ہیں، جو آپ کے ارشادات قلب بند کرنے کے لئے لائی جاتیں۔

مخاد و اخلاق

بایں رفعت و منزلت حد درجہ متواضع اور منکسر المزاج تھے، ایک بچہ اور ایک لڑکی بھی

لے شترانی نے لکھا ہے کہ مریدین کی تربیت میں ان کو بلند مقام حاصل تھا، اور بغداد کے اکثر شائخ اور صوفیہ انہی سے وابستہ تھے، ۵۲۵ھ میں انتقال ہوا طبقاً الکبریٰ ج ۱ ص ۱۳۷ اصل نام مبارک بن علی بن حسین، ابن کثیر نے لکھا ہے کہ انھوں نے حدیث کا سماع، اور امام احمد کے مذہب پر علوم فنیہ میں کمال پیدا کیا، اور زیادہ تر مناظرہ اور درس افتاء سے مشغولیت رکھی، ستودہ صفات مختلف مسلک کہنے والے اور اپنے فیصلوں میں بہت صائب الرائے تھے، ۵۳۵ھ میں وفات پائی۔ ۳۷۰ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ذیل طبقات الخصالہ (ابن رجب)

بات کرنے لگتی تو کھڑے ہو کر سنتے اور اس کا کام کرتے، غریبوں اور فقراء کے پاس بیٹھتے، اور ان کے کپڑوں کو صاف کرتے، بھون نکالتے، لیکن اس کے برخلاف کسی معزز آدمی اور ارکان سلطنت کی تعظیم میں کھڑے نہ ہوتے، خلیفہ کی آمد ہوتی تو قصداً دولت خانہ میں تشریف لے جاتے، یہاں تک کہ خلیفہ آکر بیٹھ جاتا، پھر برآمد ہوتے، تاکہ تعظیماً کھڑا نہ ہونا پڑے، کبھی کسی وزیر یا سلطان کے دروازہ نہیں گئے۔

آپ کے دیکھنے والے اور آپ کے معاصرین آپ کے حسن اخلاق، علو حوصلہ، تواضع و انکسار، سخاوت و ایثار اور اعلیٰ اخلاقی اوصاف کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، ایک بزرگ (حرادہ) جنھوں نے بڑی طویل عمر پائی، اور بہت سے بزرگوں اور ناموروں کو دیکھا، اور ان کی صحبت اٹھائی، فرماتے ہیں:-

میرا آنکھوں نے حضرت شیخ عبد القادر سے بڑھ کر

مارأت عینای احسن خلقاً ولا اوسع

کوئی خوش اخلاق، فراخ حوصلہ، کریم النفس، رقیق القلب

صدراً ولا اکرم نفساً ولا الطفت قلباً

محبت اور تعلقات کا پاس کرنے والا نہیں دیکھا، آپ

ولا احفظ عهداً او وداً من سیدنا الشیخ

عظمت اور علو مرتبت اور وسعت علم کے باوجود چھوٹے

عبد القادر ولقد کان مع جلالة قدره

کی رعایت فرماتے، بڑے کی توقیر کرتے، سلام میں سبقت

وعلوم منزلتہ وسعة علمہ یقف

فرماتے، کمزوروں کے پاس اٹھتے بیٹھتے، غریبوں کے ساتھ

مع الصغیر ویوقر الکبیر ویبداً بالاسلام

تواضع و انکساری سے پیش آتے، حالانکہ آپ کسی

ویعالی الضعفاء وی تواضع للفقراء

سربراہ اور درجہ یارئیں کے لئے تعظیماً کھڑے نہیں ہو

وما قام لاحد من العظماء ولا الاعیان

اور نہ کسی وزیر یا حاکم کے دروازہ پر گئے۔

ولا الترمباب وزیر ولا سلطان

الامام الحافظ ابو عبد اللہ محمد بن یوسف البرزالی الاشجلی ان الفاظ میں آپ کی تعریف کرتے ہیں:-

کان مجاب الدعوة سریع الدمعة آپ ستیاب الدعوات تھے اگر کوئی عبرت اور

لہ الطبقات الکبریٰ للشعرانی ج ۱ ص ۱۲۷ ۱۲۸ ایضاً ۱۲۹ ایضاً ۱۳۰ ایضاً

دائم الذکر کثیر الفکر رقیق القلب
 دائم البشر کریم النفس سخی الید
 غزیر العلم شریف الاخلاق طیب
 الاعراق مع قدم راسخ فی العبادۃ
 والاجتماع
 رقت کی بات کی جاتی تو جلدی آنکھوں میں آنسو
 آجاتے ہمیشہ ذکر و فکر میں مشغول رہتے بڑے قریق
 القلب تھے خندہ پیشانی شگفتہ رو کریم النفس
 فرخ دست وسیع علم بلند اخلاق عالی نسب
 عبادات اور مجاہدہ میں آپ کا پایہ بلند تھا۔

مفتی عراق محی الدین ابو عبد اللہ محمد بن حامد البغدادی لکھتے ہیں:-

ابعد الناس عن الفحش اقرب
 الناس الی الحق شدید الباس
 اذ انتقلت محام احلہ عزوجل
 لا یغضب لنفسه ولا ینتصر لغيره
 غیر مہذب بات سے انتہائی دور حق اور معقول
 بات سے بہت فریب اگر احکام خداوندی اور
 حدِ الہی میں کسی پر دست درازی ہوتی تو آپ کو
 جلال آجاتا، خود اپنے معاملہ میں کبھی غصہ نہ آتا، او
 الشروع وجل کے علاوہ کسی چیز کے لئے انتقام نہ لیتے
 کسی سائل کو خالی ہاتھ واپس نہ کرتے خواہ بدن کا
 کپڑا ہی کیوں نہ اتار کر دینا پڑے۔

بھوکوں کو کھانا کھلانے اور ضرورت مندوں پر بے دریغ خرچ کرنے کا خاص ذوق تھا، علامہ ابن
 النجار آپ سے نقل کرتے ہیں کہ "اگر ساری دنیا کی (دولت) میرے قبضہ میں ہو تو میں بھوکوں کو کھانا کھلا دوں
 یہ بھی فرماتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری ہتھیلی میں سوراخ ہے، کوئی چیز اس میں ٹھہرتی نہیں، اگر ہزار
 دینار میرے پاس آئیں تو رات نہ گزرنے پائے، صاحبِ قلائد الجواہر لکھتے ہیں کہ حکم تھا کہ رات کو وسیع
 دسترخوان بچھے، خود مہانوں کے ساتھ کھانا تناول فرماتے، کمزوروں اور غریبوں کی ہم نشینی فرماتے،

طلبہ کی باتوں کو برداشت کرتے، اور تحمل فرماتے ہر شخص یہ سمجھتا کہ اس سے بڑھ کر کوئی ان کا مقرب اور ان کے
 یہاں معزز نہیں، ساتھیوں میں سے جو غیر حاضر ہوتا، اس کا حال دریافت فرماتے اور اس کی فکر رکھتے،
 تعلقات کا بڑا پاس اور سجاوٹ تھا، غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر کرتے، اگر کوئی کسی بات پر تم کھا لیتا
 تو اس کو مان لیتے اور جو کچھ (حقیقت حال جانتے تھے) اس کا انخفا فرماتے!

مردہ دلوں کی مسیحائی

سیدنا عبد القادر جیلانیؒ کی کرامت کی کثرت پر مورخین کا اتفاق ہے، شیخ الاسلام عز الدین بن
 عبد السلام اور امام ابن تیمیہ کا قول ہے کہ شیخ کی کرامات حد تو اترو کہ پوچھ گئی ہیں ان میں سب سے بڑی کرامت
 مردہ دلوں کی مسیحائی تھی، اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلب کی توجہ اور زبان کی تاثیر سے لاکھوں انسانوں کو نبی
 ایمانی زندگی عطا فرمائی، آپ کا وجود اسلام کے لئے ایک باد بہاری تھا، جس نے دلوں کے قبرستان میں نبی جان
 ڈال دی اور عالم اسلام میں ایمان و روحانیت کی ایک نئی لہر پیدا کر دی، شیخ عمر کیسانی کہتے ہیں کہ
 کوئی مجلس ایسی نہ ہوتی تھی جس میں یہودی اور عیسائی اسلام نہ قبول کرتے ہوں، اور رہزن خونخوار اور
 جرائم پیشہ توبہ سے مشرف نہ ہوتے ہوں، فاسد الاعتقاد اپنے غلط عقائد سے توبہ نہ کرتے ہوں۔

جیلانی کا بیان ہے کہ مجھ سے حضرت شیخ نے ایک روز فرمایا کہ میری تمنا ہوتی ہے کہ زمانہ سابق کی طرح
 صحراؤں اور جنگلوں میں رہوں نہ مخلوق مجھے دیکھے نہ میں اس کو دیکھوں، لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں کا
 نفع منظور ہے، میرے ہاتھ پر پانچ ہزار سے زائد یہودی اور عیسائی مسلمان ہو چکے ہیں، عیاروں اور جرائم
 پیشہ لوگوں میں سے ایک لاکھ سے زائد توبہ کر چکے ہیں، اور یہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔
 مورخین کا بیان ہے کہ بغداد کی آبادی کا بڑا حصہ حضرت کے ہاتھ پر توبہ سے مشرف ہوا، اور

بکثرت یہودی، عیسائی، اور اہل ذمہ مسلمان ہوئے۔

تعلیمی مشاغل و خدمات

اعلیٰ مراتب ولایت پر فائز ہونے اور نفوس و اخلاق کی اصلاح و تربیت میں ہمہ تن مشغول ہونے کے ساتھ آپ درس و تدریس، افتاء اور تصحیح اعتقاد اور مذہب اہل سنت کی نصرت و حمایت سے غافل نہ تھے، عقائد و اصول میں امام احمد اور محدثین کے مسلک پر تھے، مذہب اہل سنت اور سلف کے مسلک کو آپ بڑی تقویت حاصل ہوئی، اور اس کے مقابلہ میں اعتقادی و عملی بدعات کا بازار سرد ہو گیا، ابن السمعانی کہتے ہیں کہ تبعین سنت کی شان آپ کی وجہ سے بڑھ گئی، اور ان کا پلرا بھاری ہو گیا۔

مدرسہ میں ایک سبق تفسیر کا، ایک حدیث کا، ایک فقہ کا اور ایک اختلافات ائمہ اور ان کے دلائل کا پڑھاتے تھے، صبح شام تفسیر، حدیث، فقہ، مذاہب ائمہ، اصول فقہ اور نحو کے اسباق ہوتے، ظہر کے بعد تجوید کی تعلیم ہوتی، اس کے علاوہ افتاء کی مشغولیت تھی، بالعموم مذہب شافعی اور مذہب حنبلی کے مطابق فتویٰ دیتے، علماء عراق آپ کے فتاویٰ سے بڑے متعجب ہوتے، اور بڑی تعریف کرتے۔

ایک مرتبہ استفتاء آیا کہ ایک شخص نے قسم کھائی کہ وہ کوئی ایسی عبادت کرے گا، جس میں عبادت کے وقت کوئی دوسرا شریک نہیں ہوگا، اگر اس نے قسم پوری نہیں کی تو اس کی بیوی کو تین طلاق، علماء یہ استفتاء سن کر حیرت میں پڑ گئے کہ ایسی کون سی عبادت ہو سکتی ہے، جس میں وہ بالکل تنہا ہو، اور روئے زمین پر کوئی شخص بھی اس وقت وہ عبادت نہ کر رہا ہو، حضرت شیخ زکریا کے پاس استفتاء آیا تو بے تکلف فرمایا کہ طواف اس کے لئے خالی کر دیا جائے، اور وہ سات چکر کر کے خانہ کعبہ کا طواف تنہا مکمل کرے، علمائے یہ جواب سن کر بے ساختہ داد تحسین دی اور کہا کہ یہی ایک صورت ہے کہ وہ بلا شرکت غیرے عبادت کرے اور اپنی

لے قلائد الجواهر و مختلف کتب تذکرہ۔ ۲۱۱ الطبقات الکبریٰ للشعرانی ج ۱ ص ۱۲۶، و طبقات الخنابلہ (ابن رجب) ۲۱۱ ایضاً۔

قسم پوری کرے، اس لئے کہ طواف بیت الشریعہ موقوف ہے، اور مطاف اس شخص کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے، اب اس عبادت میں کہیں بھی شرکت کا امکان نہیں ہے۔

استقامت و تحقیق

حضرت شیخ استقامت کا پہاڑ تھے، اتباع کامل، علم راسخ، اور تائب غیبی نے آپ کو اس مقام پر پہنچا دیا تھا کہ حق و باطل، نور و ظلمت، الہام صحیح اور کید شیطانی میں پورا امتیاز پیدا ہو گیا تھا، آپ پر یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو گئی تھی کہ شریعت محمدی کے احکام اور حلال و حرام میں قیامت تک کے لئے تغیر و تبدل کا امکان نہیں، جو اس کے خلاف دعویٰ کرے، وہ شیطان ہے، ارشاد فرماتے ہیں کہ "ایک مرتبہ ایک بڑی عظیم الشان روشنی ظاہر ہوئی، جس سے آسمان کے کنارے بھر گئے، اس سے ایک صورت ظاہر ہوئی، اس نے مجھ سے خطاب کر کے کہا کہ اے عبدالقادر! میں تمہارا رب ہوں، میں نے تمہارے لئے سب محرمات حلال کر دیئے ہیں، میں نے کہا دور ہو مردود! یہ کہتے ہی وہ روشنی ظلمت سے بدل گئی، اور وہ صورت دھواں بن گئی، اور ایک آواز آئی کہ عبدالقادر! خدا نے تم کو تمہارے علم و تفقہ کی وجہ سے بچا لیا، ورنہ اس طرح میں شتر صوفیوں کو گمراہ کر چکا ہوں، میں نے کہا کہ اللہ کی مہربانی ہے، کسی نے عرض کیا کہ حضرت آپ کیسے سمجھے کہ یہ شیطان ہے، فرمایا اس کے کہنے سے کہ میں نے حرام چیزوں کو تمہارے لئے حلال کر دیا۔"

یہی آپ کا ارشاد ہے کہ اگر حدود الہی (احکام شرعی) میں سے کوئی حد ٹوٹی ہو تو سمجھ لو کہ تم فتنہ میں پڑ گئے ہو، اور شیطان تم سے کھیل رہا ہے، فوراً شریعت کی طرف رجوع کرو، اس کو مضبوط تھام لو، نفس کی خواہشات کو جواب دو، اس لئے کہ ہر وہ حقیقت جس کی شریعت تائید نہیں کرتی، باطل ہے۔

لے الطبقات الکبریٰ للشعرانی ج ۱ ص ۱۲۶، و طبقات الخنابلہ (ابن رجب) ۲۱۱ ایضاً۔

تفویض و توجید

تسلیم و تفویض اور توجیدِ کامل حضرت کا خصوصی حال تھا، کبھی کبھی تعلیماً اس حال اور اس مقام کی تشریح فرماتے تھے، وہ دراصل آپ کا حال ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سر دلبران
گفتہ آید در حدیث دیگران
ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:-

”جب بندہ کسی بلا میں مبتلا کیا جاتا ہے تو پہلے وہ خود اس سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے، اگر نجات نہیں پاتا، تو مخلوقات میں سے اوروں سے مدد مانگتا ہے، مثلاً بادشاہوں یا حاکموں یا دنیا داروں یا امیروں سے اور درد کھ میں طبیبوں سے، جب ان سے بھی کام نہیں نکلتا اس وقت اپنے پروردگار کی طرف دعا اور گریہ و زاری و حمد و ثنا کے ساتھ رجوع کرتا ہے (یعنی) جب تک اپنے نفس سے مدد مل جاتی ہے، خلق سے رجوع نہیں کرتا، اور جب تک تعلق سے مدد مل جاتی ہے، خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، پھر جب خدا کی طرف سے (بھی) کوئی مدد نظر نہیں آتی تو (بے بس ہو کر) خدا کے ہاتھوں میں آرتا ہے، اور ہمیشہ سوال و دعا اور گریہ و زاری اور تالیس و اظہار حاجت مندی، امید و بیم کے ساتھ کیا کرتا ہے، پھر خدا اس کو دعا سے (بھی) تھکا دیتا ہے، اور قبول نہیں کرتا یہاں تک کہ کل اسباب (منقطع ہو جاتے ہیں، اور وہ سب) علیحدہ ہو جاتا ہے، اس وقت اس میں (احکام) قضا و قدر کا نفاذ ہوتا ہے، اور اس کے اندر (خدا اپنا) کام کرتا ہے، تب بندہ کل اسباب و حرکات سے بے پروا ہو جاتا ہے، اور رُوح صرف رہ جاتا ہے، اسے فعل حق کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، اور وہ ضرور بالضرور صاحب یقین موجد ہو جاتا ہے، قطعی طور پر جانتا ہے کہ درحقیقت خدا کے سوانہ کوئی (کچھ) کرنے والا ہے، اور نہ حرکت و سکون دینے والا، نہ اس کے سوا کسی کے ہاتھ میں اچھائی اور برائی، نفع و نقصان، بخشش و حرمان، کشائش و بندش، موت و زندگی، عزت

ذلت، غنا و فقر، اس وقت (احکام قضا و قدر) میں بندہ کی یہ حالت ہوتی ہے، جیسے شیر خوار بچہ دایہ کی گود میں یا مردہ غسال کے ہاتھ میں یا (پولو کا) گیند سوار کے قبضہ میں کہ اٹا پلٹا جاتا ہے، اور بگاڑا بنایا جاتا ہے، اس میں اپنی طرف سے کوئی حرکت نہیں، نہ اپنے لئے، نہ کسی اور کے لئے، یعنی بندہ اپنے مالک کے فعل میں اپنے نفس میں غائب ہو جاتا ہے، اور اپنے مالک و اس کے فعل کے سوانہ کچھ دیکھتا سنتا ہے، کچھ سوچتا سمجھتا، اگر دیکھتا ہے، تو اس کی صنعت اور اگر سنتا ہے، تو اسی کا کلام، اس کے علم سے (بہرہ جزو) جانتا ہے، اس کی نعمت سے لطف اٹھاتا ہے، اس کے قرب سے سعادت پاتا ہے، اس کی تقریب (جاذبہ) سے آراستہ پیراستہ ہوتا ہے، اس کے وعدہ سے خوش ہوتا ہے، سکون پاتا اور اطمینان حاصل کرتا ہے، اس کی باتوں سے مانوس ہوتا ہے، اور اس کے غیر سے وحشت و نفرت کرتا ہے، اس کی یاد میں سرنگوں ہوتا اور جی لگاتا ہے، اس کی ذات پر اعتماد اور بھروسہ کرتا ہے، اس کے نور معرفت سے ہدایت پاتا اور اس کا فرقہ و لباس پہنتا ہے، اس کے علوم عجیب و نادیر پر مطلع ہوتا ہے، اس کے قدرت کے اسرار سے شرف ہوتا ہے، اس کی ذات پاک سے (بہرہات سنتا اور اسے یاد رکھتا ہے، پھر ان (نعمتوں) پر حمد و ثنا و شکر و سپاس کرتا ہے۔

خلق خدا پر شفقت

عامۃ الناس اور امت محمدیہ کے ساتھ آپ کو جو تعلق، جو فکر اور اس کے حال پر جو شفقت تھی، اور جو نابین رسول اور مقبولین کی خاص علامت ہے، اس کا اندازہ آپ کی اس تقریر سے ہو سکتا ہے، جس میں آپ نے بازار میں جانے والوں کے احوال و مراتب بیان کئے ہیں، ان میں آخری مرتبہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں، اور دراصل حدیث دیگران میں اپنا ہی حال اور مقام بیان کرتے ہیں۔

”اور پانچواں وہ شخص ہے کہ جب بازار میں داخل ہوتا ہے تو اللہ سے ان کا دل بھر جاتا ہے، ان لوگوں پر

رحمت کرنے کے لئے، اور یہ رحمت اسے کچھ دیکھنے ہی نہیں دیتی کہ ان لوگوں کے پاس کیا کچھ ہے، وہ تو اپنے داخلہ کے وقت سے باہر نکلنے کے وقت تک بازار والوں کے لئے دعا و استغفار و شفاعت میں اور ان پر رحمت و شفقت میں مشغول رہتا ہے، اس کا دل ان لوگوں کے لئے ان کے حال پر چلتا رہتا ہے، اور آنکھیں روتی رہتی ہیں، اور زبان ان نعمتوں پر جو خدا نے ان لوگوں کو اپنے فضل سے دی ہیں، خدا کا شکر اور اس کی حمد و ثنا کرتی رہتی ہے!

حضرت شیخ کا عہد اور ماحول

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے بغداد میں ۳۷ سال گزارے اور عباسی خلفاء میں سے پانچ ان کی نظروں کے سامنے یکے بعد دیگرے مسند خلافت پر بیٹھے، جس وقت وہ بغداد میں رونق افروز ہوئے اس وقت خلیفہ مستظہر باللہ ابوالعباس (م ۵۱۲ھ) کا عہد تھا، ان کے بعد بالترتیب مسترشد راشد المقتضی لامر اللہ و المتنبی باللہ تخت سلطنت پر متمکن ہوئے۔

شیخ کا یہ عہد بہت اہم تاریخی واقعات سے لبریز ہے، سلجوقی سلاطین اور عباسی خلفاء کی باہمی کشمکش اس زمانہ میں پورے عروج پر تھی، یہ سلاطین عباسی حکومت پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے دل و جان سے کوشاں تھے، کبھی خلیفہ کی رضامندی کے ساتھ اور کبھی اس کی مخالفت و ناراضی کے باوجود، کبھی کبھی خلیفہ اور سلطان کے لشکروں میں باقاعدہ معرکہ آرائی بھی ہوتی، اور مسلمان ایک دوسرے کا بے دریغ خون بہاتے۔

اس طرح کے واقعات مسترشد کے زمانہ میں کئی مرتبہ پیش آئے، یہ عہد عباسی کا سب سے زیادہ طاقتور اور محقول خلیفہ تھا، اور اکثر معرکوں میں فتح بھی اسی کو حاصل ہوتی، لیکن ۱۰ رمضان ۵۱۹ھ میں سلطان مسعود

لے فتوح الغیب مقالہ (۷۲) ترجمہ مولوی محمد عالم صاحب کاکوروی (روز الغیب) ص ۱۵۱، ابن کثیر نے اس کے مناقب میں

لکھا ہے کہ مسترشد بہت شجاع، جو صلہ مند، فصیح و بلیغ، شہساز کلام اور بہت عبادت گزار خلیفہ تھا، اور خاص عام (باقی ص ۱۵۲)

اور اس کے درمیان جو معرکہ ہوا اس میں اس کو شکست فاش ہوئی۔

ابن کثیر لکھتے ہیں:-

”سلطان کے لشکر کو فتح حاصل ہوئی، خلیفہ قید کر لیا گیا، اہل بغداد کی املاک کو لوٹ لیا گیا، اور یہ خبر دوسرے تمام صوبوں میں پھیل گئی، بغداد اس المناک خبر سے بہت متاثر ہوا، اور وہاں کے باشندوں میں ظاہر و باطن ہر لحاظ سے ایک زلزلہ سا آ گیا، عوام نے مسجد کے منبروں تک کو توڑ ڈالا، اور جماعتوں میں شریک ہونا بھی چھوڑ دیا، عورتیں سر سے دوپٹہ ہٹا کر نوحہ خوانی کرتی ہوئی باہر نکل آئیں اور خلیفہ کی قید، اور اس کی پریشانیوں و مصیبتوں کا ماتم کرنے لگیں، دوسرے علاقے بھی بغداد ہی کے نقش قدم پر چلے، اور اس کے بعد یہ فتنہ اتنا بڑھا کہ کم و بیش تمام علاقے اس سے متاثر ہو گئے، ملک سخر نے یہ ماجرا دیکھ کر اپنے بھتیجے کو معاملہ کی نزاکت اور اہمیت سے آگاہ اور خبردار کیا اور اس کو حکم دیا کہ خلیفہ کو بحال کرے، ملک مسعود نے اس حکم کی تعمیل کی، لیکن خلیفہ کو باطنیوں نے بغداد کے راستے میں قتل کر دیا۔“

یہ تمام الم انگیز واقعات شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی نگاہوں کے سامنے گزرے انھوں نے مسلمانوں کے باہمی افتراق و خانہ جنگی اور دشمنی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ دنیا کی محبت کی خاطر اور ملک سلطنت اور جاہ و مرتبہ کے حصول کے لئے لوگ سب کچھ کر گزرنے پر آمادہ ہیں، اور ان کو صرف دربار کی شان و شوکت سے دلچسپی باقی رہ گئی ہے، وہ اہل سلطنت کو تقدس کی نگاہ سے دیکھنے لگے ہیں، اور صوبوں اور شہروں کی حکومت حاصل کرنے کے لئے سر دھڑکی بازی لگائے ہوئے ہیں۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا مادی وجود خواہ ان واقعات سے علیحدہ اور دور رہا ہو لیکن اپنے شعور و احساس کے ساتھ وہ اسی آگ میں جل رہے تھے، اور اسی سوزدروں نے ان کو پوری ہمت و طاقت اور اخلاص

(باقی ص ۲۰۸) سب کی نظروں میں محبوب تھا، وہ آخری خلیفہ تھا جس نے خطبہ دینے کی رسم برقرار رکھی، ۳۵ سال ۳ ماہ

کی عمر میں اس کو شہید کر دیا گیا، اس کی مدت خلافت ۱۷ سال اور ۲۰ روز ہے (البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۲۰۸)

کے ساتھ وعظ و ارشاد، دعوت و تربیت، اصلاح نفوس اور تزکیہ قلوب کی طرف متوجہ کیا، اور انھوں نے نفاق اور حب دنیا کی تحقیر و تذلیل، ایمانی شعور کے احیاء عقیدہ آخرت کی تذکیر اور اس سرائے فانی کی بے ثباتی کے مقابلہ میں اس حیات جاودانی کی اہمیت، تہذیب اخلاق، توحید خالص اور اخلاص کامل کی دعوت پر سارا زور صرف کر دیا۔

مواعظ و خطبات

حضرت شیخ کے مواعظ دلوں پر بجلی کا اثر کرتے تھے، اور وہ تاثیر آج بھی آپ کے کلام میں موجود ہے، فتوح الغیب اور الفتح الربانی کے مضامین اور آپ کی مجالس کے وعظ کے الفاظ آج بھی دلوں کو گراتے ہیں، ایک طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی ان میں زندگی اور تازگی محسوس ہوتی ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے نابین اور عارین کا ملین کے کلام کی طرح یہ مضامین بھی ہر وقت کے مناسب اور سامعین اور مخاطبین کے حالات و ضروریات کے مطابق ہوتے تھے، عام طور پر لوگ جن بیماریوں میں مبتلا، اور جن مغالطوں میں گرفتار تھے، انھیں کا ازالہ کیا جاتا تھا، اسی لئے ہاضمین آپ کے ارشادات میں اپنے زخم کلام ہم اپنے مرض کی دوا، اور اپنے سوالات و شبہات کا جواب پاتے تھے، اور تاثیر اور عام نفع کی یہ ایک بڑی وجہ تھی، پھر آپ زبان مبارک سے جو فرماتے تھے، وہ دل سے نکلتا تھا، اس لئے دل پر اثر کرتا تھا، آپ کے کلام میں بیک وقت شوکت و عظمت بھی ہے، اور دل آویزی اور حلاوت بھی، اور صدیقین کے کلام کی یہی شان ہے۔

توحید خالص اور غیر اللہ کی بے حقیقتی

اس وقت ایک عالم کا عالم اہل حکومت اور اہل دولت کے دامن سے وابستہ تھا، لوگوں نے مختلف انسانوں اور مختلف ہستیوں کو نفع و ضرر کا مالک سمجھ لیا تھا، اسباب کو ارباب کے درجے دیا گیا

تھا، اور قضا و قدر کو بھی اپنے جیسے انسانوں سے متعلق سمجھ لیا گیا تھا ایک ایسی فضا میں حضرت شیخ فرماتے ہیں

”کل مخلوقات کو اس طرح سمجھو کہ بادشاہ نے جس کا ملک بہت بڑا اور حکم سخت اور رعیت داب ل ہلا دینے والا ہے، ایک شخص کو گرفتار کر کے اس کے گلے میں طوق اور پیروں میں کڑا ڈال کر ایک صنوبر کے درخت میں ایک نہر کے کنارے جس کی موجیں زبردست پاٹ بہت بڑا تھا، بہت گہری بہاؤ بہت زوروں پر ہے، لٹکا دیا ہے، اور خود ایک نفیس اور بلند کرسی پر کہ اس تک پہنچنا مشکل ہے، تشریف فرما ہے، اور اس کے پہلو میں تیر و پیکان، نیزہ و کمان اور ہر طرح کے اسلحہ کا انبار ہے، جن کی مقدار خود بادشاہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، ابلان میں سے جو چیز چاہتا ہے، اٹھا کر اس نکلے ہوئے قیدی پر چلاتا ہے تو کیا (یہ تماشا) دیکھنے والے کے لئے بہتر ہو گا کہ وہ سلطان کی طرف سے نظر پٹالے اور اس خوف و امید ترک کر دے اور نکلے ہوئے قیدی سے امید و بیم رکھے، کیا جو شخص ایسا کرے عقل کے نزدیک بے عقل ہے اور آک دیوانہ، چوپایہ اور انسانیت سے خارج نہیں ہے، خدا کی پناہ بینائی کے بعد نابینائی، اور وصول کے بعد جدائی اور قرب و ترقی کے بعد تنزل اور ہدایت کے بعد گمراہی اور ایمان کے بعد کفر ہے۔“

ایک دوسری مجلس میں توحید و اخلاق اور مسائل اللہ سے انقطاع کی تعلیم اس طرح دیتے ہیں:-

”اس پر نظر رکھو جو تم پر نظر رکھتا ہے، اس کے سامنے رہو جو تمہارے سامنے رہتا ہے، اس سے محبت کرو جو تم سے محبت کرتا ہے، اس کی بات مانو جو تم کو بلاتا ہے، اپنا ہاتھ اسے دو جو تم کو گرنے سے سنبھال لے گا، اور تم کو جہل کی تاریکیوں سے نکال لے گا، اور ہلاکتوں سے بچائے گا، نجاستیں دھو کر میل کچیل سے پاک کرے گا، تم کو تمہاری سڑا ہندا اور بدبو اور پست ہمتی اور نفس بدکار و رفیقان گمراہ و گمراہ کن سے نجات دے گا، جو شیاطین خواہشیں اور تمہارے جاہل دوست ہیں، خدا کی راہ کے رہزن اور تم کو ہر نفس اور ہر عمدہ اور پسندیدہ چیز سے محروم رکھنے والے، کب تک عادت ہے، کب تک خلق ہے، کب تک خواہش ہے، کب تک

رعونت؟ کب تک دنیا؟ کب تک آخرت؟ کب تک ماسوائے حق؟ کہاں چلے تم؟ (اس خدا کو چھوڑ کر جو) ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے اور بنانے والا ہے، اول ہے، آخر ہے، ظاہر ہے، باطن ہے، دلوں کی محبت و رحمت کا اطمینان، گرائیوں سے سبکدوشی، بخشش و احسان، ان سب کا رجوع اسی کی طرف سے، اور اسی کی طرف سے اس کا صدور ہے۔

ایک دوسری مجلس میں اسی توحید کے مضمون کو اس طرح و اشکاف بیان فرماتے ہیں:-

”ساری مخلوق عاجز ہے نہ کوئی تجھ کو نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان، بس حق تعالیٰ اس کو ان کا ہاتھوں کر دیتا ہے، اسی کا فعل تیرے اندر اور مخلوق کے اندر تصرف فرماتا ہے، جو کچھ تیرے لئے مفید ہے یا مضر ہے، اس کے متعلق اللہ کے علم میں قلم چل چکا ہے اس کے خلاف نہیں ہو سکتا، جو موصد اور نیکو کار ہیں، وہ باقی مخلوق پر اللہ کی حجت ہیں، بعض ان میں سے ایسے ہیں جو ظاہر اور باطن دونوں اعتبار سے دنیا سے برہنہ ہیں، گو دولت مند ہیں، مگر حق تعالیٰ ان کے اندروں پر دنیا کا کوئی اثر نہیں پاتا، یہی قلوب ہیں جو صاف ہیں، جو شخص اس پر قادر ہوا، اس کو مخلوقات کی بادشاہت مل گئی، وہی بہادر پہلوان ہے، بہادر وہی ہے جس نے اپنے قلب کو ماسوائے اللہ سے پاک بنایا، اور قلب کے دروازہ پر توحید کی تلوار اور شریعت کی شمشیر لے کر کھڑا ہو گیا کہ مخلوقات میں سے کسی کو بھی اس میں داخل نہیں ہونے دیتا، اپنے قلب کو مقلب القلوب سے وابستہ کرتا ہے، شریعت اس کے ظاہر کو تہذیب سکھاتی ہے، اور توحید و معرفت باطن کو مہذب بناتی ہیں۔“

معبودانِ باطل کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

”آج تو اعتماد کر رہا ہے اپنے نفس پر، مخلوق پر، اپنے دیناروں پر، اپنے درہموں پر، اپنی خرید و فروخت پر، اور اپنے شہر کے حاکم پر، ہر چیز کہ جس پر تو اعتماد کرے، وہ تیرا معبود ہے، اور ہر وہ شخص

جس سے تو خوف کرے یا توقع رکھے، وہ تیرا معبود ہے، اور ہر وہ شخص جس پر نفع اور نقصان کے متعلق تیری نظر پڑے اور تو یوں سمجھے کہ حق تعالیٰ ہی اس کے ہاتھوں اس کا جاری کرنے والا ہے، تو وہ تیرا معبود ہے۔ ایک دوسرے موقع پر خدا کی غیرت، شرکار سے نفرت، اور انسان کی محبوب چیزوں کے سلب اور ضائع ہو جانے کی حکمت اس طرح بیان فرماتے ہیں:-

”تم اکثر کہتے ہو گے اور کہو گے، میں جس سے محبت کرتا ہوں اس میری محبت رہنے نہیں پاتی، اور خیر نہ پڑ جاتا ہے، یا توجہ دانی ہو جاتی ہے، یا وہ مرجاتا ہے یا رنجش ہو جاتی ہے، اور مال سے اگر محبت کرتا ہوں تو وہ ضائع ہو جاتا ہے، اور ہاتھ سے نکل جاتا ہے، تب تم سے کہا جائے گا کہ اے خدا کے محبوب، اے وہ کہ جس پر خدا کی عنایت ہے، اے وہ جو خدا کا منظور نظر ہے، اے وہ جس کے لئے اور جس پر خدا کی غیرت آتی ہے، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ غیور ہے، اس نے تم کو اس لئے پیدا کیا، اور تم غیر کے مورہنا چاہتے ہو، کیا تم نے خدا کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ ”وہ ان لوگوں کو دوست رکھتا ہے، اور وہ اسے اور یہ ارشاد کہ ”میں نے جن و انس کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں“ کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہیں سنا کہ ”خدا جب کسی بندے سے محبت کرتا ہے، تو اسے بتلا کرتا ہے، پھر اگر وہ صبر کرتا ہے تو اسے رکھ چھوڑتا ہے، عرض کیا گیا یا رسول اللہ رکھ چھوڑنے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا ”اس کے مال و اولاد کو باقی نہیں رکھتا“ اور یہ معاملت اس لئے ہے کہ جب مال و اولاد ہوں گے تو اسے ان کی محبت بھی رہے گی، اور خدا سے جو محبت اسے ہے، متفرق اور ناقص اور تقسیم ہو کر حق اور غیر حق میں مشترک ہو جائے گی، اور خدا شریک کو قبول نہیں کرتا، وہ غیور ہے، اور ہر چیز پر غالب زبردست، تو وہ اپنے شریک کو ہلاک معدوم کر دیتا ہے، تاکہ وہ اپنے بندہ کے دل کو خالص کرے، خاص اپنے لئے بغیر شریک کے، اس وقت اس کا یہ ارشاد صادق آجاتا ہے کہ ”وہ ان لوگوں کو

دوست رکھتا ہے اور وہ لوگ اسے یہاں تک کہ دل جب (خدا کے ان مصنوعی) شریکوں اور برابری کرنے والوں سے جو اہل و عیال، دولت و لذت اور خواہشیں ہیں، نیز ولایت و ریاست کرامات و حالات، منازل و مقالات، جنتوں اور درجات اور قرب و نزدیکی کی طلب سے پاک صاف ہو جاتا ہے تو اس میں کوئی ارادہ اور آرزو باقی نہیں رہتی، اور وہ مثل سوراخ دار برتن کے ہو جاتا ہے جس میں کوئی چیز نہیں ٹھہرتی، کیونکہ وہ خدا کے فعل سے ٹوٹ جاتا ہے، جب اس میں کوئی ارادہ پیدا ہوتا ہے، خدا کا فعل اور اس کی غیرت اس کو توڑ ڈالتی ہے، تب اس کے دل کے گرد عظمت و جبروت و ہیبت کے پرے ڈال دیے جاتے ہیں اور اس کے گرد گرد کبریائی اور سطوت کی خدقیں کھودی جاتی ہیں کہ دل میں کسی چیز کا ارادہ گھسنے نہیں پاتا، اس وقت دل کو اسباب یعنی مال اور اہل و عیال و اصحاب اور کرامات و حکم و بیانات کچھ مضرت نہیں ہوتے، کیونکہ یہ سب دل سے باہر رہتے ہیں، تب اللہ تعالیٰ ان سے غیرت نہیں کرتا، بلکہ یہ سب چیزیں خدا کی طرف سے بندہ کے لئے بطور لطف و کرامت و رزق و نعمت کے ہوتی ہیں اور جو لوگ اس کے پاس آتے ہیں، انہیں نفع پہنچانے کے لئے ہے۔

شکستہ دلوں کی تسکین

حضرت شیخ کے زمانہ میں ایک طبقہ ایسا تھا جو اپنے اعمال و اخلاق اور ایمانی کیفیت کے لحاظ سے پست لیکن دنیاوی حیثیت سے بلند اور ہر طرح سے اقبال مند تھا، اس کے برخلاف دوسرا طبقہ معاشی حیثیت سے پست، دنیاوی ترقیات سے محروم، بے بضاعت و تہی دست، لیکن اعمال و اخلاق کے لحاظ سے بلند اور ایمانی کیفیات و ترقیات سے بہرہ مند تھا، وہ پہلے طبقہ کی کامیابیوں اور ترقیات کو بعض اوقات رشک کی نگاہ سے دیکھتا، اور اپنے کسی وقت محروم و نامراد سمجھنے لگتا تھا، حضرت شیخ اس شکستہ دل

طبقہ کی دجھولی فرماتے ہیں اور ان پر اللہ تعالیٰ کی جو عنایات ہیں، ان کا ذکر فرماتے ہوئے اس امتیاز و فرق کی حکمت بیان کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے:-

”اے خالی ہاتھ فقیر! وہ کہ جس سے تمام دنیا برگشتہ ہے، اے گناہ لے بھوکے پیاسے ننگے، جگر جھلے ہوئے، اے ہر مسجد و خرابی سے نکالے ہوئے، اے ہر در سے پھٹکائے ہوئے، اے وہ کہ ہر مرد سے محروم، خاک پر پڑا ہے، اے وہ کہ جس کے دل میں (مٹی ہوئی) آرزوؤں اور امانوں کے (کشتوں کے) پستے لگے ہیں، مت کہہ کہ خدا نے مجھ کو محتاج کر دیا، دنیا کو مجھ سے پھیر دیا، مجھے پامال کر دیا، چھوڑ دیا، مجھ سے دشمنی کی، مجھے پریشان کیا اور حرجیت (خاطر) نہ بخشی، مجھے ذلیل کیا اور دنیا سے میری کفایت نہ کی، مجھے گناہ کیا، اور خلق میں او میرے بھائیوں میں میرا ذکر بلند نہ کیا، اور عزیز برائے تمام نعمتیں نچھاور کر دیں، جس میں اس کے رات دن گزرتے ہیں، اسے مجھ پر اور میرے دیا والوں پر فضیلت دی، حالانکہ وہ بھی مسلمان ہے اور میں بھی اور ایک ماں باپ آدم و حوا کی اولاد میں و نون میں (اے فقیر) خدا نے تیرے ساتھ یہ برتاؤ اس لئے کیا ہے کہ تیری سرشت میا زمین (کے مثل) بے ریت ہے اور رحمت حق کی بارشیں برا بھلا پر ہو رہی ہیں، از قسم صبر و رضا و یقین موافقت و علم اور ایمان و توحید کے نوار تیرے گردا گرد ہیں تو تیرے ایمان کا درخت اور اس کی جڑ اور بیج اپنی جگہ پر مضبوط ہے، کٹے سے رہا ہے، پھل رہا ہے، بڑھ رہا ہے، شاخیں پھیلا رہا ہے، سایہ سے رہا ہے، بلند ہو رہا ہے، روزانہ زیادتی اور نمونیں ہے، اس کے بڑھانے اور پرورش کرنے میں پانس اور کھا دینے کی ضرورت نہیں، اس بارہ میں خداوند تعالیٰ تیرے حکم سے فارغ ہے (کہ وہ خود تیری ضروریات کو بخوبی جانتا ہے) اس نے آخرت میں تجھ کو مقام بخشا ہے، اور اس میں تجھ کو مالک بنایا ہے، اور عقبی میں تیرے لئے اتنی کثرت سے بخششیں رکھی ہیں کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھی، نہ کان نے سنی، نہ کسی انسان کے دل میں گزریں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کوئی نفس نہیں جانتا کہ کون سی آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لئے چھپا رکھی گئی ہے، اس کا کہ بدلہ میں جو وہ کرتے رہے ہیں، یعنی جو کچھ دنیا میں ان لوگوں نے

احکام کی بجا آوری ممنوعات کے ترک پر صبر، مقدرات میں تفویض و تسلیم اور کل امور میں خدا کی موافقت کی ہے۔

اور وہ غیر جسے خدا نے دنیا عطا فرمائی اور (مال دنیا کا) مالک کیا ہے، اور نعمت دنیاوی دی، اور اس پر اپنا فضل فرمایا، اس کے ساتھ یہ معاملہ اس لئے کیا ہے کہ اس کے ایمان کی جگہ زینلی اور پھر ملی زمین ہے کہ اس میں پانی ٹھہرنا اور درخت اگنا اور کھیتی اور پھل کا پیدا ہونا وقت سے خالی نہیں تو اس زمین پر کھاد وغیرہ ڈالی جاتی ہے جس سے پودوں اور درختوں کی پرورش ہو، اور وہ کھاد دینا اس کا سامان ہے تاکہ اس سے درخت ایمان اور نہال اعمال کی جو اس زمین میں لگے ہیں، حفاظت ہو اگر یہ چیز اس سے علیحدہ کر دی جائے تو پودے اور درخت سوکھ جائیں گے، اور پھل جاتے رہیں گے، پس گھر ہی اجڑ جائے گا، حالانکہ خداوند تعالیٰ اس کے بنانے کا ارادہ رکھتا ہے، تو اے فقیر! دو بلند آدمی کا درخت ایمان کمزور جڑ کا ہوتا ہے اور اس قوت سے خالی جو تیرے درخت ایمان میں بھری ہوئی ہے، اس کی مضبوطی، اور اس کا ٹکاؤ انہی چیزوں سے ہے جو مال دنیا اور طرح طرح کی نعمتیں اس کے پاس تجھ کو نظر آتی ہیں اگر درخت کی کمزوری میں یہ چیزیں اس سے الگ کر دی جائیں، تو ایمان کا درخت سوکھ کر کفر و انکار (پیدا) ہو جائے گا، اور وہ شخص منافقین و مرتدین و کفار میں شامل ہو جائے گا، البتہ (اگر) خداوند تعالیٰ دولت مند کی طرف صبر و رضا و یقین علم اور طرح طرح کی معرفتوں کے لشکر بھیجے اور اس سے اس کا ایمان قوی ہو جائے تو پھر اس کو تو نگر ہی اور نعمتوں کے علیحدہ ہوجانے کی نہ پروا رہے گی!

دنیا کی صحیح حیثیت

حضرت شیخ کے یہاں رہبانیت کی تعلیم نہیں، وہ دنیا کے استعمال اور اس کے بقدر ضرورت

انتفاع سے منع نہیں فرماتے، اس کی پرستش اور غلامی اور اس سے قلبی تعلق اور عشق سے منع فرماتے ہیں،

ان کے مواظبہ در حقیقت حدیث نبوی "انّ الدّٰنیا خلقت لکم و اتمّ خلقتکم للاٰخرة" (بیشک دنیا تمہارے لئے پیدا کی گئی، یعنی تمہاری لونڈی ہے) اور تم آخرت کے لئے پیدا کئے گئے) کی تفسیر میں ایک موقع پر فرماتے ہیں۔

"دنیا میں سے اپنا مقسوم اس طرح مت کھا کہ وہ ٹیٹھی ہوئی ہو اور تو کھڑا ہو بلکہ اس کو بادشاہ کے

دروازہ پر اس طرح کھا کہ تو بیٹھا ہو اور وہ طباق اپنے سر پر رکھے ہوئے کھڑی ہو، دنیا خدمت کرتی

ہے اس کی جو حق تعالیٰ کے دروازہ پر کھڑا ہوتا ہے اور جو دنیا کے دروازہ پر کھڑا ہوا ہوتا ہے اس کے

ذیل کرتی ہے، کھا حق تعالیٰ کے ساتھ عزت و تو نگر ہی کے قدم پر!

ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہوتا ہے:-

"دنیا ہاتھ میں رکھنی جائز، جیب میں رکھنی جائز، کسی اچھی نیت سے اس کو جمع رکھنا جائز، باقی

قلب میں رکھنا جائز نہیں (کہ دل سے بھی محبوب سمجھنے لگے) دروازہ پر اس کا کھڑا ہونا جائز، باقی

دروازہ سے آگے گھسنا نہ جائز ہے، نہ تیرے لئے عزت ہے!

خلفاء اور حکام وقت پر تنقید

حضرت شیخ صرف مواظبہ، پسند و نصیحت اور ترغیب و تشویق ہی پر اکتفا نہیں فرماتے تھے، جہاں ضرورت سمجھتے تھے، بڑی صاف گوئی اور جرأت کے ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیتے، حکام و سلاطین اور خلیفہ وقت پر بھی تنقید اور ان کے غلط افعال اور فیصلوں کی مذمت سے بھی باز نہیں رہتے تھے، اور اس بارہ میں کسی کی وجاہت اور اثر و نفوذ کی مطلق پروا نہیں کرتے تھے، حافظ عماد الدین ابن کثیر اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:-

کان یا مری بالمعروف ونہی عن المنکر
للخلفاء والوزراء والسلاطین والقضاة
والخاصة والعامۃ یصدعہم بذلک
علی رؤس الاشهاد ورؤس المناہر فی
المحافل وینکر علی من یوقی الظلمۃ
ولا تاخذہ فی اللہ لومة لائم

آپ خلفاء ووزراء، سلاطین، قضاة خواص وعوام
سب کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرماتے، اور بڑی
صفائی اور جرات کے ساتھ ان کو بھرے مجمع میں اور
برسر منبر علی الاعلان ٹوک دیتے، جو کسی ظالم کو حاکم
بناتا، اس پر اعتراض کرتے اور خدا کے معاملہ میں
کسی ملامت کرنے والے کی آپ کو پرواہ نہ ہوتی۔

صاحب قلائد الجواہر لکھتے ہیں کہ جب خلیفہ مقتدی لام اللہ نے قاضی ابوالوفاء یحییٰ بن سعید بن یحییٰ بن المنظر کو
قاضی بنایا جو ابن المرجم الظالم کے لقب سے مشہور تھا تو حضرت نے برسر منبر خلیفہ کو مخاطب کر کے فرمایا۔

ولیت علی المسلمین اظلم الظالمین
ما جوابک غدا عند رب العالین
ارحم الراحمین۔

تم نے مسلمانوں پر ایسا ایسے شخص کو حاکم بنایا ہے جو
اظلم الظالمین ہے کل کو قیامت کے دن تم اس رب
العالین کو جو رحم الراحمین ہے، کیا جواب دو گے؟

موتخ موصوف کا بیان ہے کہ خلیفہ یہ سن کر لرزہ بر اندام ہو گیا، اور اس پر گریہ طاری ہو گیا، اور اس نے
اسی وقت قاضی کو اس عہدہ سے ہٹا دیا۔

حضرت شیخ ان درباری سرکاری علماء اور مشائخ کی بھی پرزور تردید اور پردہ دری فرماتے تھے جنہوں نے
سلاطین اور ناخدا ترس حکام کی مصاحبت اختیار کی تھی اور ان کی ہاں میں ہاں ملانا ان کا شعار تھا جن کی
وجہ سے ان سلاطین حکم کو زیادہ جرات اور بے غوفی پیدا ہو گئی تھی، ایک موقع پر اسی طبقہ کو خطاب کر کے فرماتے ہیں۔

اے علم و عمل میں خیانت کرنے والو! تم کو ان سے کیا نسبت، اے اللہ اور اس کے رسول کے دشمنو!
اے بندگان خدا کے ڈاکو! تم کھلے ظلم اور کھلے نفاق میں (بتلا) ہو، یہ نفاق کب تک رہے گا؟ اے ملعونو!

لہ قلائد الجواہر ص ۵۲ ایضاً

اور اے زاہد و ایشاہان و سلاطین کے لئے کب تک منافق بنے رہو گے کہ ان سے دنیا کا زوال اور اس کی
شہوات و لذات لیتے رہو، تم اور اکثر بادشاہ اس زمانہ میں اللہ تعالیٰ کے مال اور اس کے بندوں کے
متعلق ظالم اور خائن بنے ہوئے ہیں بارالہ! منافقوں کی شوکت توڑنے اور ان کو ذلیل فرمایا ان کو توبہ کی
توفیق دے، اور ظالموں کا قلع قمع فرما، اور زمین کو ان سے پاک کر دے، یا ان کی اصلاح فرما۔

ایک دوسرے موقع پر اسی طبقہ کے ایک فرد کو اپنا مخاطب بناتے ہوئے فرماتے ہیں:-

”تجھے شرم نہیں آتی کہ تیری حرص نے تجھ کو ظالموں کی خدمت گاری اور حرام خوردی پر آمادہ کر دیا تو
کب تک حرام کھاتا اور دنیا کے ان (ظالم) بادشاہوں کا خدمت گار بنایا ہے، جن کی خدمت میں لگا ہوا
ہے ان کی بادشاہت عنقریب مٹ جائے گی، اور تجھے حق تعالیٰ کی خدمت میں آنا پڑے گا، جس کی
ذات کو کبھی زوال نہیں ہے۔“

دین کے لئے دلسوزی اور فکر مندی

حضرت شیخ دینی اور اخلاقی انحطاط کو (جس کا سب سے بڑا مرکز خود بخدا تھا) دیکھ دیکھ کر گڑھٹتے تھے،
اور عالم اسلام میں جو ایک عام دینی زوال رونما تھا، اس کے آثار دیکھ کر ان کے سینہ میں حمیت اسلامی اور
غیرت دینی کا جوش اٹھتا تھا، وہ اپنے اس قلبی احساس اور درد کو بعض اوقات چھپا نہیں سکتے، اور
یہ دریا ان کے خطبات اور مواعظ میں امنڈ آتا ہے۔

ایک موقع پر ارشاد فرماتے ہیں:-

”جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی دیواریں پے در پے گر رہی ہیں اور اس کی بنیاد کجھری

جاتی ہیں، اے باشندگان زمین آؤ اور جو گر گیا ہے اس کو مضبوط کر دین، اور جو ڈھکے گیا ہے اس کو درست

لہ فیوض یزدانی مجلس ۵۱ ص ۵۲ ایضاً۔ مجلس ۵۲ ص ۳۷

کردیں یہ چیز ایک سے پوری نہیں ہوتی، سب ہی کو مل کر کام کرنا چاہئے، اے سورج، اے چاند اور لے دن تم سب آؤ!

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:-

”اسلام رورہا ہے اور ان فاسقوں، اور ان بدعتیوں، گمراہوں، مکر کے کپڑے پہننے والوں اور ایسی باتوں کا دعویٰ کرنے والوں کے (ظلم) سے جو ان میں موجود نہیں ہیں، اپنے سر کو تھامے ہوئے فریاد مچا رہا ہے، اپنے مقدسین اور نظر کے سامنے والوں کی طرف غور کرو کہ امر وہی بھی کرتے تھے اور کھاتے پیتے بھی تھے (اور دفعۃً انتقال پا کر ایسے ہو گئے) گویا ہوئے ہی نہ تھے، تیرا دل کس قدر سخت ہے؟ کتابھی شکر کرنے اور کھیتی اور مویشی کی نگہبانی اور مالک کی حفاظت کرنے میں اپنے مالک کی خیر خواہی کرتا ہے اور اسے دیکھ کر (خوشی کے مائے) کھلاریاں کرتا ہے، حالانکہ وہ اس کو شام کے وقت صرف ایک ونوالے یا ذرا سی مقدار کھانا دیا کرتا ہے، اور تو ہر وقت اللہ کی قسم قسم کی نعمتیں شکم سیر ہو کر کھاتا رہتا ہے، مگر ان نعمتوں کے دینے سے جو اس کو مقصود ہے، نہ تو اس کو پورا کرتا ہے اور نہ اس کا حق ادا کرتا ہے (بلکہ اس کے برعکس) اس کا حکم رد کرتا ہے، اور اس کی حدود شریعت کی حفاظت نہیں کرتا!

بیعت و تربیت

ان پر تاثیر اور انقلاب آفریں مواعظ سے اگرچہ اہل بغداد کو عظیم الشان روحانی اور اخلاقی نفع پہونچا، اور ہزار ہا انسانوں کی زندگی میں اس سے تبدیلی پیدا ہو گئی، لیکن زندگی کے گہرے تغیرات ہمہ گیر صلاح اور مستقل تربیت کے لئے صاحب دعوت سے مستقل اور گہرے تعلق اور مسلسل اصلاح و تربیت کی ضرورت تھی، مجالس دعوت و ارشاد مدارس کی طرح منضبط اور مستقل تربیت گاہیں نہیں ہوتیں، جہاں

طالبین کی تسلسل و انضباط کے ساتھ تعلیم و تربیت اور نگرانی کی جائے ان مجالس کے شرکار و سامعین آزاد ہوتے ہیں کہ ایک مرتبہ وعظ سن کر چلے جائیں، پھر کبھی نہ آئیں، یا ہمیشہ آتے رہیں، لیکن اپنی حالت پر قائم رہیں اور ان کی زندگی میں بدستور بڑے بڑے خلا اور دینی اور اخلاقی شکاف باقی رہیں۔

اسلامی آبادی کا پھیلاؤ اور زندگی کی ذمہ داریاں اور معاشی تفکرات اتنے بڑھ گئے تھے کہ مدارس کے ذریعہ سے (جن کو بہت سی رسوم و قیود کا پابند ہونا پڑتا ہے) عمومی اصلاح و تربیت کا کام نہیں لیا جاسکتا تھا، اور کسی بڑے پیمانہ پر کسی دینی و روحانی انقلاب کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی، پھر اس کی کیا صورت تھی کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد اپنے ایمان کی تجدید کرے، دینی ذمہ داریوں اور پابندیوں کو شعور اور احساس ذمہ داری کے ساتھ دوبارہ قبول کرے اس میں پھر ایمانی کیفیات اور دینی جذبات پیدا ہوں، اس کے افسرہ و مردہ دل میں پھر محبت کی گرمی پیدا ہو، اور اس کے مضمحل قوی میں پھر حرکت اور نشاط پیدا ہو، اس کو کسی مخلص خدا شناس پر اعتماد ہو، اور اس سے وہ اپنے امراض روحانی و نفسانی میں علاج اور دین میں صحیح روشنی اور رہنمائی حاصل کرے، ناظرین کو اس کا اندازہ ہو چکا ہے کہ خلافت بس کا یہ اصلی فرض تھا (اس لئے کہ جس نبی کی نیابت و نسبت پر یہ خلافت قائم تھی، بقول سیدنا عمر ابن عبدالعزیز وہ ہدایت کے لئے مبعوث ہوا تھا، جبائیت (تخصیل و صول) کے لئے نہیں) نہ صرف اس فریضہ سے غافل اور کنارہ کش ہو چکی تھی، بلکہ اپنے اعمال و کردار کے لحاظ سے اس کام کے لئے مضر اور اس کے راستہ میں مزاحم تھی، دوسری طرف وہ اس قدر بدگمان، توہم پرست اور شکی واقع ہوئی تھی کہ کسی نئی تنظیم اور نئی دعوت کو جس میں وہ قیادت اور ریاست کی آمیزش باقی، برداشت نہیں کر سکتی تھی، اس کو فوراً کچل دیتی۔

ایسی صورت میں مسلمانوں میں نئی دینی زندگی، نیا نظم و ضبط اور نئے سرے سے حرکت و عمل پیدا کرنے کے لئے اس کے علاوہ کیا شکل تھی کہ خدا کا کوئی مخلص بندہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ پر ایمان و عمل اور اتباع شریعت کے لئے بیعت لے اور مسلمان اس کے ہاتھ پر اپنی سابقہ غفلت و جاہلیت کی زندگی

سے توبہ اور ایمان کی تجدید کریں اور پھر وہ نائب پیغمبران کی دینی نگرانی اور تربیت کرے اپنی کیمیا اثر صحبت اپنے شعلہ محبت اپنی استقامت اور اپنے نفس گرم سے پھر ایمانی حرارت گرمی محبت خلوص ولہبیت جذبہ اتباع سنت اور شوق آخرت پیدا کرے ان کو اس نئے تعلق سے محسوس ہو کہ انھوں نے ایک نئی زندگی سے توبہ کی ہے اور ایک نئی زندگی میں قدم رکھا ہے اور کسی اللہ کے بندے کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا ہے وہ بھی یہ سمجھے کہ ان بیعت کرنے والوں کی اصلاح و تربیت اور ان کی دینی خدمت اللہ تعالیٰ نے میرے سپرد کی ہے اور اس محبت و اعتماد کا مجھ پر نیا حق قائم ہو گیا ہے پھر اپنے تجربہ و اجتہاد اور کتاب و سنت کے اصول و تعلیمات کے مطابق ان میں صحیح روحانیت و تقویٰ اور ان کی زندگی میں ایمان و احتساب اخلاص اور ان کے اعمال و عبادات میں کیفیات اور روح پیدا کرنے کی کوشش کرے یہی حقیقت ہے اس بیعت و تربیت کی جس سے دین کے مخلص داعیوں نے اپنے اپنے وقت میں اجیاء و تجدید دین اور اصلاح مسلمین کا کام لیا ہے اور لاکھوں بندگان خدا کو حقیقت ایمان اور درجہ احسان تک پہنچا دیا ہے اس سلسلہ زریں کے سر حلقہ اور گل سرسید حضرت شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہیں جن کا نام اور کام اس "طب نبوی" کی تاریخ میں سب سے زیادہ روشن اور نمایاں ہے الفاظ و اصطلاحات اور علمی بحثوں سے الگ ہو کر اگر واقعات و حقائق پر بنیاد رکھی جائے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس دور انتشار میں (جو ابھی تک قائم ہے) اصلاح و تربیت کا اس سے زیادہ سہل اور عمومی اور اس سے زیادہ موثر اور کارگر ذریعہ نہیں ہو سکتا تھا۔

حضرت شیخ سے پہلے دین کے داعیوں اور مخلص خادموں نے اس راستہ سے کام کیا ہے اور ان کی تاریخ محفوظ ہے لیکن حضرت شیخ نے اپنی محبوب و دلاور شخصیت خداداد روحانی کمالات فطری علو استعداد اور لکھ اجتماد سے اس طریقہ کو نئی زندگی بخشی وہ نہ صرف اس سلسلہ کے ایک نامور امام اور ایک مشہور سلسلہ (قادریہ) کے بانی ہیں بلکہ اس فن کی نئی تدوین و ترتیب کا سہرا آپ ہی کے

سر ہے آپ سے پہلے وہ انٹادون و مرتب اور مکمل و منضبط نہ تھا نہ اس میں اتنی عمومیت اور وسعت ہوئی تھی جتنی آپ کی مقبولیت اور عظمت کی وجہ سے پیدا ہو گئی آپ کی زندگی میں لاکھوں انسان اس طریقہ سے فائدہ اٹھا کر ایمان کی حلاوت سے آشنا اور اسلامی زندگی اور اخلاق سے آراستہ ہوئے اور آپ کے بعد آپ کے مخلص خلفاء اور باعظمت اہل سلسلہ نے تمام ممالک اسلامیہ میں دعوت الی اللہ اور تجدید ایمان کا یہ سلسلہ جاری رکھا جن سے فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بیان نہیں کر سکتا، یمن، حضرموت اور ہندوستان میں پھر حضرمی مشائخ و تجار کے ذریعہ جاہدہ اور سماٹرا میں اور دوسری طرف افریقہ کے براعظم میں لاکھوں آدمیوں کی تکمیل ایمان اور لاکھوں غیر مسلموں کے قبول اسلام کا ذریعہ بنا، رضی اللہ تعالیٰ عنہ، وارضاه وجزاه عن الاسلام خیر الجزاء۔

زمانہ پر اثر

حضرت شیخ کا وجود اس مادیت زدہ زمانہ میں اسلام کا ایک زندہ معجزہ تھا، اور ایک بڑی تائید الہی آپ کی ذات آپ کے کمالات آپ کی تاثیر اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ کی مقبولیت کے آثار اور خلق اللہ میں قبولیت و وجاہت کے کھلے ہوئے مناظر، آپ کے تلامذہ اور تربیت یافتہ اصحاب کے اخلاق اور ان کی سیرت و زندگی سب اسلام کی صداقت کی دلیل اور اس کی زندگی کا ثبوت تھا، اور اس حقیقت کا اظہار تھا کہ اسلام میں سچی روحانیت، تہذیب نفس اور تعلق مع اللہ پیدا کرنے کی سب سے بڑی صلاحیت اور اس کا خزانہ عامہ کبھی جو اہرات و نادرات سے خالی نہیں۔

وفات

ایک طویل مدت تک عالم کو اپنے کمالات ظاہری و باطنی سے مستفید کر کے اور عالم اسلام میں

روحانیت اور رجوع الی اللہ کا عالمگیر ذوق پیدا کر کے ۱۵۶۱ء میں ۹۰ سال کی عمر میں وفات پائی، صاحبزادہ حضرت شرف الدین علیؒ آپ کی وفات کا حال بیان کرتے ہیں:-

جب آپ اس مرض میں بیمار ہوئے کہ جس میں انتقال فرمایا تو آپ کے صاحبزادہ شیخ عبدالوہاب نے آپ سے عرض کیا کہ مجھے کچھ وصیت فرمائیے کہ آپ کے بعد اس پر عمل کروں فرمایا ہمیشہ خدا سے ڈرنے رہو اور خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرو، اور نہ اس کے سوا کسی سے امید رکھو اور اپنے تمام ضروریات اللہ کے سپرد کر دو، صرف اسی پر بھروسہ رکھو اور سب کچھ اسی سے مانگو خدا کے سوا کسی پر وثوق اور اعتماد نہ رکھو تو جو اختیار کرو کہ توجید پر سب کا اجماع ہے اور فرمایا جب دل خدا کے ساتھ درست ہو جاتا ہے تو کوئی چیز اس سے چھوٹی نہیں ہے اور نہ کوئی چیز اس سے باہر نکل کر جاتی ہے اور فرمایا میں مغربے پوست ہوں اور اپنے صاحبزادوں سے فرمایا میرے گرد سے ہٹ جاؤ، میں ظاہر میں تمہارے ساتھ ہوں اور باطن میں دوسروں کے ساتھ ہوں میرے پاس تمہارے سوا اور لوگ (فرشتے) حاضر ہیں ان کے لئے جگہ خالی کرو، اور ان کے ساتھ ادب کرو یہاں بڑی رحمت نازل ہے ان کے لئے جگہ تنگ نہ کرو، اور آپ بار بار فرماتے تھے تم پر سلام اور خدا کی رحمت اور اس کی برکتیں! اللہ میری اور تمہاری مغفرت کرے اور میری اور تمہاری توبہ قبول کرے بسم اللہ! آؤ اور واپس نہ جاؤ، اور یہ آپ ایک دن ایک رات برابر فرماتے رہے اور فرمایا تم پر افسوس! مجھے کسی چیز کی پرواہ نہیں، نہ کسی فرشتہ کی، نہ ملک الموت کی، اے ملک الموت! ہمارا کارساز تم سے زیادہ ہم کو بہت کچھ دے رکھا ہے اور اس دن جس کی شب کو آپ نے رحلت فرمائی ایک بڑی سخت چیخ ماری تھی اور آپ کے دو صاحبزادے شیخ عبدالرزاق و شیخ موسیٰ فرماتے تھے کہ آپ بار بار دونوں ہاتھ اٹھا کر پھیلاتے اور فرماتے تھے تم پر سلام اور خدا کی رحمت اور برکتیں! حق کی طرف رجوع کرو، اور صفت میں داخل ہو، میں ابھی تمہارے پاس آیا، اور آپ یہی فرماتے تھے کہ نرمی کرو، پھر آپ پر امحق آیا، اور موت کے نشہ نے غلبہ کیا، اور آپ نے فرمایا، میرے اور تمہارے اور

تمام خلق کے درمیان میں زمین و آسمان کا فرق ہے مجھے کسی پر قیاس نہ کرو، اور نہ کسی کو مجھ پر پھر آپ کے صاحبزادہ شیخ عبدالعزیز نے آپ کی تکلیف اور حال دریافت کیا تو فرمایا مجھ سے کوئی نہ پوچھے، میں علم الہی میں پلٹے کھا رہا ہوں، اور آپ کے صاحبزادہ شیخ عبدالعزیز نے آپ کے مرض کو پوچھا تو فرمایا میرے مرض کو نہ کوئی جانتا ہے اور نہ کوئی سمجھتا ہے، نہ انسان نہ جن، نہ فرشتہ، خدا کے حکم سے خدا کا علم نہیں ٹوٹتا، حکم بدل جاتا ہے اور علم نہیں بدلتا، حکم منسوخ ہو جاتا ہے، علم منسوخ نہیں ہوتا اللہ جو چاہتا ہے مٹاتا ہے، اور باقی رکھتا ہے، اور اس کے پاس اصلی تحریر ہے، جو کچھ وہ کرتا ہے، اس سے باز پرس نہیں ہوتی، اور خلق سے باز پرس ہوتی ہے، صفات کی خبریں گزر رہی ہیں جیسی آئی ہیں، پھر آپ کے صاحبزادہ شیخ عبدالجبار نے آپ سے پوچھا کہ آپ کے جسم میں کہاں تکلیف ہے؟ فرمایا میرے کل اعضاء مجھے تکلیف دے رہے ہیں، مگر میرے دل کو کوئی تکلیف نہیں، اور وہ خدا کے ساتھ صحیح ہے، پھر آپ کا وقت اخیر آیا، تو آپ فرمانے لگے میں اس خدا سے مدد چاہتا ہوں، جس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ پاک و برتر ہے اور زندہ ہے، جسے فوت ہونے کا اندیشہ نہیں، پاک ہے، وہ جس نے اپنی قدرت سے عزت ظاہر کی اور موت سے بندوں پر غلبہ دکھایا، اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے رسول ہیں، اور آپ کے صاحبزادہ شیخ موسیٰ فرماتے تھے کہ آپ نے لفظ "تَعَزَّزَ" فرمایا اور یہ لفظ صحت کے ساتھ آپ کی زبان سے ادا نہ ہوا، تب آپ بار بار اسے دہراتے تھے یہاں تک کہ آپ نے آواز بلند اور سخت کر کے لفظ "تَعَزَّزَ" اپنی زبان سے ٹھیک ٹھیک فرمایا پھر (تین بار) اللہ اللہ اللہ فرمایا، اس کے بعد آپ کی آواز غائب ہو گئی، اور زبان تالو سے چک گئی، اور روح مبارک رخصت ہو گئی۔ رضی اللہ عنہ و اسرنا لہ

حضرت شیخ اس دنیا سے تشریف لے گئے، لیکن اپنے پیچھے دین کے داعیوں اور نفوسِ اخلاق کے مربیوں

کی ایک جماعت چھوڑ گئے، جس نے آپ کے کام کو جاری رکھا، اور بڑھتی ہوئی مادیت اور غفلت کا مقابلہ کرتے رہے۔

لے حضرت شیخ کے بعد جن عارفین و مصلحین نے دعوت و تدبیر اور تربیت نفوس کا کام پوری طاقت اور عزم و ہمت سے جاری رکھا، اور غفلت اور دنیاوی انہماک کا مقابلہ اور اخلاقی اور نفسانی امراض کا علاج کیا، ان میں حضرت شیخ کے فیض یافتہ اور شیخ بغدادی شیخ ابو النجیب سہروردی کے بھتیجے اور خلیفہ شیخ الشیوخ ابو حفص شیخ شہاب الدین سہروردی (۵۹۳ھ - ۶۳۲ھ) سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز تھے، جو طریقت، سہروردیہ کے بانی اور تصوف کی مقبول کتاب "عوارف المعارف" کے مصنف ہیں۔

ابن خلکان لکھتے ہیں: "لم یکن فی الخیر عمرہ فی عصرہ مثله و کان شیخ الشیوخ ببغداد" (آخر عمر میں ان کے زمانہ میں ان کی نظیر نہ تھی) اور وہ بغداد کے سب سے بڑے شیخ اور اپنے فن میں مرجع تھے (ابن النجیب کہتے ہیں: "انتهت الیہ الریاستہ فی ترویج المریدین ودعاء الخلق الی اللہ") (تربیت مریدین اور دعوت الی اللہ کے کام میں وہ مرجع خلائق تھے) ابن خلکان کہتے ہیں کہ ان کے زمانہ کے مشائخ دور دور سے ان کی طرف رجوع کرتے تھے اور استفادہ کرتے رہتے تھے، شیخ کے مواعظ سے خلق اللہ کو بہت نفع ہوا، ابن خلکان کے الفاظ ہیں: "وکان لہ مجلس وعظ وعلی وعظہ قبول کثیر ولہ نفس مبارک" (وہ اہتمام سے وعظ فرمایا کرتے تھے، ان کے وعظ کو اللہ تعالیٰ نے بڑی قبولیت عطا فرمائی، اور ان کے انعامات سے لوگوں کو بڑا نفع تھا)۔

تصوف کو بدعات سے پاک کرنے اور کتاب و سنت کو اس کا ماخذ بنانے کی کوشش میں حضرت شیخ کا تجدیدی حصہ ہے، ان کی کتاب "عوارف المعارف" کو اگر اس فن کی قدیم کتابوں سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے تو ان کی اس تجدیدی کام کا اندازہ ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے شیخ شہاب الدین کو بڑے بلند پایہ اور عالی استعداد خلفاء عطا فرمائے جنہوں نے دعوت و تربیت کا کام بڑی قوت و وسعت کے ساتھ انجام دیا، ان کے صرف ایک خلیفہ شیخ الاسلام شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی سے ہندوستان میں جو فیض پہنچا اور خلق اللہ کو ہدایت ہوئی، وہ ان کی جلالت قدر اور عظمت شان کے لئے کافی ہے۔

(حاشیہ علی الحاشیہ) لے و فیات الاعیان ج ۳ ص ۱۱۹ (النهضة المصرية) لے مرآة الجنان لیا فی ج ۲ ص ۱۱۹ و فیات الاعیان ج ۳ ص ۱۱۹ لے نواب صدیق حسن خان مرحوم لکھتے ہیں: "در تصوف سنی کتابے بہتر از عوارف نیست" (تقصیر وجود الاحرار ص ۶۳)

۶۳

علامہ ابن جوزی

عبدالرحمن ابن جوزی دعوت و اصلاح کا ایک وسر نمونہ ہیں، وہ اپنے زمانہ کے مکتائے روزگار، مفسر، محدث، مورخ، ناقد، مصنف اور خطیب ہیں، اور ان میں سے ہر موضوع پر ان کی ضخیم تصنیف اور علمی کارنامے ہیں۔

ابتدائی حالات اور تحصیل علم

۵۰۵ھ میں بغداد میں پیدا ہوئے، گویا حضرت شیخ سے ۲۷ سال چھوٹے ہیں، بچپن ہی میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، جب پڑھنے کے قابل ہوئے تو ماں نے مشہور محدث ابن ناصر کی مسجد میں چھوڑ دیا، ان سے حدیث سنی، قرآن مجید حفظ کیا، اور تجوید میں مہارت پیدا کی، شیوخ حدیث سے حدیث کی سماعت اور کتابت کی، اور بڑی محنت و انہماک اور جفاکشی سے علم کی تحصیل کی، اپنے صاحبزادہ سے اپنے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"مجھے خوب یاد ہے کہ میں پچھ سال کی عمر میں مکتب میں داخل ہوا، بڑی عمر کے طلبہ میرے ہم سبق تھے، مجھے یاد

نہیں کہ میں کبھی راستہ میں بچوں کے ساتھ کھیلا ہوں یا زور سے ہنسا ہوں، سات برس کی عمر میں جامع مسجد کے

سامنے کے میدان میں چلا جایا کرتا تھا، وہاں کسی مداری یا شعبدہ باز کے حلقہ میں کھڑے ہو کر تماشہ دیکھنے

کے بجائے حدیث کے درس حدیث میں شریک ہوتا، وہ حدیث و سیرت کی جو بات کہتا، وہ مجھے زبانی

یاد ہو جاتی، پھر گھر جا کر اس کو لکھ لینا، دوسرے لڑکے و جملہ کے کنارے کھیلا کرتے تھے اور میں کسی کتاب کے اوراق لے کر کسی طرف چلا جاتا اور الگ تھلگ بیٹھ کر مطالعہ میں مشغول ہو جاتا۔

میں اساتذہ و شیوخ کے حلقوں میں حاضری دینے میں اس قدر جلدی کرتا تھا کہ دوڑنے کی وجہ سے میری سانس پھولنے لگتی تھی، صبح اور شام اس طرح گزرتی کہ کھانے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا تھا، مگر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مخلوق کی احسان مندی سے بچایا۔

کتابت حدیث میں انہماک

حدیث کی سماعت و کتابت میں اتنا اشتغال رہا، اور اپنے ہاتھ سے مرویات حدیث کی اتنی کتابت کی کہ بعض مورخین کا بیان ہے کہ انھوں نے انتقال کے وقت وصیت کی کہ ان کے غسل کا پانی اس کترن اور برادہ سے گرم کیا جائے جو حدیث کے لکھنے کے لئے قلم بنانے میں صحیح ہو گیا تھا چنانچہ وہ اتنا تھا کہ پانی گرم ہو گیا اور وہ چم رہا۔

ذوق مطالعہ

مطالعہ کا ذوق اور اس کی حرص بچپن ہی سے بڑھی ہوئی تھی، بغداد عظیم الشان کتابی ذخیروں اور وسیع کتب خانوں سے مالامال تھا، ابن جوزی کا محبوب مشغلہ کتابوں کا مطالعہ تھا، ان کا مطالعہ کسی خاص فن یا موضوع سے مخصوص نہ تھا، وہ ہر موضوع کی کتابیں پڑھتے تھے اور ان کو آسودگی نہیں ہوتی تھی، "صید الخاطر" میں جو ان کے خیالات و تاثرات کا کشکول ہے، لکھتے ہیں:-

"میں اپنا حال عرض کرتا ہوں، میری طبیعت کتابوں کے مطالعہ سے کسی طرح سیر نہیں ہوتی، جب کوئی نئی کتاب نظر پڑ جاتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دینہ ہاتھ آ گیا، اگر میں کہوں کہ میں بیس ہزار

کتابوں کا مطالعہ کیا ہے تو بہت زیادہ معلوم ہوگا، اور یہ طالب علمی کا ذکر ہے، مجھے ان کتابوں کے مطالعہ سے سلف کے حالات و اخلاق، ان کی عالی ہمتی، قوتِ حافظہ، ذوقِ عبادت اور علومِ نادرہ کا ایسا اندازہ ہوا، جو ان کتابوں کے مطالعہ کے بغیر نہیں ہو سکتا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے زمانہ کے لوگوں کی سطحِ سہولت معلوم ہونے لگی، اور اس وقت کے طلبہ علم کی کم ہمتی منکشف ہو گئی۔

تصنیف و تالیف اور تبحر علمی

علامہ ابن جوزی تصنیف و تالیف کی طرف نو عمری ہی سے متوجہ ہوئے روزانہ چار جزو لکھنے کا زندگی بھر معمول رہا، حافظ ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ میں نے ان کی تالیفات شمار کیں تو ہزار تک پہنچیں، حدیث میں ایسا بلند پایہ رکھتے تھے کہ دعویٰ سے کہتے تھے کہ ہر حدیث کے متعلق کہہ سکتا ہوں کہ صحیح ہے یا حسن یا محال ہے، ادب و انشا و خطابت میں بغداد میں ان کی نظیر نہ تھی۔

تقویٰ اور ذوق عبادت

ان علمی کمالات کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے دیانت و تقویٰ اور ذوق عبادت کی دولت بھی عطا فرمائی تھی، ان کے نواسہ ابو المنظر کہتے ہیں کہ وہ ہر ہفتہ ایک قرآن مجید ختم کرتے تھے، کبھی کسی سے مذاق نہیں کیا، بچپن میں کسی بچہ کے ساتھ کھیلتے نہیں، کبھی کوئی مشتبہ چیز نہیں کھائی، ساری عمر یہی حال رہا، ابن النجار کہتے ہیں کہ ان کو ذوقِ صحیحہ حاصل تھی، اور صلاوت و مناجات و لذتِ دعا کے ذوق آشنا تھے، ابن الفارسی کا بیان ہے کہ شب بیدار تھے اور ذکر اللہ سے کبھی غافل نہیں ہوتے تھے، ان کی تصنیفات اور حالات و اشارات سے خود معلوم ہوتا ہے کہ چشمِ بینا اور دل بیدار رکھتے تھے، اور جمعیتِ خاطر اور تعلق

مع الشکر کو سرمایہ زندگی سمجھتے تھے، اور اس میں کمی آنے سے بیچین و مضطرب ہو جاتے تھے، صید النخاط میں اپنی ایک حالت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

«ابتداءً عمر ہی سے میرے اندر طریق زہد اختیار کرنے کی رغبت اور اندرونی تقاضا تھا، رونے اور نوافل کا اہتمام و التزام تھا، اور تنہائی مرغوب تھی اس وقت میرے دل کی بڑی اچھی حالت تھی، میری چشم بصیرت روشن اور سریع الادراک تھی، عمر کا جو لمحہ بغیر طاعت کے گزر جاتا، اس پر افسوس ہوتا، ایک ایک گھڑی غنیمت معلوم ہوتی، اور زیادہ سے زیادہ عمل اور خدا کی رضا کا کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا، مجھے اللہ کے ساتھ ایک تعلق اور انس اور دعا میں لذت و حلاوت محسوس ہوتی، اس کے بعد ایسا معلوم ہوا کہ بعض حکام و اہل کاران سلطنت میری حسن تقریر اور وعظ سے متاثر ہوئے اور انھوں نے مجھے اپنی طرف مائل کیا، اور طبیعت بھی مائل ہوئی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حلاوت جو دعا و مناجات میں محسوس ہوتی تھی، جاتی رہی پھر دوسرے حاکم نے اپنی طرف مائل کیا (مشتبہ چیزوں کے ڈر سے) اس کے اختلاط اور کھانے پینے سے بچتا تھا، اور میری حالت کچھ بڑی نہ تھی، پھر رفتہ رفتہ تاویل کا دروازہ کھل گیا، اور میں نے مباحات میں آزادی سے کام لیا، تو وہ ساری کیفیت جاتی رہی، جن میں ان حاکموں سے ملتا اور ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا تھا، قلب کی تاریکی بڑھتی جاتی، یہاں تک کہ ایسا محسوس ہوا کہ وہ روشنی بچھ گئی، اور قلب تاریک ہو گیا، اس صورت حال سے میری طبیعت میں ایک بیچینی پیدا ہوئی، اس بیچینی کا اثر مجلس و وعظ کے سامعین پر یہ پڑا کہ وہ بھی بیچین اور متاثر ہونے لگے اس بیچینی کے اثر سے ان کو بکثرت توبہ اور اصلاح کی توفیق ہوتی، اور میں خالی ہاتھ کا خالی ہاتھ رہتا، اپنی اس مفلسی اور بدقسمتی کو دیکھ کر میرا اضطراب اور بڑھا، لیکن کوئی علاج بن نہ آیا، آخر میں نے صاحبین کی قبور کی زیارت کی، اور اللہ سے اپنے دل کی اصلاح کی دعا کی، بالآخر اللہ کے لطف و کرم نے میری دستگیری کی، اور مجھے کشاں کشاں خلوت کی طرف مائل کیا، جس سے

مجھے وحشت تھی، اور وہ دل جو میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا، پھر قابو میں آیا، اور جو حالت مجھے بہت اچھی معلوم ہوتی تھی اس کا عیب مجھ پر ظاہر ہوا، میں اس خواب غفلت سے بیدار ہوا، اور میں نے اپنے مہربان و شفیق آقا (خدا) کا دل کھول کر شکر ادا کیا!

ظاہری محاسن و اوصاف

ابن جوزی اس لازوال دولت کے ساتھ دولت دنیا، دولت عافیت اور دولت جمال سے بھی بہرہ مند تھے، موفوق عبداللطیف کہتے ہیں کہ وہ نہایت خوش پوشاک، خوش خوراک، خوش مذاق، اور نفیس طبع تھے، ابن الدینی کہتے ہیں کہ وہ شیریں زبان، شیوہ بیان، خوش آواز، موزوں قامت اور خوش اندام تھے، ان کو اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ فراخ دست اور باحرمت رکھا، اپنی صحت اور اعتدال مزاج کا بڑا اہتمام رکھتے، اور ایسی چیزوں کا استعمال کرتے رہتے، جو ذکاوت و لطافت مزاج میں عین میں صید النخاط میں جا بجا صحت کی حفاظت، اعتدال مزاج، اور بد پرہیزی سے پرہیز کرنے کی تلقین کی ہے، تلبیس ابلیس میں زہد کے مبالغہ آمیز اور تشددانہ عجیب رجحانات پر جا بجا تنقید کی ہے۔

بلند ہمتی اور جامعیت کا شوق

ان کی خاص صفت ان کی عالی ہمتی، اور کسب کمالات اور جامعیت کا شوق ہے، جس کا اظہار انھوں نے اپنے حالات میں جا بجا کیا ہے، انھوں نے جب کبھی مشہور حوصلہ مندوں اور بلند ہمتوں کا جائزہ لیا ہے، ان کی حوصلہ مندی اپنی بلند ہمتی کے سامنے لپست اور محدود نظر آئی ہے، صید النخاط میں ایک جگہ تفصیل سے لکھتے ہیں:-

«انسان کے لئے سب سے بڑی ابتلا اس کی بلند ہمتی ہے، اس لئے کہ جس کی ہمت بلند ہوتی ہے، وہ

بلند سے بلند مراتب کو انتخاب کرتا ہے، پھر کبھی زمانہ مساعد نہیں ہوتا، کبھی وسائل مفقود ہوتے ہیں، تو ایسا شخص ہمیشہ کوفت میں رہتا ہے مجھے بھی اللہ تعالیٰ نے بلند حوصلہ عطا فرمایا ہے اور اس کی وجہ سے میں بھی تکلیف میں ہوں، لیکن میں یہ بھی نہیں کہتا کہ کاش مجھے یہ بلند حوصلہ عطا ہوتا، اس لئے کہ زندگی کا پورا لطف اور بے فکری بے عقلی اور بے حسی کے بغیر نہیں، اور صاحب عقل یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی عقل کم کر دی جائے اور زندگی کا لطف بڑھا دیا جائے، میں نے کئی آدمیوں کو دیکھا کہ وہ اپنی بلند ہمتی کا بڑی اہمیت ذکر کرتے ہیں، لیکن غور کیا تو معلوم ہوا کہ ان کی ساری بلند ہمتی صرف ایک ہی صفت اور شعبہ میں ہے، اس کے علاوہ دوسرے شعبوں میں (جو بعض اوقات ان کے شعبہ سے زیادہ اہم ہوتے ہیں) ان کو اپنی کمی یا پستی کی کوئی پروا نہیں، شریف رضی اپنے ایک شعر میں کہتا ہے:

کہ ہر جسم کی لاغری کا ایک سبب ہے، اور میرے جسم کی مصیبت میری بلند ہمتی ہے، لیکن میں نے اس کے حالات کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ حکومت کے سوا اس کا کوئی مطلع نظر نہ تھا، ابو مسلم خراسانی اپنی جوانی کے زمانہ میں سوتاز تھا، کسی نے اس سے سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ دماغ روشن، ہمت بلند، نفس بندیوں کا حریف، اس سبب ہوتے ہوئے پست اور محدود زندگی، بھلا نیند کس طرح آئے؟ کسی نے کہا کہ تمہاری تسکین کس طرح ہو سکتی ہے؟ کہا کہ صرف اس طرح کہ سلطنت حاصل ہو جائے، لوگوں نے کہا کہ پھر اس کی کوشش کرو، اس نے کہا کہ یہ خطروں میں پڑے اور جان کی بازی لگائے بغیر ممکن نہیں، لوگوں نے کہا کہ پھر کیا مانع ہے؟ کہا کہ عقل روکتی ہے، پوچھا گیا کہ پھر کیا ارادہ ہے؟ کہا کہ پھر عقل کا مشورہ قبول نہیں کروں گا، اور نادانی کے ہاتھ میں اپنی باگ ڈور سے دوں گا، نادانی سے خطرہ مول لوں گا اور جہاں عقل کے بغیر کام نہیں چلتا، وہاں عقل سے کام لوں گا، اس لئے کہ گمنامی اور افلاس لازم و ملزوم ہیں، میں نے اس فریب خوردہ حوصلہ مند (ابو مسلم) کے حالات پر نظر کی تو معلوم ہوا کہ اس نے سب اہم مسئلہ ہی کی بیخ کنی کر دی، اور وہ سلا آخرت ہے، وہ حکومت کی طلب میں دیوانہ رہا، اس کی خاطر

اس نے کتنا خون بہایا، کتنے بے گناہ بندگان خدا کو قتل کیا، یہاں تک کہ اس کو دنیاوی لذتوں کا ایک قلیل حصہ حاصل ہوا، جو اس کا مطلوب تھا، لیکن اس کو آٹھ سال سے زیادہ اس سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہ ملا، اس کو دھوکہ سے قتل کر دیا گیا، وہ اپنی عقل سے اپنا کوئی بندوبست نہ کر سکا، اور (سفاح کے ہاتھوں) قتل ہو کر دنیا سے بڑی بڑی حالت میں رخصت ہو گیا، اسی طرح متنبتی نے اپنی بلند ہمتی اور حوصلہ مندی کا بڑا ترانہ گایا ہے، لیکن میں نے دیکھا کہ اس کو محض دنیا کی ہوس تھی۔

لیکن میری عالی ہمتی کا معاملہ عجیب ہے، میں علم کا وہ درجہ حاصل کرنا چاہتا ہوں، جہاں تک مجھے یقین ہے کہ پہنچ نہیں سکوں گا، اس لئے کہ میں تمام علوم کا حصول چاہتا ہوں، خواہ ان کا کچھ مصنوع ہو، پھر ان میں سے ہر علم کی تکمیل اور احاطہ چاہتا ہوں، اور اس مقصد کے ایک حصہ کا حصول بھی اس چھوٹی سی عمر میں ناممکن ہے، پھر میرا یہ حال ہے کہ اگر کسی فن میں کسی کو کمال حاصل ہوتا ہے، اور دوسرے فن میں وہ ناقص ہوتا ہے، تو مجھے وہ ناقص نظر آتا ہے، مثلاً محدث فقہ سے بے بہرہ ہے، فقہ حدیث سے بے خبر، میرے نزدیک علم کا نقص ہمت کی پستی کا نتیجہ ہے، پھر علم سے میرا مقصود پورا پورا عمل ہے، میرا چاہتا ہے کہ مجھ میں بشر حافی کی احتیاط اور معروف کرنی کا زہد جمع ہو جائے، پھر بہت قصانیت کے مطالعہ، عامۃ الناس اور بندگان خدا کو تعلیم و افادہ اور ان کے ساتھ رہنے سہنے کے مشاغل کے ساتھ بہت مشکل ہے، پھر میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ مخلوق سے مستغنی رہوں، اور بجائے ان کا احسان لینے کے ان پر احسان کرنے کے قابل بن سکوں، درآئیں ایک علم کے ساتھ اشتغال کسب معاش سے مانع ہے، دوسروں کا ممنون ہونے اور ان کے سلوک و ہدایا کو قبول کرنے کو میری ہمت گوارا نہیں کرتی، پھر مجھے اولاد کی بھی خواہش ہے، اور بلند پایہ قصانیت کا بھی شوق ہے، تاکہ یہ سب میری یادگار اور دنیا سے جانے کے بعد میرے قائم مقام ہوں، اس کا اہتمام کیا جائے تو دل کے پسندیدہ اور محبوب مشغلہ خلوت و تنہائی میں فرق آتا ہے، اور طبیعت میں انتشار پیدا ہوتا ہے، پھر مجھے طبیعت

مستحبات سے جائز لطف لینے کا بھی شوق ہے، لیکن اس میں مال کی کمی سدا رہا ہے، پھر اگر اس کا سامان بھی ہو جائے تو جمعیت خاطر خصت اسی طرح میں ان غذاؤں اور ایسے کھانے پینے کا بھی شائق ہوں، جو جسم کے موافق اور اس کے لئے مفید ہوں، اس لئے کہ میرا جسم نفاست پسند اور شائق واقع ہوا ہے، لیکن مال کی کمی یہاں بھی رکاوٹ بنتی ہے، یہ سب درحقیقت اضداد کو جمع کرنے کی کوشش ہے، بھلا اس عالی ہمتی کا مقابلہ وہ لوگ کیا کر سکتے ہیں، جن کو صرف دنیا مطلوب ہے، پھر میری خواہش یہ بھی ہے کہ دنیا کا حصول اس طرح ہو کہ میرے دین پر آئینہ نہ آئے، اور وہ بالکل محفوظ ہو، اور نہ میرے علم اور عمل پر کچھ اثر پڑے، میری بے چینی کا کوئی کیا اندازہ کر سکتا ہے، ایک طرف مجھے شب بیداری عزیز ہے، احتیاط و تقویٰ کا اہتمام ہے، دوسری طرف علم کی اشاعت و افادہ اور تصنیف و تالیف اور جسم کے مناسب غذائیں بھی مطلوب ہیں، اور یہ بغیر قلب کی مشغولیت کے ممکن نہیں، ایک طرف لوگوں سے ملنا جلنا اور ان کی تعلیم بھی ضروری ہے، دوسری طرف خلوت و تنہائی کی دعا و مناجات کی حلاوت میں کمی ہو تو اس پر سخت تاسف و رنج ہوتا ہے، متعلقین کے لئے قوت المایوت کا انتظام کیا جائے تو زہد و احتیاط کے معیار میں فرق آتا ہے، لیکن میں نے اس ساری تکلیف اور کوفت کو گوارا کر رکھا ہے، اور راضی برضا ہو گیا ہوں، اور شاید میری اصلاح و ترقی اسی تکلیف و کشمکش میں ہے، اس لئے کہ بلند ہمت ان اعمال کی فکر میں رہتے ہیں، جو خدا کے یہاں باعث تقرب ہیں، میں اپنے انفاس کی حفاظت کرتا ہوں، اور اس سے احتیاط کرتا ہوں، اور اس سے احتیاط کرتا ہوں کہ ایک سانس بھی کسی لایعنی کام میں صرف ہو، اگر میرا مطلوب حاصل ہو گیا تو سبحان اللہ ورنہ نیت المؤمن خیر من عملہ^۱۔

مجالس و عطا اور تاثیر

ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ان کے انقلاب انگیز مواعظ اور مجالس درس ہیں، ان مجالس و عطا

نے سارے بغداد کو زیر و زبر کر رکھا تھا، خلفاء و سلاطین، وزراء اور اکابر علماء، ان میں بڑے اہتمام اور بڑے شوق سے شرکت کرتے، ہجوم کا یہ حال تھا کہ ایک ایک لاکھ آدمی ایک ایک وعظ میں شمار کئے گئے، وہیں دس ہزار ہزار آدمیوں سے تو کسی طرح کبھی کم نہ ہوتے، تاثیر کا یہ عالم تھا کہ لوگ غش کھا کھا کر گرتے، وجد و شوق میں گریبا پھاٹے، لوگوں کی چنچیں نکل جاتیں، آنسوؤں کی جھڑپیاں لگ جاتیں، توبہ کرنے والوں کا کچھ شمار نہ تھا، اندازہ کیا گیا ہے کہ بیس ہزار یہودی عیسائی ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے، اور ایک لاکھ آدمیوں نے توبہ کی تھی۔

ابن جوزی نے اپنی مجالس و عطا میں بدعات و منکرات کی کھل کر تردید کی، عقائد صحیحہ اور سنت کا اظہار کیا، اپنی بے مثل خطابت، زبردست علمیت اور عام رجوع کی وجہ سے اہل بدعت کو ان کی تردید کا حوصلہ نہ ہوا، سنت کو ان کے مواعظ و درس اور تصنیفات سے بہت فروغ ہوا، اور خلیفہ وقت اور امرا بھی امام احمد کے (جو اس زمانہ میں مسلک سلف اور طریقہ سنت کی نشانی سمجھے جاتے تھے) معتقد اور ان کے مذہب کی طرف مائل ہو گئے۔

ان کی ناقدانہ تصانیف

ابن جوزی نے زبانی وعظ و تقریر پر اکتفا نہیں کیا، انھوں نے متعدد کتابیں ایسی لکھیں، جنھوں نے علمی طبقہ پر اثر ڈالا، اور غلط رجحانات کی اصلاح کی۔

کتاب الموضوعات

یہ موضوعات حدیث پر ان کی ایک کتاب ہے، جس میں انھوں نے ان حدیثوں کی حقیقت بیان کی ہے، جن سے اس زمانہ کے اہل ہوی یا ضعیف العلم متصوفین استدلال کرتے تھے، اور وہ لوگوں کی گمراہی اور

صد با غلط فہمیوں کا باعث بنتی تھیں اس طرح انھوں نے اس شاخ پر پیشہ چلایا جس پر اہل بدعت نے آشیانہ بنایا تھا، اگرچہ اس میں ان سے خود کہیں کہیں بے اعتدالی ہوئی ہے اور انھوں نے کہیں کہیں سخت فیصلہ صادر کیا ہے، مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس کتاب نے ایک مفید خدمت انجام دی۔

تلبیس ابلیس

ان کی دوسری ناقدانہ تصنیف تلبیس ابلیس ہے جو ان کی نقاد طبیعت اور سلفی ذوق کا اصلی نمونہ ہے اس کتاب میں انھوں نے اپنے زمانہ کی پوری مسلمان سوسائٹی کا جائزہ لیا ہے اور مسلمانوں کے ہر طبقہ اور ہر جماعت کو سنت و شریعت کے معیار سے دیکھا ہے اور اس کی کمزوریوں بے اعتدالیوں اور غلط فہمیوں کی نشاندہی کی ہے اور دکھلایا ہے کہ شیطان نے کس کس طرح سے اس امت کو دھوکا دیا ہے اور کن کن راہوں سے اس کے عقائد اعمال اور اخلاق میں رخنہ اندازی کی ہے انھوں نے اس کتاب میں کسی طبقہ اور کسی شخص کی رعایت نہیں کی اور کسی کو معاف نہیں کیا ہے اس میں علماء و محدثین فقہاء و واعظین ادباء شعراء سلاطین و حکام عباد و زہاد صوفیہ اہل دین اور عوام کی علیحدہ علیحدہ کمزوریاں غلط رسوم و عادات مغالطے اور بے اعتدالیوں بیان کی ہیں یہ کتاب ان کی وسعت نظر زندگی سے واقفیت باریک بینی اور دقیقہ رسی کا کامیاب نمونہ ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے شیطان کی نفسی و سیاسی گاہر مطالعہ کیا تھا اور مذاہب کی تاریخ اور گمراہ فرقوں کے عقائد سے وہ بہت باخبر تھے۔

مختلف طبقات پر تنقید

اس کتاب میں اگرچہ کہیں کہیں وہ اپنی تنقید میں حد سے بڑھ گئے ہیں اور انھوں نے فیصلہ کرنے میں عجلت اور شدت سے کام لیا ہے، مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس کتاب میں بڑی کارآمد چیزیں بڑے بیش قیمت

اقتباسات اور بہت سی صحیح تنقیدیں ملتی ہیں اور اکثر جگہ ماننا پڑتا ہے کہ ان کی گرفت صحیح اور ان کی تنقید حق بجانب ہے، یہاں پر اس کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں۔

اپنے زمانہ کے ان علماء پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں جو فقہ کے مسائل و جزئیات میں دن رات منہمک تھے اور اس فن میں مونثکافیال کرتے رہتے تھے۔

”ان فقہاء کی ایک کمزوری یہ ہے کہ ان کا سارا انہماک سی غور و فکر میں ہے انھوں نے اپنے فن میں ان چیزوں کو شامل نہیں کیا ہے جن سے قلوب میں رقت پیدا ہوتی ہے، مثلاً قرآن مجید کی تلاوت حدیث و سیرت کی سماعت اور صحابہ کرام کے حالات کا مطالعہ و بیان، سب جانتے ہیں کہ محض ازالہ عجز اور استغناء کے مسائل کے بار بار دہرانے سے قلوب میں نرمی اور خشیت نہیں پیدا ہو سکتی، قلوب کو تذکیر اور مواعظ کی ضرورت ہے تاکہ آخرت طلبی کی ہمت اور شوق پیدا ہو، اختلافی مسائل اگرچہ علوم شریعت سے خارج نہیں، مگر حصول مقصد کے لئے کافی نہیں ہیں جو سلف کے حالات اور ان کے حقائق و اسرار سے واقف نہیں اور جن کے مذہب کو اس نے اختیار کیا ہے ان کے حالات سے باخبر نہیں، وہ ان کے راستہ پر کیسے چل سکتا ہے یا درکھنا چاہئے کہ طبیعت چور ہے، اگر اس کو اسی زمانہ کے لوگوں کے ساتھ چھوڑ دیا جائے گا تو وہ اہل زمانہ کے طبائع سے اخذ کر لے گی اور ان ہی کی طرح ہو جائے گی اور اگر تنقید میں کے حالات اور طریقوں کا مطالعہ کیا جائے گا تو ان کے ساتھ چلنے کی کوشش کی جائے گی، اور ان کا رنگ اور ان کے سے اخلاق پیدا ہوں گے، سلف میں سے ایک بزرگ کا مقولہ ہے کہ ایک حدیث جس سے میرے دل میں رقت پیدا ہو، قاضی شریح کے سو فیصلوں

سے مجھے زیادہ محبوب ہے“

واعظین پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”ان میں سے اکثر لوگ بڑی آراستہ اور بڑی پرتکلف عبارت بولتے ہیں جو اکثر بے معنی ہوتی ہے“
 اس زمانہ میں مواعظ کا بڑا حصہ حضرت موسیٰ کوہ طور بوسف زلیخا کے قصوں سے متعلق ہوتا ہے
 فرانس کا بہت کم تذکرہ آنے پاتا ہے اسی طرح گناہ سے بچنے کا ذکر کبھی نہیں ہوتا، ایسے مواعظ سے
 ایک زانی ایک سودخوار کو توبہ کرنے کی ترغیب اور توفیق کیسے ہو سکتی ہے اور کب عورت کو شوہر کے
 حقوق ادا کرنے اور اپنے تعلقات درست کرنے کا خیال پیدا ہو سکتا ہے اس لئے کہ یہ مواعظ ان
 مضامین سے خالی ہوتے ہیں ان واعظوں نے شریعت کو پس پشت ڈال دیا ہے اسی لئے ان کا
 بازار خوب گرم ہے اس لئے کہ حق ہمیشہ طبیعتوں پر بھاری ہوتا ہے اور باطل ہلکا اور خوشگوار^۱
 آگے لکھتے ہیں:-

”کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ واعظ سچا اور خیر خواہ ہوتا ہے، لیکن جاہ طلبی اس کے دل میں سرایت
 کر چکی ہوتی ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس کی عزت و تعظیم کی جائے، اور اس کی علامت یہ ہے کہ اگر دوسرا
 واعظ اس کی قائم مقامی کرے، یا اصلاح کے کام میں اس کی مدد کرنا چاہے تو اس کو ناگوار ہوتا
 ہے، حالانکہ اگر یہ مخلص ہوتا، تو اس کو اس سے کبھی ناگواری نہ ہوتی“^۲
 یہی تنقید ان کی علماء پر بھی ہے کہ:-

”اگر طلبہ کسی اور عالم یا مدرس کے پاس چلے جائیں جو علم میں اس سے فائق ہے تو اس عالم کو
 اس سے بڑی گرانی ہوتی ہے، یہ مخلص کی شان نہیں ہے، اس لئے کہ مخلص علماء اور مدرسین کی مثال طباطبائی
 کی سی ہے، جو بوجہ اللہ مخلوق کا علاج کرتے ہیں، اس لئے کہ اگر کسی مریض کو کسی طبییب کے ہاتھ سے شفا
 ہو جائے تو دوسرا خوش ہوتا ہے“^۳
 حکام و سلاطین پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

۱۔ تلخیص ابلیس ص ۱۲۵ ۲۔ ایضاً ۳۔ تلخیص ابلیس ص ۱۳۱ (نقد مسالک العلماء، انکالمین)۔

”یہ حضرات شریعت کے مقابلہ میں اپنی رائے پر عمل کرتے ہیں کبھی اس شخص کا ہاتھ کاٹتے ہیں جس کا ہاتھ کاٹنا
 جائز نہیں، اور کبھی اس کو قتل کرتے ہیں جس کا قتل حلال نہیں، ان کو یہ دھوکہ ہے کہ یہ سیاست جس کا دوسرا
 مطلب یہ ہے کہ شریعت ناقص ہے، اس کو تکمیل اور ضمیر کی ضرورت ہے، اور ہم اپنی رائے سے اس کی تکمیل کر رہے ہیں
 یہ شیطان کا بہت بڑا فریب ہے اس لئے کہ شریعت سیاست الہی ہے اور محال ہے کہ خدائی سیاست میں
 کوئی خلل یا کمی ہو، جس کی وجہ سے اس کو مخلوق کی سیاست کی ضرورت ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے مَا وَفَّظْنَا
 فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ (ہم نے کتاب میں کوئی چیز نہیں چھوڑی) اور ارشاد ہے کہ لَا مَعْصِيَةَ لِمَنْ دُونِ اللَّهِ
 (اس کے حکم کو کوئی مٹانے والا نہیں) تو جو اس سیاست کا مدعی ہے، وہ دراصل شریعت میں خلل
 اور کمی کا دعویٰ کرتا ہے اور یہ کفر کی بات ہے“

ان حکام و امراء اور سلاطین کی ایک دوسری کمزوری اور مغالطہ کا ذکر کرتے ہیں:-
 ”معاہدہ پر اصرار کے ساتھ ساتھ ان کو صلحی، کی ملاقات کا بھی بڑا شوق ہوتا ہے اور ان سے
 وہ اپنے حق میں عائن کرتے ہیں، شیطان اس کو سمجھاتا ہے کہ اس گناہوں کا پلہ ہلکا ہو جائے گا، حالانکہ اس
 خیر سے اس شر کا و فحیہ نہیں ہو سکتا، ایک مرتبہ ایک تاجر ایک محصول وصول کرنے والے کے پاس گزرا، اس چنگی
 وائے نے اس کی کشتی روک لی، وہ تاجر اپنے زمانہ کے مشہور مرد صالح مالک بن دینار کے پاس آیا، اور ان سے
 واقف بیان کیا، مالک بن دینار چنگی والے کے پاس گئے، اور اس تاجر کی سفارش کی، اس نے اس کی بڑی تعظیم
 کی، اور کہا کہ آپ کیوں زحمت فرمائی، وہیں سے کہلوادیا ہوتا، ہم تعمیل کرتے، پھر اس نے ان سے دعا
 کی درخواست کی، انھوں نے اس برتن کی طرف اشارہ کر کے (جس میں وہ چنگی کا ناجائز روپیہ وصول کر کے
 رکھتا تھا) فرمایا کہ اس برتن سے کہو کہ وہ تمہارے لئے دعا کرے، پھر فرمایا کہ میں تمہارے حق میں کیا دعا
 کروں جبکہ ہزار آدمی تمہارے لئے بد دعا کرتے ہیں، کیا ایک آدمی کی سُن لی جائے گی، اور ہزار کی سُن لی جائے گی“

۱۔ نقد مسالک الولاة و السلاطین ص ۱۳۲ ۲۔ ایضاً ص ۱۳۳

ایک جگہ اس کا ذکر کرتے ہیں کہ "ان امراء اور دنیا داروں کو علماء و فقہاء سے زیادہ خلافت شرع پیروں اور گانے بجانے والے صوفیوں سے عقیدت و محبت ہوتی ہے اور ان پر وہ بڑی فراخ دلی سے خرچ کرتے ہیں، جبکہ اہل علم پر ایک پیسہ خرچ کرنا ان کو بار ہوتا ہے، اس لئے کہ علماء اطباء کی طرح ہیں اور دوا میں خرچ کرنا انسان کو بڑا بار معلوم ہوتا ہے، لیکن ان پیروں اور قوالوں پر خرچ کرنا ایسا ہی ہے جیسا مغنیات (گانے والی عورتوں) پر خرچ کرنا، یہ بھی ان کے لئے گولیوں اور مداریوں کی طرح سامان تفریح اور لازمہ ریاست ہیں۔"

اسی طرح سے یہ لوگ بناوٹی زاہدوں اور تارک لدنیاء و لیشوں کے بڑی جلدی معتقد ہوتے اور ان کو علماء پر ترجیح دیتے ہیں، یہ لوگ اگر سب بڑے جاہل کے جسم پر درویشی کا لباس دیکھ لیں تو فوراً معتقد ہو جائیں اور اگر وہ سر کو جھکائے اور شروع و خضوع کا اظہار کرے تو فریفتہ ہونے میں دیر نہیں لگتی، اور کہتے ہیں کہ بھلا اس درویش اور فلاں عالم کا کیا مقابلہ، یہ تارک لدنیاء وہ طالب دنیا، یہ اچھی غذائیں کھاتا ہے، نہ شادی کرتا ہے، حالانکہ محض جہالت ہے، اور شریعت محمدی کی تحقیر ہے کہ ایسے زہد کو علم پر ترجیح دی جائے، خدا کا بڑا احسان ہے کہ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ تھے، ورنہ اگر آپ کو شادیاں کرتے، پاک صاف چیزیں کھاتے اور میٹھے اور شہد کی رغبت رکھتے ہوئے پاتے تو آپ سے بھی بد اعتقاد ہو جاتے۔"

عوام پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"شیطان نے بہت سے عوام کو یہ دھوکہ دے رکھا ہے کہ وعظ و ذکر کی مجالس میں شریک ہونا اور متاثر ہو کر رونا ہی سب کچھ ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ مقصود محفل خیر میں شرکت اور رقت ہے، اس لئے کہ وہ واعظوں سے اس کے فضائل سنتے رہتے ہیں، اگر ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ مقصود عمل ہے، تو یہ سننا اور عمل کرنا ان کے لئے گرفت کا باعث اور وبال جان ہے، میں ذاتی طور پر بہت آدمیوں کو

جاننا ہوں، جو سالہا سال سے مجلس وعظ میں شریک ہوتے ہیں، اور روتے ہیں، متاثر ہوتے ہیں، لیکن نہ سود لینا چھوڑتے ہیں نہ تجارت میں دھوکہ دینے سے باز آتے ہیں، ارکان صلوة سے جیسے وہ بے خبر برسوں پہلے تھے، ویسے ہی اب بھی ہیں، مسلمانوں کی غیبت، والدین کی نافرمانی میں جس طرح پہلے مبتلا تھے، اسی طرح اب بھی مبتلا ہیں، شیطان نے ان کو یہ جُل دے رکھا ہے کہ مجلس وعظ کی حاضری اور گریہ و بکا ان کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا، بعض کو یہ سمجھا رکھا ہے کہ علماء و صاحبین کی صحبت ہی مغفرت کا ذریعہ ہے۔"

دولت مندوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"ان میں سے بہت سے لوگ مساجد اور پلوں کی تعمیر میں بہت کچھ خرچ کرتے ہیں، مگر ان کا مقصود ریا اور شہرت ہوتی ہے اور یہ کہ ان کا نام چلے اور یادگار رہے، چنانچہ وہ اس تعمیر پر اپنا نام کندہ کرواتے ہیں، اگر رضائے الہی مقصود ہوتی تو اس کو کافی سمجھتے کہ اللہ دیکھتا اور جانتا ہے، ایسے لوگوں سے اگر صرف ایک یو ارب بنانے کو کہا جائے جس پر ان کا نام کندہ نہ ہو تو وہ منظور نہ کریں گے۔ اسی طرح سے رمضان مبارک میں شہرت کے لئے موم بنیاں بھجیے ہیں، حالانکہ ان کی مسجدوں میں سال بھر اندھیرا پڑا رہتا ہے، اس لئے کہ روزانہ تھوڑا تھوڑا سا تیل مسجدوں میں دینے سے وہ شہرت اور ناموری حاصل نہیں ہوتی جو رمضان میں ایک موم بتی بھیج دینے سے حاصل ہوتی ہے۔"

”صید الخاطر“

”صید الخاطر ایک کشکول ہے جس میں مصنف نے اپنے قلبی تاثرات، بے تکلف خیالات، زندگی کے تجربات اور منتشر افکار و حوادث قلمبند کئے ہیں، اور اپنی بہت سی کمزوریوں اور غلطیوں کا بے تکلف

اعتراف کیا ہے، اس کتاب میں جا بجا نفس سے مکالمے، سوال و جواب، ذہنی کشمکش کی روداد، معاشرتی زندگی کے تجربے، عورتوں، نوکروں، اور دوستوں کے متعلق تجربہ کی باتیں، اور مفید ہدایات روزمرہ کے واقعات کی تحلیل، امراض نفسانی کا بیان، مختلف طبقات پر تنقید، نفس کا احتساب اور صدمہ ہاکام کی باتیں ہیں، اس کتاب کی ایک بڑی خصوصیت صداقت اور سادگی و بے تکلفی ہے پوری کتاب اپنے زمانہ کے ادباء و مصنفین کے طرز کے خلاف نہایت رواں و بے تکلف عبارت میں لکھی گئی ہے، اور اپنے موضوع پر غالباً ایک عرب عالم و مصنف کی پہلی کتاب ہے۔

عام واقعات سے بڑے بڑے نتائج

ابن جوزی اس کتاب میں چھوٹے چھوٹے واقعات اور روزمرہ کے مشاہدات سے بڑے بڑے نتائج نکالتے ہیں، اور یہی ایک عامی اور ایک صاحب نظر میں فرق ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:-

”میں نے دو مزدوروں کو دیکھا کہ ایک بھاری شہتیر اٹھا کر لے جائے ہیں، اور دونوں کچھ گاہے ہیں، ایک مصرعہ پڑھتا ہے، دوسرا ترنم کے ساتھ اس کا جواب دیتا ہے، ایک پڑھتا ہے، تو دوسرا کان لگا کر سنتا ہے، پھر دوسرا اس کو دہراتا ہے، یا اسی طرح کے مصرعے سے جواب دیتا ہے، مجھے خیال ہوا کہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کو محنت اور بوجھ کا احساس زیادہ ہو، لیکن اس ترکیب سے ان کا کام آسان ہو جاتا ہے، میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ ذہن اتنی دیر دوسرے کام میں لگ کر سستا لیتا ہے، اور کچھ سرور حاصل کر لیتا ہے، اور جواب کی فکر میں غل ہو کر اس میں تازگی پیدا ہو جاتی ہے، اور اس طرح راستہ طے ہو جاتا ہے، اور بوجھ کے احساس سے غفلت ہو جاتی ہے، اس سے میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ انسان نے شرعی ذمہ داریوں اور فرائض کا بڑا بوجھ اٹھا رکھا ہے، اور سب سے بڑا بوجھ اپنے نفس کی سیاست ہے، بڑا کام یہ ہے کہ اس کو

اس کے مرغوبات سے روکا جائے، اور جن چیزوں سے اس کو رغبت نہیں ان پر اس کو قائم رکھا جائے، میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ صبر کے راستے کو تسلی اور نفس کی جائز دلداری کی مدد سے قطع کیا جائے، جیسا کسی شاعر نے کہا ہے کہ ”رات بھر چلنے سے سواریاں تھک جائیں اور فریاد کریں، تو صبح کی روشنی کی امید دلاؤ اور دن چڑھے آرام کرنے کا وعدہ کر لو“

اسی طرح کی حکایت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ وہ اور ان کے ایک ساتھی کہیں جا رہے تھے، ساتھی کو پیاس لگی، اس نے کہا کہ اس کنویں سے پانی پی لیں، بشر حافی نے کہا کہ اگلے کنویں سے پی لیں گے، جب وہ کنواں آیا تو بشر حافی نے آگے کے کنویں کی طرف اشارہ کیا کہ وہاں تک صبر کرو، اسی طرح تسلی دیتے ہوئے بہت دور لے آئے، پھر اس سے کہا کہ اسی طرح دنیا کا سفر طے ہو جاتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ جس نے اس نکتہ کو سمجھ لیا، وہ اپنے نفس کو بہلائے گا، اور اس کی دُجونی کرے گا، اور اس سے وعدہ کرتا ہے گا، تاکہ وہ اپنے بوجھ کو سنبھال سکے، اور اس پر صبر کرے، بعض بزرگان سلف فرماتے تھے کہ ”اے نفس میں تجھے تیرے مرغوب چیز سے جو روکتا ہوں تو محض شفقت اور خوف کی بنا پر، بائزید بسطامی کا قول ہے کہ اپنے نفس کو خدا کی طرف بڑھائے لے جاتا اور وہ روتا روتا تھا، پھر رفتہ رفتہ ہنستا کھیلتا اللہ کی طرف بڑھنے لگا، یاد رکھنا چاہئے کہ نفس کی خاطر داری اور ملاحظت ضروری ہے، اور راستہ اسی طرح طے ہوتا ہے، ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

”میں نے دیکھا ہے کہ شکاری کتے جب محلہ کے کتوں کے پاس سے گزرتے ہیں، تو محلہ کے کتے تو ان کو بھونکتے ہیں، اور بہت شور مچاتے ہیں، اور ان کے پیچھے دوڑتے ہیں، وہ دیکھتے ہیں کہ ان کتوں کی بڑی عزت ہے، ان پر جھول پڑی ہے تو ان کو ان پر حسد آتا ہے، لیکن اس کے برخلاف شکاری کتے ان کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے، اور ان کو خاطر میں نہیں لاتے، اور ان کے بھونکنے کی کچھ پرواہ نہیں کرتے، اس سے ایسا معلوم

ہوا کہ شکاری کتے گویا ان کتوں کی قوم ہی میں سے نہیں ہیں اس لئے کہ مقامی کتے موٹے موٹے بدن اور
 بھدے اعضا کے ہیں ان میں امانت کی صفت نہیں، لیکن شکاری کتے نازک اور پھرتیلے ہیں اور جیسا
 ان کا بدن نازک اور پھرتیلا ہے اسی طرح ان کے عادات ہندب ہیں وہ جب شکار کرتے ہیں تو کیا
 مجال ہے کہ اس کو منہ لگائیں مالک کے ڈر سے یا اس کے احسانات کے شکر یہ میں وہ اس شکار کو
 جوں کا توں پہنچا دیتے ہیں اس سے ایک بات تو میں سمجھا کہ بدن اور اخلاق میں خاص مناسبت
 ہوتی ہے، اگر وہ لطیف ہے تو یہ بھی لطیف ہیں دوسرے یہ معلوم ہوا کہ آدمی کو اس پر حسد نہیں آتا
 جس کو وہ اپنے طبقہ یا اپنی سطح کا نہیں سمجھتا اسی طرح جس کو اللہ تعالیٰ ایمان و عقل کی دولت سے
 سرفراز کرے اس کو اپنے اس حاسد پر حسد نہیں ہوتا، جو ایمان و عقل سے محروم ہو اور وہ اس کو
 قابلِ التفات نہیں سمجھتا، اس لئے کہ وہ دوسرے عالم میں ہے اور یہ دوسرے عالم میں وہ دنیا
 کی بنا پر حسد کرتا ہے اور اس کا مطمح نظر آخرت ہے اور دونوں میں بعد المشرقین ہے

واقعاتِ زندگی اور نفس سے مکالمہ

وہ واقعات کی پوری تحلیل کرتے ہیں اور خود اپنی زندگی کے واقعات میں نفس سے حکیمانہ مکالمہ
 کرتے ہیں، ایک مرتبہ انھوں نے دعا کی ایک دوسرے صالح بزرگ دعا میں شریک تھے دعا قبول ہوئی
 لیکن کس کی دعا قبول ہوئی، اس پر ان کا اپنے نفس سے مکالمہ ہوا۔
 ”مجھے ایک مرتبہ ایسا معاملہ پیش آیا جس میں اللہ سے مانگنے اور دعا کی ضرورت تھی میں نے دعا کی او
 اللہ سے سوال کیا، ایک صاحب صلاح اور اہل خیر بھی میرے ساتھ دعا میں شریک ہو گئے میں قبولیت
 کے کچھ آثار دیکھے میرے نفس نے کہا کہ یہ اس بزرگ کی دعا کا نتیجہ ہے، تمہاری دعا کا نتیجہ نہیں، میں نے کہا کہ

مجھے اپنے ایسے گناہوں اور کوتاہیوں کا علم ہے جن کی وجہ سے واقعی مجھے اس کا حق نہیں کہ میری دعا
 قبول ہو، لیکن کیا تعجب ہے کہ میری ہی دعا قبول ہوئی ہو، اس لئے کہ یہ مرد صالح ان گناہوں اور تقصیرات
 سے محفوظ ہے، جن کا مجھے اپنے متعلق علم ہے، لیکن مجھ میں اور اس میں ایک فرق ہے، مجھے اپنی تقصیر کی بنا پر
 دل شکستگی اور ندامت ہے، اور اس کو اپنے معاملہ پر فرحت و مسرور ہے، اور کبھی اعترافِ تقصیر ایسی
 ضرورتوں کے موقع پر زیادہ کارآمد اور موثر ہوتا ہے، اور ایک بات میں ہم اور وہ مساوی ہیں وہ یہ کہ
 ہم دونوں میں سے کوئی اپنے اعمال کی بنا پر فضل کا طالب نہیں تو اگر میں ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ
 ندامت سے گردن جھکا کر اور اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے کہوں کہ خدا یا مجھے معص اپنے
 فضل سے عطا فرما، میں بالکل خالی ہاتھ ہوں تو مجھے امید ہے کہ میری سن لی جائے گی اور ممکن ہے کہ
 اس کی نظر اپنے حسن عمل پر پڑے، اور یہ اس کے لئے روک بن جائے تو لے میرے نفس میرا دل زیادہ
 نہ توڑو پہلے ہی بہت ٹوٹا ہوا ہے مجھے اپنے حالات کا ایسا علم ہے جس کا تقاضا ادب اور
 تواضع ہے، پھر اپنی تقصیر کا اقرار ہے جس چیز کا میں نے سوال کیا ہے اس کا بے حد محتاج ہوں
 اور جس سے سوال کیا ہے اس کے فضل کا یقین ہے، اور یہ سب باتیں اس عابد کو حاصل نہیں تو
 اللہ اس کی عبادت میں برکت کرے، میرا تو اعترافِ تقصیر ہی بڑے کام کی چیز ہے

ایک جگہ لکھتے ہیں:-

”ایک مرتبہ ایک ایسے معاملہ میں جو شرعاً مکروہ تھا، مجھے کچھ کشمکش درپیش تھی، نفس کچھ تاویل میں سامنے
 لاتا تھا، اور کراہت کو نظر سے ہٹاتا تھا، اور درحقیقت اس کی تاویلات فاسد تھیں، اور کراہت کی
 کھلی ہوئی دلیل موجود تھی، میں نے اللہ کی طرف رجوع کیا، اور دعا کی کہ اس کیفیت کو دور فرمائے اور
 قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دی، میرے درس کے سلسلہ میں سورہ یوسف شروع ہو رہی تھی، میں نے

وہیں سے شروع کیا وہ خیال دل پرستولی تھا، مجھے کچھ خبر نہ ہوئی کہ میں نے کیا پڑھا، جب اس آیت پر پہنچا: قَالَ مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ "تو میں چونکا اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ گویا میں ہی اس آیت کا مخاطب ہوں، مجھے دفعتاً ہوش آیا، اور آنکھوں سے غفلت کا پردہ دور ہوا، میں نے اپنے نفس سے کہہ تو نے خیال کیا؟ حضرت یوسف علیہ السلام آزاد تھے، وہ زبردستی اور ظلم سے غلام بنا کر بیچے گئے، انھوں نے اس شخص کا اتنا حق مانا جس نے ان کے ساتھ سلوک کیا تھا اور اس کو اپنا آقا کہا، حالانکہ وہ غلام تھے، نہ ان کا کوئی آقا تھا، پھر اپنی اس حق شناسی کی وجہ سے بیان کی کہ "أَحْسَنَ مَثْوَايَ" مجھے اچھی طرح سے رکھا، اب ذرا اپنے اوپر غور کرو تو حقیقتہً غلام ہے ایسے آقا جو تیرے وجود کے وقت برابر تیرے ساتھ احسانات کرتا رہا، اولتے بار اس تیری پردہ پوشی کی جس کا کوئی شمار نہیں، تجھے یاد نہیں کہ اس کس طرح تیری پرورش کی، تجھے سکھایا پڑھایا، تجھے وزی دی تیری حفاظت کی، تیرے اسباب ہیا کئے، بہترین راستہ پر تجھے ڈالا، اور ہر مکر و دشمنی سے تجھے بچایا، اور حسن صورت ظاہر کی ساتھ باطنی ذکاوت و وجود طبع عنایت فرمائی، علوم کو تیرے لئے سہل بنا دیا، یہاں تک کہ مختصر سے عرصہ میں تجھے وہ علوم حاصل ہوئے جو دوسروں کو طویل عرصہ میں نصیب نہیں ہوئے، تیری زبان پر علوم کو رواں کیا اور فصاحت و بلاغت کے ساتھ ان کی تعبیر کی قوت عطا فرمائی، اور مخلوق سے تیرے عیوب کو چھپایا، ان کا معاملہ تیرے ساتھ حسن ظن کا رہا، تیرا رزق بغیر اہتمام و تکلف کے تجھے تک پہنچایا، اور کسی کا احسان مند نہیں بنایا، اور وہ بھی فراغت و اطمینان و کشائش کے ساتھ، بخدا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے کس کس احسان کا تذکرہ کیا جائے، حسن صورت کا یا صحت اعضاء کا یا سلامت مزاج، یا اعتدال ترکیب کا یا لطافت طبع اور دنات ابدال سے بری ہونے کا، یا بچپن ہی سے سیدھے اور معتدل راستے کی توفیق کا، یا بے حیائیوں اور لغزشوں سے حفاظت کا، یا منقولات کی ترجیح اور حدیث و سنت کی اتباع اور تقلید جاد سے نجات کا

یا مبتدع کی پیروی اور اس کے سلسلہ میں شمولیت سے محفوظ رہنے کا، وَإِنْ تَعَدَّ وَإِنَّمَا اللَّهُ لَا تَحْصُوهُمَا "کتنے دشمنوں نے تیرے لئے جال بچھایا، اور اللہ تعالیٰ نے اس سے بچایا، کتنے مخالفوں نے تجھے کوسبک کرنا چاہا، اور اس نے تجھے سر بلندی عطا فرمائی، کتنی نعمتوں سے دوسرے محروم رہے اور تو ان سے سیراب کیا گیا، کتنے آدمی دنیا سے نامراد چلے گئے، اور تو شاد کام اور فائز المرام ہے، اس حالت میں تیرے دن گزر رہے ہیں کہ تیرا جسم صحیح سالم، دین محفوظ، علم روز افزوں، دلی مقاصد پورے اگر کوئی مقصد بر نہیں آتا تو اس کی طرف سے صبر پیدا کر دیا جاتا ہے، اور تجھے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے پورا نہ ہونے ہی میں حکمت الہی تھی، یہاں تک کہ تجھے یقین آجاتا ہے کہ یہی تیرے حق میں بہتر تھا، اگر میں پچھلے احسانات کو گنانا شروع کروں تو دفتر کے دفتر سیاہ ہو جائیں، اور وہ ختم نہ ہوں، اور تجھے معلوم ہے کہ جن احسانات کا تذکرہ میں نے نہیں کیا ہے، وہ ان سے کہیں زیادہ ہیں اور جن کا ذکر میں کیا ہے، ان کی طرف بھی میں نے صرف اشارہ کیا ہے، اس سب کے ساتھ تجھے کو ایسا فعل کرنا کیسے زیب دیتا ہے، جو اس کی مرضی کے خلاف ہے، مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي أَحْسَنَ مَثْوَايَ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ لَهُ۔

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

"میں نے ایک مرتبہ ایک ایسے مسلمان پر عمل کیا، جس کی بعض مذاہب (فقہیہ) میں گنجائش تھی، اور دوسرے مذاہب میں وہ جائز نہ تھا، اس پر عمل کرنے سے مجھے اپنے قلب میں بڑی قساوت محسوس ہوئی، اور ایسا معلوم ہوا کہ گویا میں راندہ درگاہ اور محتوب ہو گیا، اور کچھ محرومی اور گہری تاریکی محسوس ہوئی، میرے نفس نے کہا کہ یہ کیا بات ہے، تم تو دائرہ فقہاء سے نکلے نہیں، میں نے کہا کہ اے نفس بد! تیرے سوال کا جواب دو طرح سے ہے، اول تو یہ کہ تو نے اپنے عقیدہ کے خلاف تاویل کی، اگر خود تجھ سے

فتویٰ لیا جاتا تو اس کا فتویٰ نہ دیتا، اس نے کہا کہ اگر میں اس کے جواز کا قائل نہ ہوتا، تو کرتا کیوں؟ میں نے کہا کہ تو اپنے اس خیال کو دوسرے کے لئے رکھی فتویٰ کے طور پر پسند نہیں کرتا، دوسری بات یہ ہے کہ تجھے ظلمت کے اس احساس پر خوش ہونا چاہئے، اس لئے کہ اگر تیرے دل میں نور نہ ہوتا تو تجھ پر یہ اثر ہی نہ پڑتا، اس نے کہا کہ بہر حال مجھے اس ظلمت سے جو پلٹ پلٹ کر آتی ہے، وحشت ہے، میں نے کہا کہ پھر اس فعل کے ترک کا عزم کرے اور فرض کرنے کے لئے جس کو ترک کیا ہے، وہ بالا جماع جائز ہے، تب بھی برائے و روع و تقویٰ اس کو چھوڑنے کا وعدہ کر، چنانچہ اس عمل سے اس کیفیت سے اس کو نجات ملی۔

سلف صالحین کے حالات کے مطالعہ کی ضرورت

وہ باوجود محدث و فقیہ ہونے کے اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے کہ قلب کی اصلاح اور ذوق و شوق پیدا کرنے کے لئے موثر واقعات اور سلف صالحین کے حالات کے مطالعہ کی ضرورت ہے، "ابلیس" اور "صید الخاطر" دونوں میں فقہاء و محدثین اور طلبہ و علماء کو وہ اس کا مشورہ دیتے ہیں، اور اپنا تجربہ بیان کرتے ہیں، "صید الخاطر" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"میں نے دیکھا کہ فقہ اور سماع حدیث میں انہماک و مشغولیت قلب میں صلاحیت پیدا کرنے کے لئے کافی نہیں، اس کی تدبیر یہی ہے کہ اس کے ساتھ موثر واقعات اور سلف صالحین کے حالات کا مطالعہ بھی شامل کیا جائے، حرام و حلال کا خالی علم قلب میں رقت پیدا کرنے کے لئے کچھ زیادہ سود مند نہیں، قلوب میں رقت پیدا ہوتی ہے، موثر احادیث و حکایات اور سلف صالحین کے حالات سے، اس لئے کہ ان نقول و روایات کا جو مقصود ہے، وہ ان کو حاصل تھا، احکام پر ان کا عمل شکلی اور ظاہری نہ تھا، بلکہ ان کو ان کا اصلی ذوق اور لب باب حاصل تھا، اور یہ جو میں تم سے کہہ رہا ہوں وہ عملی تجربہ اور

خود آزمائش کرنے کے بعد ہے، میں نے دیکھا ہے کہ عموماً محدثین اور طلبہ فن حدیث کی ساری توجہ اونچی سند حدیث اور کثرت مرویات کی طرف ہوتی ہے، اسی طرح عام فقہاء کی تمام توجہ تہجد ریات اور جہد کوزیر کرنے والے علم کی طرف ہوتی ہے، بھلا ان چیزوں کے ساتھ قلب میں کیا گداز اور رقت پیدا ہو سکتی ہے، سلف کی ایک جماعت کسی نیک اور بزرگ شخص سے محض اس کے طور طریقہ کو دیکھنے کے لئے ملنے جاتی تھی، علم کے استفادہ کے لئے نہیں، اس لئے کہ یہ طور و طریقہ اس کے علم کا اصلی پھل تھا، اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لو اور فقہ و حدیث کی تحصیل میں سلف صالحین اور زہاد امت کی سیرت کا مطالعہ ضرور شامل کرو تاکہ اس سے تمہارے دل میں رقت پیدا ہو۔

صلحاء امت کی سیرت

ابن جوزی نے اسی غرض کے لئے سلف صالحین اور صلحاء امت میں سے بہت متقدمین اور مشاہیر کی مستقل سیرتیں لکھی ہیں، مثلاً حضرت حسن بصری، سیدنا عمر بن عبدالعزیز، حضرت سفیان ثوری، حضرت ابراہیم بن ادہم، حضرت بشر حافی، امام احمد بن حنبل، حضرت معروف کرخی، ان مستقل تذکروں کے علاوہ ایک جامع تذکرہ "صفۃ الصوفیہ" لکھا، جو چار جلدوں میں ہے، یہ دراصل ابو نعیم اصبہانی کی مشہور کتاب "حلیۃ اولیاء" کی تہذیب و تنقیح ہے، جس کو ابن جوزی نے مناسب حذف و اضافہ اور تلخیص کے ساتھ محدثانہ و مورخانہ طرز پر مرتب کیا ہے، اس کتاب میں جو حالات و واقعات آئے ہیں، وہ موثر و دل گداز ہونے کے ساتھ ساتھ تاریخی حیثیت سے مستند بھی ہیں، اور مبالغہ آمیز روایات اور حشو و زوائد سے پاک ہیں۔

تاریخ کی اہمیت

ابن جوزی علوم دینیہ میں اشتغال اور فقہ و حدیث میں کمال کے ساتھ ساتھ فن تاریخ کی اہمیت و ضرورت

کے بھی بڑے قائل اور اس کی تعلیم کے مبلغ ہیں ان کے نزدیک تاریخ سے ناواقفیت کی بنا پر علماء و فقہاء سے اپنی کتابوں میں بعض بڑی افسوسناک فروگزاشتیں ہوئی ہیں جو ان کے منصب اور علم و فضل کے شایان شان نہیں اس لئے وہ طالب علم کو مشورہ دیتے ہیں کہ ہر فن سے وہ فی الجملہ واقف ہو اور تاریخ سے اتنی واقفیت رکھتا ہو کہ کوئی بڑی تاریخی غلطی نہ کر بیٹھے جو اس کی شخصیت کا باعث ہو "صید الخاطر" میں لکھتے ہیں:-

"فقیر کو چاہئے کہ ہر فن کے ضروری حصہ سے واقف ہو تاریخ ہو یا حدیث لغت ہو یا دوسرا فن اس لئے کہ فقیر تمام علوم کا محتاج ہے اس لئے ہر فن کے ضروری حصہ سے اس کو واقف ہونا چاہئے میں نے بعض فقہاء کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ شیخ شبلی اور قاضی شریک یک مجلس میں جمع ہوئے مجھے سن کر تعجب ہوا کہ اس کو دونوں بزرگوں کے زمانہ کا فاصلہ نہیں معلوم! ایک عالم نے ایک مباحثہ کے دوران میں کہا کہ حضرت علیؑ اور سیدہ فاطمہؑ کے درمیان زوجیت منقطع نہیں ہوئی تھی اس لئے حضرت علیؑ نے سیدہ کو غسل دیا میں نے کہا کہ خدا تمہارا بھلا کرے پھر حضرت علیؑ نے حضرت فاطمہؑ کے بعد ان کی بھانجی امام زینبؑ سے نکاح کیسے کیا اسی طرح میں نے امام غزالیؒ کی کتاب حیا العلوم میں ایسی تاریخی فروگزاشتیں دیکھیں جن سے مجھے سخت حیرت ہوئی کہ انہوں نے کس طرح مختلف واقعات اور تواریخ کو آپس میں ملا دیا میں نے ان تاریخی اغلاط کو ایک مستقل کتاب میں جمع کیا ہے اسی طرح انہوں نے اپنی کتاب "مستظہری" میں لکھا ہے جس کو انہوں نے مستظہر باشر کی خدمت میں پیش کیا تھا کہ سلیمان ابن عبد الملک نے ابو حازم سے کہلایا کہ مجھے اپنے ناشتہ میں سے کچھ تبر کا بھجوا انہوں نے ان کے پاس اُبلایا ہوا پوکو بھجیا، سلیمان نے اس کا ناشتہ کیا پھر اپنی بیوی سے ہم بستر ہوا اور اس سے عبد العزیز پیدا ہوئے عبد العزیز کے عمر بن عبد العزیز پیدا ہوئے یہ سخت مغالطہ ہے اس لئے کہ انہوں نے عمر ابن عبد العزیز کو سلیمان بن عبد الملک کا پوتا قرار دیا حالانکہ وہ اس کے ابن عم تھے شیخ ابو المعالی جوینی نے اپنی کتاب "الشامل" کے آخر میں اصول فقہ

میں ہے لکھا ہے کہ اہل باطن کی ایک جماعت ناقص ہے کہ علاج جنابی قرمطی اور ابن المقفع نے سلطنت کے نظام کے لئے مملکت کی تخریب اور عوام کی استمالت کی سازش کی اور ہر ایک نے ایک ایک ملک کی ذمہ داری لے لی جنابی نے احسا میں سکونت اختیار کی ابن المقفع ترکستان کے حدود میں جا بسا اور علاج نے بغداد کو اپنا مرکز بنایا اس پر اس کے دونوں ساتھیوں نے فیصلہ کر دیا کہ وہ ہلاک ہو جائے گا اور اپنے مقصد میں ناکام رہے گا اس لئے کہ اہل بغداد دھوکہ نہیں کھاتے اور بڑے مردم شناس اور ہمہ جہت اور میں کہتا ہوں کہ اگر ناقص کو یہ معلوم ہوتا کہ علاج نے ابن المقفع کا زمانہ ہی نہیں پایا اس لئے کہ ابن مقفع کے قتل کا منصور نے حکم دیا تھا اور یہ ۱۳۴ھ کا واقعہ ہے دراصل ایک ابو سعید انجلی کا ظہور ۲۸۶ھ میں ہوا ہے اور علاج ۳۰۹ھ میں مقتول ہوا اس بنا پر قرمطی اور علاج کا زمانہ قریب قریب ہے لیکن ابن المقفع بہت متقدم ہے اس کے ان دونوں سے ملنے اور سازش کرنے کا کوئی امکان نہیں اس سے معلوم ہوا کہ ہر صاحب علم کو چاہئے کہ دوسرے علوم سے بھی تعلق رکھے اور اس کا کچھ نہ کچھ مطالعہ ہو اس لئے کہ ہر علم کا دوسرے علم سے تعلق ہے ایک محدث کے لئے یہ بات کتنی میوہ ہے کہ کسی واقعہ کے متعلق اس سے فتویٰ لیا جائے اور وہ جواب نہ دے سکے اس لئے کہ وہ طرق حدیث کے صحیح کرنے میں مشغول ہے اس کو مسائل و جزئیات کے علم کی فرصت ہی نہیں ہوتی اسی طرح ایک فقیہ کے لئے یہ بات کتنی نامناسب ہے کہ اس سے ایک حدیث کا مطلب پوچھا جائے اور وہ حدیث کی صحت اور اس کے مفہوم سے بالکل ناواقف ہو اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ایسی بلند ہمت عطا فرمائے جو پست اف بے ہمتی کی باتوں کو گوارا نہ کرے!

تاریخی تصنیفات

انہوں نے صرف اس تنقید اور مشورہ پر اکتفا نہیں کی بلکہ ایک مبسوط کتاب "مستظہری" میں لکھا ہے کہ

لکھی جو دس جلدوں میں ہے اور جو ابتدائے اسلام سے لے کر ۱۵۷۴ء تک کے حالات پر مشتمل ہے مصنف پہلے سن لکھتے ہیں پھر اس سن کے اہم واقعات و حالات کا تذکرہ کرتے ہیں پھر اس سن میں جن ممتاز اول قابل ذکر اشخاص کا انتقال ہوا ہے ان کے حالات بیان کرتے ہیں اس طرح یہ کتاب حالات و تذکرہ دونوں کی ایک جامع تاریخ ہے۔

اسی طرح ان کی ایک مختصر کتاب "تلقیح فہوم اہل الاثر فی عیون التاریخ والسیر" ہے جو ایک تاریخی بیاض کی حیثیت رکھتی ہے جس میں بہت سے تاریخی معلومات یکجا کر دیئے گئے ہیں۔

ادبیت و خطابت

ابن جوزی کی فصاحت و بلاغت اور حسن خطابت پر مورخین کا اتفاق ہے، ان کی مجالس و عطا کی مقبولیت اور لوگوں کے ازدحام کا یہی ایک بڑا سبب تھا، انھوں نے "صید الخاطر" میں اپنی اس ذہنی کشمکش کا بھی ذکر کیا ہے کہ نفس نے ان کو اس کی ترغیب دی کہ وہ اس کا اہتمام بالکل چھوڑیں اور الفاظ کی طرف بالکل توجہ نہ کریں یہ سب تکلف اور تصنع ہے لیکن انھوں نے اپنے علم اور تفقہ سے اس خیال کو دفع کیا، اور اپنے نفس کو سمجھایا کہ حسن کلام ایک خداداد قابلیت، ایک ہتھیار اور ایک کمال کی بات ہے نہ کہ نقص اور عیب، اس لئے ان کو دعوت و تبلیغ میں اس سے کام لینا چاہئے، اس کی ناقدری نہیں کرنی چاہئے، اسی طرح ان کے دل میں کئی بار شدت اس کا خیال پیدا ہوا کہ وہ اس وعظ گوئی اور دعوت و تبلیغ کو چھوڑ کر زہد و انقطاع کی زندگی اختیار کر لیں اور لوگوں سے بالکل کیسو ہو کر گوشہ نشین ہو جائیں، مگر انھوں نے دلائل و براہین سے اور اپنے نفس سے مفصل مباحثہ و مناظرہ کر کے اس خیال کو لے اس کتاب کے آخری پانچ حصے دائرۃ المعارف حیدرآباد کی طرف سے شائع ہوئے ہیں۔ لے یہ کتاب ہندوستان میں مولوی سید محمد یوسف صاحب ٹونکی مرحوم کے اہتمام سے شائع ہو چکی ہے۔

بتایا، اور اس کو قائل کیا کہ یہ اتفاق شیطانی ہے، شیطان یہ دیکھ نہیں سکتا کہ ہزاروں آدمی اس کے باں سے نکل کر ہدایت کے راستہ پر پڑ جائیں، انبیاء علیہم السلام کا راستہ دعوت و تبلیغ کا تھا اور ان کی زندگی اجتماع و اختلاط کی تھی، اس میں نفس کا چور یہ ہے کہ وہ بیکاری اور تعطیل کو پسند کرتا ہے اور جہد سے بھاگتا ہے، دوسرے اس میں جاہ طلبی بھی ہے، اس لئے کہ عزت و گوشہ نشینی اور زہد و انقطاع کی زندگی عوام کے لئے زیادہ باعث کشش اور جاذب توجہ ہے، غرض یہ کہ شیطان ان کو افادہ عوام اور عمومی دعوت کے ہم سے ہٹا نہیں سکا، انھوں نے اپنی ساری دماغی صلاحیتیں اور خدا کی بخشی ہوئی طاقتیں اصلاح پر لگا دیں، اور نصف صدی سے زیادہ پوسے انہماک قوت کے ساتھ اصلاح و افادہ کے کام میں مشغول رہے۔

وفات

۱۵۹۷ء میں شب جمعہ کو اس داعی انی اللہ نے انتقال کیا، بغداد میں کہرام مچ گیا، بازار بند ہو گئے، جامع منصور میں نماز جنازہ ہوئی، یہ وسیع مسجد کثرت ازدحام سے تنگ اور نا کافی ثابت ہوئی، یہ بغداد کی تاریخ میں ایک یادگار دن تھا، ہر طرف غم کے آثار اور گریہ کی آوازیں بلند تھیں، لوگوں کو ان سے ایسا تعلق تھا کہ رمضان بھر لوگوں نے راتیں ان کی قبر کے پاس گزاریں اور قرآن مجید کے ختم کئے۔

نور الدین زنگی اور صلاح الدین ایوبی

صلیبی حملے اور عالم اسلام کے لئے نیا خطرہ

ایک طرف مرکز اسلام میں پوری قوت سے تصنیفی و تعلیمی کام ہو رہا تھا، اور بعض عظیم شخصیتیں صلاح و تربیت میں مشغول تھیں، دوسری طرف پورے عالم اسلام پر خطرہ کے بادل منڈلا رہے تھے اور مسلمانوں کی ہستی اور نفس اسلام کا وجود زمین تھا، مسیحی یورپ صدیوں سے اسلام سے خار کھا رہے بیٹھا تھا، مسلمان اس کی پوری مشرقی سلطنت پر قابض تھے اور اس کے تمام مقدس مقامات اور خود مولد مسیح ان کے قبضہ اور تولیت میں تھا، یورپ کے اشتعال اور جذبہ انتقام کے لئے یہ صورت حال بالکل کافی تھی، لیکن طاقت و اسلامی سلطنتوں کی موجودگی اور ہمسایہ مسیحی سلطنت پر ان کی مسلسل پیش قدمیوں کے سبب اس کو یہ حوصلہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ شام و فلسطین یا کسی اسلامی ملک کی طرف نظر اٹھائے، بلکہ جو قوتی سلطنت کے زوال اور اسلامی سلطنت کی شمالی سرحدوں کی کمزوری کی وجہ سے یورپ میں قسمت آزمائی کا خیال پیدا ہوا، اسی عرصہ میں اس کو راہب پطرس کی صورت میں ایک ایسا خطیب اور مذہبی واعظ مل گیا، جس نے ساری مسیحی دنیا میں اپنی آتش نوا بیوں سے آگ لگا دی اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک مذہبی جنون کی ایک لہر پیدا کر دی، اس کے علاوہ وسیع وزیر خیز اسلامی مملکت پر حملہ کرنے کے اور بھی متعدد سیاسی و معاشی اسباب محرکات جمع ہو گئے جنہوں نے صلیبی حملوں میں ذہنی و دنیاوی کشش اور ترغیب پیدا کر دی۔

لے انفیل کے لئے ملاحظہ ہو "انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا" ج ۶، مضمون (CRUSADES)

بہر حال ۱۰۹۰ء میں صلیبیوں کے پہلے لشکر نے شام کی طرف کوچ کیا، دو سال کے عرصہ میں صلیبیوں کے لشکر نے الربا (ایڈریا) اور ولایت انطاکیہ کے بڑے شہروں بہت سے قلعوں اور صلب پر قبضہ کر لیا، ۱۰۹۲ء مطابق ۱۰۹۹ء میں صلیبی مبارزوں نے یروشلم (بیت المقدس) کو فتح کر لیا، اور چند سال کے اندر اندر ملک فلسطین کا بڑا حصہ یعنی ساحل شام پر انطرطوس، عکہ طرابلس الشرق اور صیدا صلیبیوں کے تصرف میں آ گیا، مشہور انگریز مورخ سٹینٹن لین پول کے بقول صلیبی سپاہی ملک میں اس طرح گھسے جیسے کوئی پرانی لکڑی میں پچھٹھونکے، تھوڑی دیر کو یہی معلوم ہونے لگا کہ درخت اسلام کے تنے کو چیر کر اس کی چھپٹیاں اڑا دیں گے، صلیبیوں نے داخلہ بیت المقدس کے موقع پر فتح کے نشہ میں سرشار ہو کر مجبور مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا اس کا ذکر ایک ذمہ دار مسیحی مورخ ان الفاظ میں کرتا ہے :-

"بیت المقدس میں فاتحانہ داخلہ پر صلیبی مجاہدین نے ایسا قتل عام مچایا کہ بیان کیا جاتا ہے، کہ ان صلیبیوں کے گھوڑے جو سب عمر سوار ہو کر گئے، گھٹنوں گھٹنوں خون کے چستے میں ڈوبے ہوئے تھے، بچوں کی ٹانگیں پکڑ کر ان کو دیوار سے دے مارا گیا، یا ان کو چکر دے کر فیصل سے پھینک دیا گیا، یہودی کل کے کل اپنے ہیکل (مجد) میں زندہ جلا دیے گئے"

"دوسرے دن اس سے بڑے پیمانہ پر ان لرزہ خیز مظالم کا جان بوجھ کر اعادہ کیا گیا، ٹینکر ڈنہ تین سو قیدیوں کی جان کی حفاظت کی ضمانت کی تھی، وہ چیتا چلاتا رہا، اور ان سب کو باہر لا کر قتل کر دیا گیا، پھر ایک زبردست قتل عام شروع ہوا، مردوں عورتوں اور بچوں کے جسم ٹکڑے ٹکڑے اور ریزہ ریزہ کر دیے گئے، ان کی لاشوں کے ٹکڑوں اور کٹے ہوئے اعضا کے ڈھیر لگے تھے، بالآخر یہ سفاکانہ قتل عام اختتام کو پہنچا شہر کی خون آلودہ سڑکوں کو عرب قیدیوں سے دھلوا یا گیا، بیت المقدس کی فتح اسلامی سلطنت کے ضعف اور زوال اور مسیحی دنیا کی بیداری اور

لے انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ج ۶ ص ۶۲۷ مضمون "CRUSADES"

اس کی نوخیز طاقت کی خبر دیتی تھی، اور عالم اسلام میں خطرہ کی گھنٹی تھی، شام و فلسطین میں مستقل چار عیسائی ریاستیں (قدس، انطاکیہ، طرابلس، اور یافا کی) قائم ہو چکی تھیں، جو مرکز اسلام (حجاز) کی آزادی اور حرمت کے لئے مستقل خطرہ تھیں اور مسیحیوں کے جوصلے اتنے بلند ہو چکے تھے کہ رنجی نالدوالی کرک نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر چڑھائی کا ارادہ کیا، اور روضہ اطہر سے متعلق گستاخانہ اور ہانت آمیز کلمات اور ارادوں کا اظہار کیا، حقیقت یہ ہے کہ واقعہ ارتداد کے بعد اسلام کی تاریخ میں اس سے زیادہ نازک وقت اور خطرہ کی گھنٹی نہیں آئی یہ دوسرا موقع تھا کہ اسلام کا وجود خطرہ میں تھا، اور عالم اسلام کو ایک فیصلہ کن جنگ کرنی ضروری تھی۔

چھٹی صدی ہجری کا ابتدائی زمانہ عالم اسلام میں بڑے انتشار و بد نظمی کا تھا، ملک شاہ سلجوقی کے جانشین باہم دست و گریباں تھے، خلفاء بنی عباس مدتوں پہلے ترکوں کو اپنی طاقت منتقل کر چکے تھے، عالم اسلام میں کوئی طاقتور سلطان اور کوئی ایسا قائد نہ تھا، جو تنظیمی صلاحیتیں رکھتا ہو، اور جو عالم اسلام کی کچی کھچی طاقت کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کر کے شمال و مغرب سے بڑھتے ہوئے خطرہ کا مقابلہ کر سکے، سٹینلین پول نے صحیح لکھا ہے کہ "یہ زمانہ التباس و تذبذب کا تھا کہ اتنی وسیع اور عظیم الشوکت (سلجوقی) سلطنت کو موت کے کرب میں ہاتھ پاؤں ماتے دیکھ کر ہر شخص پر تخیر کا عالم طاری تھا، یہ بیچ کا زمانہ اس وقت تک بد نظمی کا تھا جب تک کہ نئی طاقتیں پورے طور پر کچھت ہو کر ایک ہی سمت میں رجوع نہ ہو جائیں، مختصر یہ کہ یہی وہ ٹھیک وقت تھا، جب کہ یورپ والے فوج کشی کر کے اپنی کامیابی کو ممکن کر لیں۔"

اتابک عماد الدین زنگی

لیکن عین اس کشمکش اور بڑھتی ہوئی مایوسی کے عالم میں عالم اسلام کے افق پر ایک نیا ستارہ طلوع

ہوا، عالم اسلام کو حسب معمول عین ضرورت کے موقع پر ایک نیا قائد اور ایک تازہ دم مجاہد مل گیا، اور جس گوشہ سے امید نہ تھی، وہاں سے ایک نئی طاقت ابھری، جس کا کسی کو خیال بھی نہ تھا۔
لین پول لکھتا ہے:-

"مسلمانوں کے لئے ضروری ہوا کہ وہ جہاد کا اعلان کریں اور ایک ایسا سردار پیدا کریں جس کی دیر اور بہت اور جنگی قابلیت کا سکہ سب ماننے لگیں، ترکمانی سردار اور ان کے ماتحت دایان ملک ایک ایسی جو امرداد اور جو دینداروں کی جماعت پیدا کریں جن کے سامنے صلیبیوں کو اپنے مظالم اور زیادتیوں کا جواب دینا پڑے اور اب یہ سردار عماد الدین زنگی کی ذات میں نمودار ہوا۔"

عماد الدین سلجوقیوں کا پروردہ نعمت تھا، وہ سلطان محمود سلجوقی کے شہزادوں کا اتالیق (اتابک) اور سلطان کی طرف سے موصل کا حاکم تھا، زنگی نے عراق و شام میں اپنی طاقت مستحکم و منظم کر کے الرہا (ایڈریس) پر حملہ کیا جو عیسائیوں کی ریاست میں سب سے زیادہ مضبوط و مستحکم مقام تھا، اور اس کو بڑی فوجی اہمیت حاصل تھی، ۶ جمادی الاخری ۵۳۹ھ مطابق ۲۳ دسمبر ۱۱۴۳ء کو اس نے الرہا پر قبضہ کر لیا، عرب مورخین کے الفاظ میں یہ فتح الفتوح تھی، یہ شہر لاطینی سلطنت کا بڑا سہارا تھا، اس طرح فرات کی وادی صلیبیوں کے خطرہ سے محفوظ ہو گئی، اس فتح کے کچھ عرصہ بعد ۵۴۱ھ مطابق ۱۱۴۶ء میں وہ ایک غلام کے ہاتھ سے شہید ہو گیا، شہادت سے پہلے اس نے صلیبیوں کے خلاف جہاد کی شاندار ابتدا کر دی تھی، جس کو اس کے نامور فرزند الملک العادل نور الدین زنگی نے بہت آگے تک پہنچا دیا۔

الملک العادل نور الدین زنگی

نور الدین محمود اب سلطان شام تھا، اور تمام مسلمانوں کی طرف سے صلیبیوں کے اخراج اور بیت المقدس

کے بازیافت کے لئے اپنے کو مامور من اللہ سمجھتا تھا، اور اس خدمت عظیم کو اپنی سب سے بڑی عبادت اور

تقرب الی اللہ کا ذریعہ جانتا تھا، اس نے اپنے حلوں سے تمام سچی ریاستوں پر دھاک بٹھادی تھی، ۵۵۹ھ میں وہ قلعہ حارم پر قابض ہوا، جو ایک مضبوط شمالی سرحدی قلعہ تھا، بادشاہ انطاکیہ نواب طرابلس مع دیگر مشہور و معروف نائٹوں کے گرفتار ہو گئے، اس معرکہ میں دس ہزار عیسائی قتل ہوئے اور بے شمار قیدی اس قبضہ کے بعد ہی قلعہ بانیاں فتح کیا، ادھر اس نے مصر فتح کر کے عیسائیوں کو دو طرف سے محصور کر لیا، لہذا پول لکھتا ہے :-

نور الدین سلطان شام کے سپہ سالار (صلاح الدین) کا روڈ نیل پر قابض ہو جانا یہی رکھتا تھا کہ یروشلم کی مسیحی سلطنت ایک چری ہوئی لکڑی کے بیچ میں آگئی تھی، دونوں طرف سے وہ دب رہی تھی اور دونوں طرف جو چیز اسے بھینچ رہی تھی، وہ ایک ہی طاقت کے دو لشکر تھے، دمیاط اور اسکندریہ کی بندرگاہوں پر قابض ہو جانے سے مسلمانوں کا قبضہ ایک جہازی بیڑے پر بھی ہو گیا، اور انھوں نے مصر کے صلیبیوں کا تعلق یورپ سے منقطع کر دیا۔

نور الدین نے تقریباً فلسطین کے پورے علاقہ کو صلیبیوں سے صاف کر دیا، لیکن اس کی سب سے بڑی آرزو اور سب سے مقدس خدمت بیت المقدس کی بازیابی تھی، لیکن یہ سعادت اس کے سپہ سالار سلطان صلاح الدین ایوبی کی قسمت میں تھی، جو خود نور الدین کے حسات میں شمار کئے جانے کے قابل ہے، ۵۶۹ھ مطابق ۱۱۷۳ء کو چھپن برس کی عمر میں بعارضہ خناق اس کا انتقال ہوا، بقول انگریز مورخ سلطان نور الدین بادشاہ شام کے مرنے کی خبر مسلمانوں میں اس طرح پہنچی جیسے آسمان سے بجلی گرے،

نور الدین کے محامد و اوصاف

مسلمان مورخ سلطان نور الدین کے عدل، دیانت و تقویٰ حسن انتظام، شرافت نفس، محامد اخلاق

لہذا الکامل (ابن اثیر) جلد ۱۱ ص ۱۲۱ ۱۲۲ سلطان صلاح الدین ص ۸۹ ۹۰ ایضاً ص ۱۱۵

اور جذبہ جہاد کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، اور وہ اپنے نام کی طرح ان سب کا "ممدوح" و "محمود" ہے۔

ابن جوزی جو سلطان کے معاصر ہیں اپنی مشہور تاریخ المنتظم میں لکھتے ہیں :-

جاهد الثغور وانتزع من ایدی الکفار نیفاً وخصسین مدینة، وکانت سیرتہ اصلاح من کثیر من الولاة والظرق فی ایامہ امنة والمحامد لہ کثیرة وکان یتدین بطاعة الخلافة وترك الملکون قبل موته وکان یمیل الی التواضع ومحبة العلماء واهل الدین۔

نور الدین نے سرحدوں پر جہاد کیا اور کفار کے قبضہ سے کچھ اور پرچاس شہر آزاد کئے، ان کی زندگی اکثر سلاطین و حکام سے بہتر تھی، رستے محفوظ تھے، ان کی تعریف کی باتیں بہت ہیں، وہ خلافت بغداد کی ماتحتی و اطاعت کا اپنے کو پابند سمجھتے تھے، انتقال سے پہلے ناجائز محاصل اور ٹیکس معاف کر دیئے، طبیعت میں سادگی اور تواضع تھی، اور علماء و اہل دین سے محبت کرتے تھے۔

ابن خلکان جو اپنی مورخانہ احتیاط، صحیح تہ الفاظ اور پستی تعریف میں مشہور ہیں، لکھتے ہیں :-

وکان ملکاً عادلاً لا یناہداً اعداء اورعاً متمسکاً بالشریعة مائلاً الی الخیر مجاہداً فی سبیل اللہ تعالیٰ کثیر الصدقات بنی المدارس بمجمیع بلاد الشام الکبار وله من المناقب والمناثر والمفاخر ما یتغرق الوصف۔

یادگاروں اور کارناموں کا احاطہ مشکل ہے۔ تاریخ الکامل کے نامور مصنف ابن الاثیر جزری نے ان کے متعلق یہاں تک لکھا ہے کہ :-

لہذا المنتظم ج ۱۰ ص ۲۳۸-۲۳۹ ۲۴۰ ابن خلکان محمود نور الدین زنگی ج ۲ ص ۲۷۲

وقد طالعت سير الملوک المتقدّمين
 فلم ارفها بعد الخلفاء الراشدين وعمر
 بن عبد العزيز احسن من سيرة ولا اكثر
 تحرياً منه للعدل له
 میں نے گذشتہ سلاطین کی زندگی اور حالات کا
 مطالعہ کیا ہے، خلفاء راشدین اور عمر بن عبد العزیز
 کے بعد نور الدین سے بہتر سیرت اور ان سے زیادہ
 عادل سلطان میری نظر سے نہیں گذرا۔

سلطان نور الدین کی وفات کے وقت ابن الاثیر کی عمر ۱۴ سال کی تھی، اس لئے ان کی روایت اور شہادت خاص وقعت رکھتی ہے، وہ سلطان مرحوم کی سیرت و اخلاق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”وہ صرف اپنی اس جائداد کی آمدنی سے کھاتے پینتے تھے، جو انھوں نے مال غنیمت میں اپنے حصہ کو فروخت کر کے خریدی تھی، ان کی اہلیہ نے ایک مرتبہ تنگی کی شکایت کی تو انھوں نے اپنی تین دوکانیں خرچ کے لئے دے دیں، جو محض میں ان کی ملکیت تھیں، اور جن کی سالانہ آمدنی بیس دینار کے قریب تھی، جب بیوی نے اس کو کم سمجھا تو انھوں نے کہا کہ اس کے علاوہ میرے پاس کچھ نہیں ہے، اور جو کچھ تم میرے پاس دیکھتی ہو وہ سب مسلمانوں کا ہے، میں محض خزانچی ہوں، میں... اس امانت میں خیانت کر کے تمہاری خاطر جہنم میں جانا گوارا نہیں کر سکتا۔“

وہ رات کو بڑی عبادت کرتے، ان کے اوراد و اذکار مقرر تھے، حنفی فقہ کے عالم تھے، لیکن تعصب سے بری تھے، حدیث کا درس لیا، اور ثواب کی نیت سے اس کی روایت کی، اور اجازت دی۔

عدل و انصاف کا یہ حال تھا کہ اپنی وسیع سلطنت میں انھوں نے کوئی محصول اور چنگی باقی نہیں رکھی، مصر و شام، جزیرہ موصل سب جگہ اس کو موقوف کر دیا، شریعت کا بڑا ادب کرتے تھے، اور اس کے احکام کی تعمیل کرتے، ایک شخص نے ان کو عدالت میں طلب کیا، وہ حاضر ہو گئے، اور قاضی صاحب کو کہلا بھیجا کہ میں عدالت میں حاضر ہو رہا ہوں، میرے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہ کیا جائے، مقدمہ میں ان کو کامیابی

ہوئی تو انھوں نے اپنا حق معاف کر دیا، اور کہا کہ میرا پہلے سے یہی ارادہ تھا، لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ شاید عدالت میں حاضر نہ ہونے کا سبب میرا تکبر ہو، اس لئے میں حاضر ہو گیا، اور میں اپنا حق معاف کرتا ہوں، انھوں نے دارالعدل کی تعمیر کی تھی، جہاں وہ قاضی کے ساتھ بیٹھ کر مظلوم کا انصاف کرتے، خواہ وہ یہودی ہوتا، اور ظالم کو سزا دیتے، خواہ وہ ان کا فرزند ہوتا یا بڑے سے بڑا افسر اور حاکم۔

شجاعت ان پر ختم تھی، وہ جنگ میں دو کمائیں اور دو ترکش ساتھ رکھتے تھے، ایک صاحب نے ان سے کہا کہ آپ کو اللہ کا واسطہ آپ اپنی زندگی کو خطرہ میں ڈال کر اسلام کو مصیبت میں مبتلا نہ کریں، انھوں نے جواب دیا کہ محمود کیا چیز ہے کہ اس کے متعلق یہ بات کہی جائے مجھ سے پہلے ملک اور اسلام کی کس نے حفاظت کی؟ وہ محمود برحق ہے، لا الہ الا هو۔

علماء و اہل دین کی تعظیم کرتے تھے، ان کے لئے کھڑے ہو جاتے، اپنے پاس بٹھاتے، بے تکلفی سے باتیں کرتے، کسی بات سے انکار نہ کرتے، اپنے قلم سے ان کو خط لکھتے، لیکن اس تو واضح و خاکساری کے باوجود بڑے رعب و داب کے آدمی تھے، لوگوں پر اس کا اثر پڑتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ ان کے مناقب و محامد کی یہ کتاب متحمل نہیں، اس کے لئے دفتر درکار ہے۔

شوق جہاد اور ایمان و یقین

نور الدین کی تمام تر توجہ اور دلچسپی جہاد اور عیسائیوں کے مقابلہ سے تھی، اس بارہ میں اس کا عزم اعتماد و توکل اور ایمان و یقین بہت بڑھا ہوا تھا۔

۵۵۵ھ میں نور الدین کو حصن الاکرا کے معرکہ میں (جو بقیعہ کے معرکہ کے نام سے مشہور ہے) عیسائیوں کے اچانک حملہ کر دینے کی وجہ سے شکست ہوئی، نور الدین حصص کے قریب دشمن سے چند میل کے فاصلہ پر مقیم تھے،

بعض خیر خواہوں نے کہا کہ بادشاہ کا فتحیاب دشمن کے اتنے قریب قیام کرنا، مناسب نہیں نورالدین نے ان کو خاموش کیا اور کہا کہ اگر ہزار سوار بھی میرے پاس ہوں تو مجھے دشمن کی پروا نہیں خدا کی قسم میں جب تک اپنا اور اسلام کا انتقام نہ لے لوں گا کسی چھت کے نیچے نہ آؤں گا، نورالدین نے بڑی دریا دلی سے اہل لشکر کو عطایا اور رقوم کی تقسیم کی بعض لوگوں نے ان سے کہا بھی کہ فقہار، فقراء اور صوفیہ و قراء کے لئے جو وظائف اور رقوم خزانہ شاہی سے مقرر ہیں، ان سے اس موقع پر کام لیا جائے، نورالدین نے غضبناک ہو کر جواب دیا کہ مجھے تو نصرت الہی کی امید نہیں فقراء و ضعفا کی دعا اور رضا سے ہے، حدیث میں آتا ہے کہ "اللہ کی طرف سے رزق اور مدد کمزور بندوں کی بدولت ہوتی ہے" میں کس طرح ایسے لوگوں کی مدد بند کر دوں جو ایسے وقت میں میری طرف سے جنگ کرتے ہیں، جب میں اپنے بستر پر سوتا ہوتا ہوں، اور ان کے تیر خطا نہیں جاتے، درانحالیکہ جن کا تم تذکرہ کرتے ہو، وہ صرف اس وقت جنگ کرتے ہیں، جب مجھے دیکھتے ہیں، اور ان کے تیر کبھی خطا کرتے ہیں، کبھی نشانہ پر لگتے ہیں، ان غریبوں کا تو بیت المال میں حق بھی ہے، میں ان کا حق لے کر دوسروں کو کیوں کر دے دوں؟

نورالدین نے عیسائیوں سے اپنی شکست کا بدلہ لینے کی پوری تیاری کی، لشکر کو انعامات و تقسیمات سے نہال کر دیا، سرحدی مقامات اور اسلامی ریاستوں کے امراء و حکام کو پراثر خطوط لکھے، اور ان کو جہاد فی سبیل اللہ اور شرکت و رفاقت کی ترغیب دی، ان مقامات کے زہاد و عباد اور صلحاء و فقراء کو بھی خطوط لکھے، جن میں فرنگیوں کی زیادتیوں اور مظالم کا تذکرہ کیا، اور ان سے دعا کی درخواست کی، اور اس کی خواہش کی کہ وہ مسلمانوں کو جہاد پر آمادہ کریں، چنانچہ ان حضرات نے رور و کرلوگوں کو خطوط پڑھ کر سناے، اور سلطان کے لئے دعا کی، لوگوں میں جوش جہاد کی ایک لہر پیدا ہو گئی، وایمان ملک اپنے اپنے لشکر لے کر آئے، ادھر عیسائیوں نے بھی اپنی پوری طاقت اور ہر طرف کی افواج مقابلہ کے لئے جمع کر دیں، لیکن

سلطان نے اپنی نذر پوری کی، اور عیسائیوں کی متحدہ طاقت پر فتح حاصل کر کے حارم پر قبضہ کر لیا۔ نورالدین کے ایمان و یقین کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قلعہ بانیاں کے محاصرہ میں اس کے بھائی نصرۃ الدین امیر امیران کی ایک آنکھ جاتی رہی، نورالدین نے دیکھا تو بھائی سے کہا کہ اگر تم کو وہ اجر و ثواب نظر آجائے جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے رکھا ہے، تو تم کو تمنا ہو کہ دوسری آنکھ بھی راہ خدا میں کام آجائے۔

۳۳ سلطان صلاح الدین ایوبی

صلاح الدین ایوبی کی ذات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مستقل معجزہ اور اسلام کی صداقت و ابدیت کی روشن دلیل ہے۔

ایک متوسط درجہ کے کرد شریف زادہ اور خاندانی سپاہی کی حیثیت سے ان کا نشوونما ہوا، مصر کی فتح اور صلیبیوں کے مقابلہ میں میدان میں آنے سے پہلے کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ کرد و نوجوان

لے الکال ج ۱۱ ص ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴ ایضاً ص ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵ سلطان صلاح الدین ایوبی اس لئے کہلاتے ہیں کہ ان کے والد کا نام ایوب تھا، اسی نسبت سے سارا خاندان ایوبی کہلاتا ہے، یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ان کا کوئی تعلق ابو ایوب نصاریٰ سے ہے، سلطان اور ان کا پورا خاندان نسلًا کر دہے، یہ قوم اب بھی عراق، شام، ترکی اور ایران میں پائی جاتی ہے۔

۳۴ ان کے والدین اور اہل خاندان مشرقی آذربائیجان کے گاؤں "دوین" کے رہنے والے تھے، ان کا تعلق قبیلہ ہذانیہ کی ایک شاخ "روادیہ" سے تھا جو کردوں کا ایک بہت بڑا قبیلہ ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دادا شاوی اپنے دونوں لڑکوں ایوب نجم الدین اور شیر کوہ اسد الدین کو لے کر بغداد منتقل ہو گئے، اس کے بعد کربلا میں سکونت پذیر ہوئے اور وہیں شاوی کا انتقال ہوا، کچھ دن کے بعد یہ دونوں لڑکے مجاہد الدین بہروز کو تو ال شہر کے عمل میں داخل ہو گئے، جو سلطان مسعود بن غیاث الدین محمد بن ملک شاہ سلجوقی کی طرف سے مامور کیا گیا تھا، نجم الدین ایوب اس کے بعد عماد الدین زنگی

سے متعلق ہو گئے، اور قلعہ "بعلبک" وغیرہ کے محافظ بنا دیے گئے، (صلاح الدین ایوبی از محمد فرید البوجدید ص ۶۲، ۶۱)

بیت المقدس کا فاتح اور عالم اسلام کا محافظ ثابت ہوگا، اس کی قسمت میں وہ سعادت لکھی ہے جو بڑے بڑے عالی نسب شرفاء اور صلحاء کے لئے قابل رشک ہے اور تاریخ میں وہ اتنا بڑا کارنامہ انجام دے گا، جس سے روح مبارک تک کو شادمانی حاصل ہوگی۔

لین پول لکھتا ہے کہ "بجائے اس کے کہ صلاح الدین سے کوئی علامت ایسی ظاہر ہوتی جس سے معلوم ہوتا کہ وہ آئندہ کوئی بڑا آدمی ہونے والا ہے، وہ ایک روشن مثال اس خاموش اور پرامن نیکی کی بنا رہا، جو شریعت طبیعتوں کو تمام اخلاقی کمزوریوں سے دور رکھتی ہے۔"

لیکن جب اللہ تعالیٰ کو ان سے کام لینا منظور ہوا تو اس کا غیبی سامان کیا گیا، ان کو ان کے دلی نعمت نور الدین نے سخت اصرار و حکم سے مصر بھیجا، قاضی بہاء الدین ابن شداد سلطان محمد خواجہ لکھتے ہیں کہ "سلطان نے مجھ سے خود بیان کیا کہ میں بڑی ناگواری اور مجبوری سے مصر آیا، میرا مصر آنا بالکل میری مرضی سے نہیں ہوا، میرا معاملہ بالکل وہی ہے جس کو قرآن مجید میں بیان کیا گیا ہے "وَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا وَنَنبِتُنَا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ"

زندگی میں تبدیلی

مصر پہنچ کر جب صلاح الدین کے لئے میدان بالکل صاف ہو گیا، اور مصر کی زمام مملکت ان کے ہاتھ میں آگئی تو ان کی زندگی یکسر بدل گئی، یہ خیال دل میں جم گیا کہ اللہ تعالیٰ کو ان سے کوئی بڑا کام لینا ہے اور اس کام کے ساتھ عیش و راحت کا کوئی جوڑ نہیں۔

قاضی بہاء الدین ابن شداد لکھتے ہیں کہ "حکومت (مصر) کی باگ ڈور ہاتھ میں آجانے کے بعد دنیا ان کی نظر میں ہیچ ہو گئی، شکر گزاری کا جذبہ ان کے دل میں موجزن ہوا، شراب سے توبہ کی عیش و تفریح سے منہ موڑ لیا، اور ایک سنجیدہ اور جفاکش زندگی اختیار کی، اور اس میں دن بدن ترقی ہی ہوتی گئی۔"

لین پول بھی یہی لکھتا ہے:-

"اب جہاں تک صلاح الدین کا اپنی ذات سے تعلق تھا، اس نے اپنی زندگی کے قواعد سخت کر دیئے، منقہ اور پرہیزگار تو وہ ہمیشہ کا تھا، مگر اب ان میں اور سختی اختیار کی، دنیا کے عیش و آرام اور لذتوں کا خیال بالکل ترک کر دیا، اور اپنے اعمال پر بھی سخت پابندیاں عائد کیں، اور اپنے ساتھیوں کے حق میں خود ایک مثال بنا، اس نے اپنی تمام بلیغ کوششیں اس بات میں صرف کیں کہ ایک ایسی اسلامی سلطنت قائم کرے جس میں کفار کو ملک سے خارج کرنے کی پوری طاقت ہو، چنانچہ ایک موقع پر اس نے کہا "جب خدا نے مجھے مصر دیا تو میں سمجھا کہ فلسطین بھی مجھے اللہ کو دنیا منظور ہے۔"

اس وقت سے صلاح الدین کی زندگی کا مقصد آخر تک سلام کی نصرت اور حمایت رہا، اور اس نے عہد کر لیا کہ کفار پر جہاد کرے گا۔"

جہاد کا عشق

سلطان کو جہاد سے عشق تھا، جہاد اس کی سب سے بڑی عبادت، سب سے بڑی لذت عیش اور اس کی روح

کی غذا تھی۔

قاضی ابن شداد کہتے ہیں کہ:-

"جہاد کی محبت اور جہاد کا عشق ان کے رگ و ریشہ میں سما گیا تھا، اور ان کے قلب و دماغ پر چھا گیا تھا، یہی ان کا موضوع گفتگو تھا، اسی کا ساز و سامان تیار کرتے رہتے تھے، اور اس کے اباب و مسائل پر غور کرتے، اسی مطلب کے آدمیوں کی ان کی تلاش رہتی، اسی کا ذکر کرنے والے اور اسی کی ترغیب دینے والے کی طرف وہ توجہ کرتے، اسی جہاد فی سبیل اللہ کی خاطر انھوں نے اپنی اولاد اور اہل خاندان اور وطن

کٹورادیا، گائی نے پانی پیا، اور پانی کا کٹورا والی کرک ریجی نالڈ کو دیا، سلطان یہ دیکھ کر ناخوش ہوا اور ترحمان سے کہا کہ بادشاہ سے کہو کہ میں نے اس شخص کو پانی نہیں دیا ہے، بادشاہ گائی نے دیا ہے، روٹی اور نمک جسے دیتے ہیں، وہ محفوظ سمجھا جاتا ہے، مگر یہ آدمی اس قسم کی حفاظت میں بھی میرے انتقام سے نہیں بچ سکتا، صلاح الدین اتا کہہ کر کھڑا ہوا اور ریجی نالڈ کے سامنے آیا، ریجی نالڈ جسے نیم میں داخل ہوا تھا، برابر کھڑا رہا تھا، سلطان نے اس سے کہا سن! میں نے تجھے قتل کرنے کی قسم دو مرتبہ کھائی تھی، ایک مرتبہ تو اس وقت جب کہ تو نے مکہ اور مدینہ کے مقدس شہروں پر حملہ کرنا چاہا تھا، دوسری مرتبہ اس وقت جب کہ تو نے دھوکے اور دغا بازی سے حاجیوں کے قافلہ پر حملہ کیا تھا، دیکھ میں اب تیری بے ادبی اور توہین کا انتقام لیتا ہوں، اتنا کہہ کر صلاح الدین نے تلوار نکالی اور جیسا کہ عہد کیا تھا، ریجی نالڈ کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا، جو کچھ رقم باقی تھی اسے پہرے والوں نے آکر ختم کیا۔

بادشاہ گائی اس قتل کو دیکھ کر لرز گیا، اور سمجھا کہ اب اس کی باری آئے گی، صلاح الدین نے اس کا اطمینان کیا، اور کہا کہ بادشاہوں کا دستور نہیں کہ وہ بادشاہ کو قتل کریں، اس شخص نے بار بار عہد شکنیاں کی تھیں، اب جو کچھ گذر گیا گذر گیا۔

ابن شداد نے لکھا ہے کہ سلطان نے ریجی نالڈ کو طلب کیا، اور کہا کہ ہا نا انتصرو لمحہ علیہ الصلوٰۃ والسلام، (لو میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقام لیتا ہوں) ابن شداد نے یہ بھی لکھا ہے کہ سلطان نے اس کو اسلام کی دعوت دی، مگر اس نے قبول نہیں کی۔

لے قاضی ابن شداد کی روایت میں اتنا اضافہ ہے کہ جہاں بکس حجاج نے اسے انسانیت و شرافت کی درخواست کی تو اس نے گستاخانہ کہا کہ اپنے محمد سے کہو کہ تمہیں رہائی دیں، فقرہ صلاح الدین کو پہنچا، اور اس نے منت مانی کہ اگر یہ بے ادب اس کے ہاتھ آئے گا تو اپنے ہاتھ سے اس کو قتل کروں گا ۱۲۷۰ھ سلطان صلاح الدین ۱۸۵۱ھ التوادر السلطانیہ ص ۶۲

فتح بیت المقدس

حطین کی فتح کے بعد وہ مبارک موقع جلد آ گیا، جس کی سلطان کو بے حد آرزو تھی، یعنی بیت المقدس کی فتح، قاضی ابن شداد نے لکھا ہے کہ۔

”سلطان کو بیت المقدس کی ایسی فکر تھی، اور اس کے دل پر ایسا بار تھا کہ پہاڑ اس کے منتقل نہیں تھے۔“

اسی سال ۵۸۳ھ ۱۱۸۷ء رجب کو سلطان بیت المقدس میں داخل ہوئے اور پورے ۹ برس کے بعد یہ پہلا قبلہ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی شب میں انبیاء علیہم السلام کی امامت کی تھی، اسلام کی تولیت میں آیا، یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ سلطان کے داخلہ کی تاریخ بھی وہی تھی جس تاریخ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج ہوئی تھی، قاضی ابن شداد لکھتے ہیں:-

”یہ عظیم الشان فتح تھی، اس مبارک موقع پر اہل علم کی بہت بڑی جماعت اور اہل حرفہ اور اہل طرق

کی کثیر تعداد جمع تھی، اس لئے کہ لوگوں کو جب ساحلی مقامات کی فتح اور سلطان کے ارادہ کی اطلاع ملی تو مصر و شام سے علماء نے بیت المقدس کا رخ کیا، اور کوئی روشناس اور معروف آدمی سمجھے نہیں ہا بہر طرف دعا، تہلیل و تکبیر کا شور بلند تھا، بیت المقدس میں (۹ برس کے بعد) جمعہ کی نماز ہوئی، قبة الصخرہ پر جو صلیب نصب تھی، وہ اتار دی گئی، ایک عجیب منظر تھا، اور اسلام کی فتح مندی اور اثر تعلق کی مدد کھلی آنکھوں نظر آ رہی تھی۔“

نور الدین زنگی مرحوم نے بیت المقدس کے لئے بڑے اہتمام اور بڑے صرف سے منبر بنوایا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ بیت المقدس واپس دلائے گا، تو یہ منبر نصب کیا جائے گا، صلاح الدین نے حلب سے وہ منبر طلب کیا اور اس کو مسجد اقصیٰ میں نصب کیا۔

اسلامی اخلاق کا مظاہرہ

صلاح الدین نے اس موقع پر جس عالی ظرفی، دریا دلی اور اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کیا، وہ عیسائی مورخ کی زبان سے سننے کے قابل ہے۔

”صلاح الدین نے کبھی پہلے اپنے تئیں ایسا عالی ظرف اور باہمت نائٹ ثابت نہیں کیا تھا، جیسا کہ اس موقع پر کیا، جب یروشلم مسلمانوں کے حوالہ کیا جا رہا تھا، اس کی سپاہ اور عزت افسران ذمہ دار نے جو اس کے تحت تھے، شہر کے گلی کوچوں میں انتظام قائم رکھا، یہ سپاہی اور افسر ہر قسم کی ظلم و زیادتی کو روکتے تھے، اور اس کا نتیجہ تھا کہ اگر کوئی وقوعہ جس میں کسی عیسائی کو گزند پہنچا ہو، پیش نہ آیا، شہر کے باہر جانے کے کل راستوں پر سلطان کا پہرہ تھا، اور ایک نہایت محترم میرباب داؤد پر تعین تھا“ کہ ہر شہر والے کو جو زبردیہ ادا کر چکا ہے، باہر جانے دے“

پھر سلطان کے بھائی العادل اور بطریق اور بالیان کے ہزار ہزار غلام آزاد کرنے کے تذکرہ کرنے کے بعد لکھنا ہے

”اب صلاح الدین نے اپنے امیروں کو کہا کہ میرے بھائی اپنی طرف سے اور بالیان اور بطریق نے اپنی طرف سے خیرات کی، اب میں اپنی طرف سے بھی خیرات کرتا ہوں اور یہ کہہ کر اس نے اپنی سپاہ کو حکم دیا کہ شہر کے تمام گلی کوچوں میں منادی کر دیں کہ تمام بوڑھے آدمی جن کے پاس زبردیہ ادا کرنے کو نہیں ہے، آزاد کئے جاتے ہیں کہ جہاں چاہیں وہ جائیں، او یہ سب باب البحر سے نکلنے شروع ہوئے اور سورج نکلنے سے سورج ڈوبنے تک ان کی صفیں شہر سے نکلتی رہیں، یہ خیر و خیرات تھی، جو صلاح الدین نے بیشمار غلاموں اور غریبوں کے ساتھ کی۔“

غرض اس طرح سلطان صلاح الدین نے اس مخلوق مفتوح شہر پر اپنا احسان و کرم کیا، جب سلطان کے ان احسانات پر غور کرتے ہیں تو وہ وحیاً حرکتیں یاد آتی ہیں جو شروع کے صلیبیوں نے ۱۰۹۹ء میں یروشلم کی فتح پر کی تھیں جب گوڈجے اور نکیر ڈیروم کے کوچہ و بازار میں گڈے تھے، تو وہاں مڑے پڑے اور جان بلب زخمی لوٹتے تھے، جب کہ

بے گناہ اور لاپچار مسلمانوں کو ان صلیبیوں نے سخت اذیتیں دے کر مارا تھا، اور زندہ آدمیوں کو جلایا تھا، جہاں قدس کی چھتوں اور بڑوں پر جو مسلمان پناہ لینے چڑھے تھے، وہیں ان صلیبیوں نے انہیں اپنے تیروں سے چھید کر گرایا تھا، اور جہاں ان کے اس قتل عام نے مسیحی دنیا کی عزت کو بڑھ لگایا تھا، جبکہ اس مقدس شہر کو ظلم و بدنامی کے رنگ میں انہوں نے رنگایا تھا، جہاں رحم و محبت کا وعظ جناب یسح نے سنایا تھا، اور فرمایا تھا کہ خیر و برکت والے ہیں، وہ لوگ جو رحم کرتے ہیں، ان پر خدا کی برکتیں نازل رہتی ہیں۔

جس وقت یہ عیسائی اس پاک و مقدس شہر کو مسلمانوں کا خون کر کے اس کو مذبح بنا رہے تھے، اس وقت وہ ان کلام کو بھول گئے تھے، اور ان بے رحم عیسائیوں کی خوش قسمتی تھی کہ سلطان صلاح الدین کے ہاتھوں ان پر رحم و کرم ہو رہا تھا۔

صفات خداوندی میں سب سے بڑھ کر صفت رحم ہے، رحم عدل کا تاج اور اس کا جلال ہے، جہاں عدل اپنے اختیار اور استحقاق سے کسی کو جان سے مار سکتا ہے، رحم جان بچا سکتا ہے۔

اگر سلطان صلاح الدین کے کاموں میں صرف یہی کام دنیا کو معلوم ہوتا کہ اس نے کس طرح یروشلم کو باریاب کیا، تو صرف یہی کارنامہ اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کافی تھا کہ وہ نہ صرف اپنے زمانہ کا بلکہ تمام زمانوں کا سب سے بڑا عالی حوصلہ انسان اور جلالت اور شہامت میں مکیا، اور بے مثل شخص تھا۔

صلیبی سیلاب

بیت المقدس کی فتح اور حطین کی ذلت آمیز شکست سے یورپ میں غیظ و غضب کی آگ پھر بھڑک اٹھی، اور سارا یورپ شام کے چھوٹے سے ملک پر اہل پڑا، جس میں یورپ کے تقریباً تمام مشہور جنگ آزما، او مشہور بادشاہ اور سپہ سالار تھے، قیصر، فریڈرک، رچرڈ شیردل، شاہان انگلستان، فرانس، صقلیہ، آسٹریا

برگنڈی، فلانڈرز کے ڈیوک اور نارٹ اپنی آہن پوش فوجوں کے ساتھ امنڈ آئے، ان سب کے مقابلہ میں تنہا سلطان صلاح الدین تھا، اور اس کے اعتراف اور چند حلیف جو پورے عالم اسلام کی طرف سے مدافعت کو ہم تھے

صلح اور سلطان کے کام کی تکمیل

آخر پانچ برس کی مسلسل خونریز فوجی آشام جنگوں کے بعد ۱۱۹۲ء میں رملہ پر دونوں حریفوں میں جو تھک کر چور ہو گئے تھے، صلح ہوئی، بیت المقدس اور مسلمانوں کے مفتوحہ شہر اور قلعے بدستوران کے قبضہ میں رہے، ساحل پر عکہ کی مختصر سی ریاست عیسائیوں کے قبضہ میں تھی، اور سارا ملک سلطان صلاح الدین کے زیر نگیں تھا، صلاح الدین نے جو خدمت اپنے ذمہ لی تھی، اور صحیح تر الفاظ میں جو کام اللہ تعالیٰ نے اس کے سپرد کیا تھا، اس کے ہاتھوں مکمل ہوا، عیسائی مورخ اس کی کامیابی اور جنگ صلیبی کے نامبارک سلسلہ کے اختتام کا ذکر اس طرح کرتا ہے:-

جنگ مقدس خاتمہ کو پہنچی پانچ برس کی مسلسل لڑائیاں ختم ہوئیں، جولائی ۱۱۸۷ء میں حطین پر مسلمانوں کی فتح سے قبل دریائے اردن کے مغرب میں مسلمانوں کے پاس ایک پنج زمین بھی رہی تھی، ستمبر ۱۱۹۲ء میں جب رملہ پر صلح ہوئی ہے، تو صور سے لے کر یافک ساحل پر بحر زمین کی ایک پتلی سی پٹی کے سارا ملک مسلمانوں کے قبضہ میں تھا، اس صلح نامہ پر صلاح الدین کو شرمندہ ہونے کی مطلق ضرورت نہ تھی، صلیبیوں نے جو کچھ فتح کیا تھا، اس کا بڑا حصہ افرنجیوں کے پاس رہا، لیکن اگر صرف جان مال کا لحاظ کیا جائے، تو یہ نتیجہ نہایت حقیر تھا، پاپائے روما کی فریاد سنتے ہی کل سچی دنیا نے ہتھیار اٹھائے تھے، قیصر فریڈرک شاہان انگلستان فرانس و صقلیہ، آسٹریا، کالیپولڈ برگنڈی کا ڈیوک، فلانڈرز کا کاؤنٹ صد ہا مشہور و معروف سیرن اور تمام عیسائی قوموں کے نارٹ برشلیم کا عیسائی بادشاہ اور فلسطین کے دیگر عیسائی و ایوان ملک طبقہ داویہ اور طبقہ البیطار کے بڑے بڑے شہسوار اس کوشش میں مصروف ہوئے کہ بیت المقدس پر اپنا

قبضہ اور برشلیم کی مسیحی سلطنت جو ٹٹنے کے قریب ہے، پھر سرسبز ہو جائے، لیکن انجام کیا ہوا، اسی دوران میں قیصر فریڈرک قضا کر گیا، شاہان انگلستان فرانس اپنے اپنے ملک کو سدھائے اور ان کے بڑے بڑے شریفین اور معزز ساتھی ارض ایلیا میں خاک کا پیوند ہوئے، لیکن برشلیم اس پر بھی سلطان صلاح الدین کا رہا، صرف ساحل عکہ کی مختصر سی ریاست پر اس کا برائے نام عیسائی بادشاہ حکومت کرتا رہا۔ تیسری جنگ صلیب میں تمام سچی دنیا کی مجموعی طاقت مقابلہ کرنے آئی، مگر صلاح الدین کی قوت کو ٹٹ سے نہ کر سکی، صلاح الدین کی سپاہ ہمینوں کی سخت محنت و جانفشانی اور برسوں کی محنت اور خطرناک خدمت کے بعد تھک کر چور ہو چکی تھی، مگر کسی زبان پر حرف شکایت نہ تھا، کبھی طلبی پر حاضر ہونے اور ایک نیک کام میں اپنی جانیں قربان کرنے سے کسی نے انکار نہ کیا، دریائے دجلہ کی دور دراز وادیوں میں ممکن ہے کہ سلطان کے تابع و ایوان ملک کے دل میں اس ہمیشہ کی طلبی ملک پر کچھ شکایت پیدا ہوئی ہو، لیکن بہر کیف اپنی فوجیں سلطان کی خدمت میں بڑی جان نثاری اور نیک خواہی کے ساتھ لائے، آخری جنگ جو ارسوت پر ہوئی، اس میں موصل کی فوجوں نے بڑی مردانگی اور جانبازی سے کام لیا، ان تمام لڑائیوں میں سلطان کو ہمیشہ مصر اور عراق کی فوجوں سے مدد ملنے کا بھروسہ رہا۔ اور یہی تقویت ملک شام کی شمالی اور مرکزی فوجوں سے رہی، کہ ہترکان، عرب، مصری سب مسلمان اور سلطان کے خادم تھے، اور طلبی پر خادموں کی طرح سلطان کی خدمت میں حاضر ہوئے، باوجود اس کے کہ ان کی نسل و قوم جدا تھی، اور باوجود قومی چشمکوں اور قبائلی غرور و تفاخر کے سلطان نے ان کو ایسا شہرہ شکر بنا رکھا تھا کہ تمام لشکرتن واحد نظر آتا تھا، سب ایک ہی لشکر کے رکن رہے، دو ایک مرتبہ اس میں شک نہیں کہ ان کو متفق اور متحد رکھنے میں مشکلات پیش آئیں، اور بعض نازک مواقع ایسے بھی آئے کہ ان کی طبیعتوں میں فرق پیدا ہوتا معلوم ہوا، باوجود یہاں فوج کے متحدہ کے یہ تمام مختلف النسل قومیں ۱۱۹۲ء کے موسم خریف تک سلطان کے حکم کے تابع رہیں، اور جس طرح ۱۱۸۷ء میں پہلی مرتبہ خدا کی

راہ میں کام کرنے کو انھیں طلب کیا تھا، اسی طرح اخیر تک راہ خدا میں وہ کام کرتی رہیں، اس تمام زمانہ میں نہ تو سلطان کا کوئی صوبہ اس سے منحرف ہوا اور نہ کسی ماتحت سردار یا باج گزار ریاست نے اس سے بغاوت کی، گو جو توقعات ان کی خیر خواہی اور جفاکشی سے رکھی گئی تھیں وہ کافی طور پر ایسی تھیں کہ مضبوط سے مضبوط اعتقاد اور قیادت کی طاقت کو کبھی آزمائش میں لاکر ہر ادیتیں، صرف عراق میں سلطان کے ایک عزیز کی سرکشی کی مثال جس کی اصلاح فوراً معافی لے کر کر دی گئی، ایسی ہے جس کا استثنا اس اثر کو اور قوت کے ساتھ ثابت کرتا ہے، جو سلطان اپنی رعایا پر رکھتا تھا، جب جنگ پنج سالہ کی یہ آزمائشیں اور تکلیفیں ختم ہوئیں، تب بھی سلطان کردستان کے پہاڑوں سے لے کر صحرائے نوبہ تک بذاتِ واحد حکمران رہا، اور ان حدود سے بھی دور کردستان کا بادشاہ ارمنیہ کا کاٹلین (حاکم وقت) تونیزہ کا سلطان اور سلفظیہ کا قیصر اس بات کا شوق رکھتا ہے کہ صلاح الدین کو اپنا دوست اور مدد و معاون سمجھیں، لیکن صلاح الدین ان دوستوں اور اتحادیوں میں سے کسی کا زیر بار احسان نہ ہوا، اس کی مدد کو نہ آئے مبارکباد دینے البتہ حاضر ہوئے، یہ کل کشمکش صرف صلاح الدین نے کی تھی، بجز سلطان کے بھائی العادل کے جو آخری زمانہ میں بین طور پر سب کے سامنے آیا، ممکن نہیں کہ کوئی شخص کسی ایک پر سالار یا مشیر کو بتا سکے جس کی نسبت کہہ سکیں کہ وہ سلطان کا مشیر یا صلاح کار ہو کر اس پر حاوی ہو گیا تھا، ایک مجلس حرب البتہ اس کے یہاں تھی، جو معاملات جنگ میں مشورہ دینی تھی، اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوا تھا کہ سلطان کی صحیح رائے پر اس کی غلط رائے غالب آگئی، جیسا کہ صورتاً اور عملہ کے سامنے ہوا تھا، لیکن اس مجلس میں بھی اس کے کسی ایک رکن کی طرف اشارہ نہیں کر سکتے کہ اس کی رائے نے سلطان پر کسی دوسرے کی رائے سے زیادہ اثر کیا ہو، بھائی بیٹے، بھتیجے، پڑانے رفیق، نئے ماتحت عامل، اور ہوشیار قاضی، مخاطب اور ذفا شعار محمد وزیر، متعصب و اعظا، اور ملا بھی اس میں تحقق الکلام تھے، کہ جہاد کیا جائے، اور سب میں شریک بھی ہوئے، اور سب نے آقا کی بڑی تندہی اور خیر خواہی سے اپنی اپنی لیاقت اور قوت کے مطابق مدد کی، لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا، جو اس بات کو بھولا ہو کہ آقا کون ہے؟ اس تشویش، فکر اور محنت و

جانفشانی کے نازک وقت میں صرف ایک دل اور ارادہ تھا، جو سب پر حاوی تھا، اور یہ دل اور ارادہ سلطان صلاح الدین کا تھا۔

وفات

بالآخر اپنا مقدس فریضہ ادا کر کے اور عالم اسلام کو صلیبیوں کی غلامی کے خطرہ سے محفوظ کرنے کے بعد ۲ صفر ۵۸۹ھ کو اسلام کا یہ وفادار فرزند دنیا سے رخصت ہوا، اس وقت ان کی عمر ستاون سال کی تھی، قاضی بہاء الدین بن شداد سلطان کی وفات کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

”۲ صفر کی شب کو جو سلطان کی علالت کا بار ہوا دن تھا، مرض میں شدت ہو گئی، اور قوت گھٹ گئی

شیخ ابو جعفر امام الکلاہ کو جو ایک نہایت صالح اور بزرگ شخص تھے، زحمت دی گئی کہ رات کو قلعہ میں

رہیں کہ اگر رات کو وہ ساعت مقررہ آگئی، جو سب کو پیش آنے والی ہے تو وہ اس وقت سلطان کے پاس

ہوں اور ان کو تلقین کر سکیں، اور اللہ کا نام لیں، رات کو سلطان ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سفر کے لئے پارکاب

ہیں، شیخ ابو جعفر ان کے پاس بیٹھے ہوئے تلاوت و ذکر میں مشغول تھے، تین دن پہلے سے ان پر ایک ذہول

اور غفلت طاری تھی، کسی کسی وقت ان کو ہوش آتا تھا، جب شیخ ابو جعفر نے تلاوت کرتے ہوئے *هُوَ اللَّهُ*

الَّذِي لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ پڑھی تو سلطان کو ہوش آ گیا، ہونٹوں پر مسکراہٹ

آئی، اور چہرہ کھل گیا، اور کہا صحیح ہے، اور یہ کہہ کر جان جان آفریں کے سپرد کی، یہ چہرہ شنبہ کا دن صفر کی تاریخ

اور فجر کا وقت تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خلفائے راشدین کی وفات کے بعد سے ایسا سخت دن مسلمانوں

کی تاریخ میں نہیں آیا، قلعہ، شہر اور تمام دنیا پر ایک وحشت سی برتی تھی، اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے کہ کیسا

ستاٹا اور کسی اداسی تھی، میں پہلے جب سنتا تھا کہ لوگ دوسروں پر قربان ہو جانے اور ان کا ذریعہ بن جانے

کی تناکرتے ہیں تو سمجھتا تھا کہ یہ محض ایک مجاز اور تکلف کی باتیں ہیں، لیکن اس دن معلوم ہوا کہ یہ حقیقت ہے، خود میں اور بہت سے لوگ ایسے تھے کہ اگر ان کے امکان میں ہوتا تو وہ سلطان پر اپنی جان قربان کر سکیں، اور اس کی طرف سے فدیہ ہو جائیں تو وہ اس کے لئے تیار تھے۔

قاضی ابن شداد لکھتے ہیں کہ سلطان نے اپنے ترکہ میں صرف ایک نینار اور ۴۴ درہم چھوڑے تھے، کوئی ملک، مکان، جائیداد، باغ، گاؤں، زراعت نہیں چھوڑی، ان کی تجہیز و تدفین میں ایک پیسہ بھی ان کی میراث سے صرف نہیں ہوا، سارا سامان قرض سے کیا گیا، یہاں تک کہ قبر کے لئے گھانس کے پوٹے بھی قرض سے آئے، کفن کا انتظام ان کے وزیر و کاتب قاضی فاضل نے کسی جائز و حلال ذریعہ سے کیا۔

درویش سیرت سلطان

قاضی ابن شداد سلطان کی سیرت، اخلاق و عادات اور خصوصیات میں لکھتے ہیں:-

”سلطان نہایت صحیح العقیدہ، راسخ الاعتقاد مسلمان تھے، عقائد میں اہل السنۃ و الجماعۃ کے ہم مسلک، ہم اعتقاد، نماز و واجب کے بڑے پابند، ایک موقع پر فرمایا کہ ساہا سال ہو گئے، میں نے ایک نماز بھی بے جا نہیں پڑھی، حالت مرض میں بھی امام کو بلا لیتے، اور تکلف کھڑے ہو کر نماز پڑھتے، سنن رواتب پر مداومت تھی، رات کو حتی الامکان نوافل پڑھتے، اگر رات کے نوافل رہ جاتے تو راتناغیہ کے مسلک کے مطابق نماز فجر سے پہلے ادا کرتے، ان کو آخری بیماری میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے دیکھا، صرف تین دن جن میں ان پر بیہوشی طاری رہی، نماز فوت ہوئی، زکوٰۃ فرض ہونے کی ساری عمر نوبت ہی نہیں آئی، اس لئے کہ انھوں نے کبھی اتنا پس انداز ہی نہیں کیا جس پر زکوٰۃ فرض ہوا، ان کی ساری دولت صدقا و خیرات میں خرچ ہوئی، صرف ۴۴ درہم ناصری اور ایک سونے کا سکہ چھوڑا، باقی کوئی جائیداد، ملکیت نہیں چھوڑی۔

رمضان میں روزے کے سخت پابند تھے، کچھ روزے ان کے ذمہ باقی تھے، قاضی فاضل کی یادداشت میں تحریر تھے، وفات سے پہلے پہلے بڑے اہتمام سے وہ سب روزے قضا کئے، معالج نے ہر چند منع کیا، لیکن فرمایا کہ کل کا حال مجھے معلوم نہیں، چنانچہ ان کی قضا کے بعد ہی خود قضا کر گئے۔

حج کی بڑی آرزو تھی، لیکن اس کا موقع نہیں مل سکا، وفات کے سال اس کا شوق بہت غالب تھا، لیکن نوبت نہیں آنے پائی۔

قرآن مجید سننے کا بڑا شوق تھا، کبھی کبھی اپنے برج میں پہرہ داروں سے دو دو تین تین چار چار پارے سن لیتے، بڑے فاشح، خاص، رقیق القلب تھے، قرآن مجید سن کر اکثر آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے، حدیث سننے کے بڑے شائق تھے، اور اس کا بڑا احترام کرتے تھے، حدیث کی قرأت کے وقت لوگوں کو احتراماً بیٹھ جانے کا حکم دیتے، اگر کوئی عالی سلسلہ حدیث کا شیخ ہوتا، تو خود اس کی مجلس میں جا کر حدیث سننے، خود بھی حدیث کے قرأت کا شوق تھا، اگر کسی حدیث میں کوئی عبرت کی بات ہوتی تو آنکھیں پرنم ہو جاتیں، عین میدان جنگ میں بعض مرتبہ دو صفوں کے درمیان کھڑے ہو کر حدیث کی سماعت کی کہ یہ وقت خاص فضیلت کا ہے، دینی شاعر کی بڑی تعظیم کرتے، سہروردی ملحد کو انہی کے ایما سے ان کے صاحبزادہ الملک الظاہر نے قتل کر دیا، ان کو خدا پر بڑا بھروسہ اور اس کی ذات عالی کے ساتھ بڑا حسن ظن تھا، کٹھن گھڑوں اور نازک و قات میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور دعا و مناجات کی عادت تھی، ایک مرتبہ بیت المقدس کو صلیبی افواج کی طرف سے جو اس کے قریب مجتمع تھیں، سخت خطرہ لاحق تھا، سلطان کو بیت المقدس کی بڑی فکر تھی، اور وہ کسی طرح بھی وہاں سے چلے جانے پر راضی نہ تھے، شب جمعہ تھی، جاڑوں کی راتیں تھیں، میں تنہا خدمت میں حاضر تھا، ہم دونوں رات بھر ذکر و دعائیں مشغول رہے، سلطان کے مزاج پر اکثر خشکی اور یسوست غالب آجایا کرتی تھی، رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے مجھے اندیشہ ہوا کہ ان کا مزاج ناساز ہو جائے گا، میں نے عرض کیا کہ کچھ دیر آرام فرمائیں، فرمایا شاید تمہیں نیند نے

ستایا ہے اس لئے مجھے مشورہ دیتے ہو یہ کہہ کر وہ اٹھے لیکن تھوڑی ہی دیر میں موزن نے صبح کی اذان دی
 میں عموماً فجر ساتھ ہی پڑھا کرتا تھا، حاضر ہوا تو دیکھا کہ اپنے ہاتھ پاؤں پر پانی ڈال رہے ہیں، مجھے دیکھ کر
 فرمایا کہ میں نے جھپکی بھی نہیں لی، ہم نماز میں مشغول ہو گئے، مجھے ایک خیال آیا، اور میں نے عرض کیا کہ میرے
 ذہن میں ایک بات آئی ہے، اور انشاء اللہ وہ مفید ہوگی، وہ یہ کہ آپ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں اور اس
 گڑگڑا کر دعا مانگیں، اور یقین رکھیں کہ وہی مشکل آسان کر سکتا ہے، فرمایا کہ اس کی کیا ترکیب ہے؟ میں نے
 عرض کیا کہ آج جمعہ کا دن ہے، مسجد جاتے ہوئے آپ غسل فرمائیں، اور مسجد اقصیٰ میں اس مقام پر نماز پڑھیں
 جہاں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم معراج میں تشریف لے گئے، اور پہلے کسی محتر آدمی کے ذریعہ بالکل پوشیدہ طور پر
 کچھ صدقہ کریں، پھر اذان و اقامت کے درمیان دو رکعت نماز پڑھیں ایک حدیث میں اس کی فضیلت
 اور اس وقت دعا کی قبولیت کی خبر دی گئی ہے، اور سجدہ میں سر رکھ کر عرض کریں کہ خدا یا مادی اسباب او
 دنیاوی سہارے سب ٹوٹ چکے، اب تیرے دین کی مدد اور فتح کے لئے صرف یہی سہارا رہ گیا ہے کہ تیرے
 آستانہ پر سر رکھ دیا جائے، اور تیرے سہارے کو مضبوط پکڑ لیا جائے، اب صرف تیرا بھروسہ ہے، اور تو ہی
 میرا حامی و ناصر ہے، مجھے امید قوی ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی دعا قبول فرمائے گا، سلطان نے ایسا ہی کیا،
 میں نے اپنے معمول کے مطابق ان کے پہلو میں نماز پڑھی، میں نے دیکھا کہ وہ سجدہ میں پڑے ہیں، آنسوؤں
 سے ان کی داڑھی تر ہو گئی ہے، اور جانماز پر آنسو ٹپ ٹپ کر رہے ہیں، میں نے نہیں سنا کہ انھوں نے
 کیا دعا کی، اسی دن سے ان کی دعا کے قبولیت کے آثار ظاہر ہونے لگے، صلیبی فوجوں میں انتشار و
 اضطراب پیدا ہوا، پے در پے اطمینان بخش اطلاعات آتی رہیں، یہاں تک کہ دو شنبہ کی صبح تک
 میدان بالکل صاف ہو گیا، اور حملہ آور فوجیں بیت المقدس کا خیال چھوڑ کر رملہ کی جانب
 چلی گئیں!

محاسن اخلاق

عبادات و فضائل اعمال کے علاوہ حاکمانہ فضائل، عدل، عفو و حلم، ہمد و سخاوت، مروت و شرافت
 صبر و استقامت، شجاعت و فتوت، اور شہامت و علو ہمت کے اوصاف عالیہ سے آراستہ تھے۔
 قاضی ابن شداد لکھتے ہیں کہ ہفتہ میں دو بار، دو شنبہ و پنجشنبہ کو اذن عام ہوتا تھا، فقہاء، قضاة
 و علماء اور اہل مقدمہ حاضر ہوتے، بڑے چھوٹے امیر غریب، بوڑھے اور عام بڑھیوں تک کو آنے کی اجازت تھی،
 سفر و حضر میں کبھی اس معمول میں فرق نہ آتا، رات دن میں ایک بار خود معاملات کو دیکھتے، اور رقعات و فرامین
 پر خود دستخط کرتے، کبھی کسی صاحب غرض اور حاجت مند کو ناکام واپس نہ کرتے، اس کے ساتھ ساتھ ذکر و
 تلاوت میں مشغول رہتے۔

اگر کوئی فریاد یا شکایت کرتا تو خود کھڑے ہو کر اس کا مقدمہ سنتے اس کی داد دے دیتے اور اس کے
 معاملہ سے پوری دلچسپی لیتے، ایک مرتبہ ایک معمولی شخص نے ان کے بھتیجے تقی الدین کے خلاف (جو سلطان
 کو بہت عزیز تھے) دعویٰ کیا، سلطان نے فوراً ان کو طلب کیا، اور مقدمہ کی سماعت کی، خود ان کے خلاف
 ایک شخص نے دعویٰ کیا، سلطان نے معاملہ کی پوری تحقیق کی، اگرچہ مدعی کا حق ثابت نہیں ہوا، لیکن سلطان
 نے اس کو ناکام واپس نہیں کیا، اور خلعت و مال سے سرفراز کیا۔

بڑے بردبار اور تحمل مزاج تھے، مورخ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ اپنے رفقاء و خدام کی غلطیوں
 اور لغزشوں سے چشم پوشی کرتے، بعض مرتبہ کوئی ایسی بات سنتے جس سے ان کو تکلیف یا ناگواری ہوتی،
 لیکن وہ اس کو محسوس بھی نہیں ہونے دیتے اور نہ اپنے طرز عمل سے کوئی فرق آنے دیتے، ایک
 مرتبہ پانی مانگا، پانی نہیں آیا، پھر مانگا، پھر نہیں ملا، یہاں تک کہ ایک ہی مجلس میں پانچ مرتبہ
 نوبت آئی، آخر میں کہا کہ دوستو! میں تو پیاس سے مر جا رہا ہوں، اتنے میں پانی آیا، سلطان نے پانی لیا

مغرب تک گھوڑے پر سوار ایک طرف سے دوسری طرف برابر چکر لگاتے اور افواج اور انتظامات کا معائنہ فرماتے اور پھوڑوں کی تکلیف کو تحمل سے برداشت کرتے، میں تعجب کا اظہار کرتا تو فرماتے کہ گھوڑے پر سوار ہونے کے بعد مجھے درد کا احساس نہیں رہتا۔

ایک معرکہ میں حالت بیماری میں برابر دشمن کا تعاقب کیا، ایک رات میں اور طبیب سلطان کے پاس تھے، ہم تیمارداری بھی کرتے تھے اور ان کی طبیعت بھی بہلاتے تھے، سلطان کبھی سوتے کبھی جاگتے، یہاں تک صبح ہو گئی، سلطان سوار ہو کر تیار ہو گئے، اپنے لڑکوں کو لشکر کے راستے میں سب آگے کیا، اور سب کو خدا کے نذر کر دیا، ایک ایک کے سلطان نے سب کو روانہ کر دیا، صرف میں اور طبیب رہ گئے، شام تک سلطان اسی طرح اپنی جگہ پر کھڑے رہے اور جنگ کی نگرانی کی، یہاں تک کہ رات کو لشکر کو مسلح اور ہوشیار رات گزارنے کی اجازت ملی، اور ہم اور سلطان اپنے خیمہ میں واپس آئے۔

شجاعت میں سلطان ضرب المثل تھے، قاضی ابن شداد راوی ہیں کہ سلطان دن میں ایک ایک دو دو بار دشمن کے گرد گشت کرتے، گھمسان کی لڑائی میں سلطان تین تہا گھوڑے پر صفوں کے درمیان چکر لگاتے، ایک کو لگھوڑا سائیس کے ساتھ ہوتا، اور وہ خیمہ سے میسرہ تک فوجوں میں گھستے، صفیں چیرنے نکل جاتے فوجی دستوں کو بلاتے، ان کو مناسب مقامات پر بٹھرنے یا بڑھنے کا حکم دیتے، ان کے اطمینان اور بے خوفی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ان سے کہا کہ سلطان نے مختلف مواقع پر حدیث سنی ہے، لیکن کبھی عین معرکہ اور دو صفوں کے درمیان حدیث سننے کی نوبت نہیں آئی، اگر یہ شرف بھی حاصل ہو جائے تو بہت اچھا ہے چنانچہ سلطان نے صفوں کے درمیان کھڑے ہو کر حدیث شریف کی سماعت کی، انھوں نے کبھی دشمن کی تعداد کی پرواہ نہیں کی، اور نہ کبھی اس کا اثر قبول کیا، بعض بعض مرتبہ پانچ پانچ چھ لاکھ کی تعداد ان کے مقابلہ میں تھی، اللہ نے ان کو فتح دی، اور کثیر خلقت قتل اور گرفتار ہوئی، ایک مرتبہ دشمن کے کچھ اور پرتز

جہاز عکس میں آئے، میں عصر سے مغرب تک گنتا رہا، لیکن سلطان کے چہرہ پر شکن نہ تھی، عکس کے سب سے بڑے معرکہ میں مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے، قلب لشکر تک نے اپنی جگہ چھوڑ دی، نشان و پرچم اور طلشے زمین پر گر گئے، لیکن سلطان چند ساتھیوں کے ساتھ اپنی جگہ پر جمے رہے، یہاں تک کہ پہاڑ کو پشت پر رکھ کر کھڑے ہو گئے، مسلمانوں کو لاکھارا اور شرم دلایا، اور وہ میدان میں واپس آئے، اور دوبارہ حملہ کیا، جس میں دشمن کے سات ہزار آدمی قتل ہوئے اور مسلمانوں کو فتح ہوئی، سلطان کی بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قاضی ابن شداد کہتے ہیں کہ سلطان نے ایک روز فرمایا کہ میں تم سے اپنے دل کی بات کہتا ہوں، میرا ارادہ ہے کہ ساحل کو صلیبیوں سے پاک کرنے کے بعد ملک کو تقسیم کر دوں، وصیت کر کے اور ہدایات دے کر خود یہاں سے رخصت ہو کر چلا جاؤں اور سمندر میں سفر کر کے یورپ کے جزائر تک پہنچوں، اور ان مغربیوں (یورپین قوموں) کا وہاں تک تعاقب کروں کہ روئے زمین پر کوئی کافر نہ رہ جائے، یا میں اس ارادہ میں کام آجاؤں۔

علم و فضیلت

سلطان عالم فاضل شخص تھے، عرب کے انساب و قبائل یہاں تک کہ ان کے مشہور گھوڑوں کے سلسلہ انساب پر ان کو عبور تھا، عربوں کے واقعات و حالات ان کو مستحضر تھے، دنیا کے عجائبات و نوادیر کا ان کو علم تھا، ہر طرح کے معلومات رکھتے تھے، ان کے ہنشینوں کو ان سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی تھیں، بعض مورخین کا بیان ہے کہ ان کو حمار حفظ تھا، لیکن پول ان کی ابتدائی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

”اس کا اصلی رجحان طبیعت دینیات کی طرف تھا، علمائے وقت سے احادیث سنتے، ان کے براہین اور

راویوں کے سلسلہ کی تحقیق، مسائل فقہ پر بحث، آیات قرآنیہ کی تفسیر میں اسے بڑا اہم رکھتا تھا، اور سب سے بڑھ کر

اس بات کا ذوق تھا کہ مذہب اہل سنت و جماعت کی تائید اور ثبوت قوی دلائل سے دیا جائے۔“

فاطمی حکومت کا زوال و اصلاح الدین کا دوسرا کارنامہ

سلطان صلاح الدین کا مصر میں قدار عبیدی سلطنت (جو عام طور پر فاطمی مشہور ہے) کا خاتمہ تھا جو ۶۹۹ھ سے ۷۶۷ھ تک پورے دو سو اڑسٹھ سال بڑی شان و شوکت سے قائم رہی اور اس نے اسلامی دنیا کے ایک بڑے حصے کے عقائد و اعمال و اخلاق اور تمدن پر بڑا گہرا اثر ڈالا تھا، یہ دور حکومت اعتقادی عجائبات، عجیب و غریب حکام اور مضحکہ خیز قوانین سے پر تھا جس کے بعض نمونے مشہور مورخ مقریزی کی کتاب مخطط والآثار سے پیش کئے جاتے ہیں:-

۳۶۰ھ میں قانون میراث میں ترمیم کی گئی اور قانون بنا گیا کہ اگر متوفی نے بیٹی چھوڑی ہو تو بیٹے بھتیجے

بچا وغیرہ کو میراث میں کوئی حصہ نہیں ملے گا، اس قانون کی خلاف ورزی کو حضرت فاطمہ کے ساتھ عداوت

کا مراد سمجھا جاتا ہے ہلال کا دیکھنا پوری مملکت مصر میں موقوف ہو گیا روزہ اور عید حساب سے ہونے لگے۔

۳۷۰ھ میں پورے ملک مصر میں تراویح کی سرکاری مانعت کر دی گئی، موطا امام مالک کے ایک نسخہ کے

پلے جانے پر ایک شخص کی تشہیر کی گئی۔

۳۹۳ھ میں ۱۳ آدمیوں کو اس جرم میں زد و کوب کیا گیا، اور ان کی تشہیر کی گئی کہ انھوں نے صلوٰۃ الصغیٰ

(نماز چاشت) پڑھی تھی، ۳۹۵ھ میں بلوچیا (ایک ترکاری) کو جو اہل مصر کو بہت مرغوب ہے، اس لئے ممنوع

قرار دیا گیا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ کو بہت پسند تھی، ہجر حیر کی اس لئے مانعت ہوئی کہ کہا جاتا ہے کہ حضرت

عائشہؓ کو مرغوب تھی، اسی سلسلے میں تمام مساجد دیواروں، مقابر اور صحرا میں سلف کو سب و شتم اور

لعنت لکھی گئی، اور اس کو منقش کیا گیا، ۴۱۱ھ میں الظاہر لا عزاز دین اللہ نے شراب کی عام اجازت

لے، محققین انساب کا تقریباً اس پر اتفاق ہے کہ بنی عبید کو خاندان نبوت سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا، ان کا مورث اعلیٰ عبید مجوسی یا یہودی تھا، قاضی ابوبکر محمد بن الطیب نے اپنی کتاب لکشف عن اسرار الباطنیہ اور قاضی عبد الجبار نے کتاب تنبیہ النبوة اور مقدسی نے اپنی کتاب لکشف ما کان علیہ من عبید میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔

دی عیش و عشرت اور لہو و لعب کی گرم بازاری ہوئی، اسی زمانہ میں ملک میں سخت گرائی اور سیاریوں کا زور تھا،

لوگ محل شاہی کے گرد جمع ہو جاتے تھے اور اجوع اجوع (بھوک بھوک) کے نعرے لگاتے تھے لوٹ مار کی کثرت ہوئی۔

۴۲۴ھ میں بی عہد کی جس کی عمر ۶۶ سال کی تھی، سواری نکلی تھی تمام بازار آراستہ تھے، لوگ زمیں بوس ہوتے تھے۔

ان خلفاء میں متعدد اشخاص ایسے تھے، جو نہایت کم سنی میں خلیفہ بنائے گئے، اور مسلمانوں پر ان کی اطاعت

فرض قرار دی گئی، مستنصر باللہ جب خلیفہ ہوا تو سات برس کی عمر تھی، امر باحکام اللہ کی عمر خلافت کے وقت

پانچ سال ایک مہینہ کچھ دن تھی، الفاطمہ بنصر اللہ خلافت کے وقت صرف پانچ سال کا تھا، عاصد دین اللہ

کی عمر جب وہ خلیفہ ہوا گیا ۱۱ سال تھی۔

سلطان صلاح الدین کی حکومت سے اس دور کا خاتمہ اور دوسرے دور کا آغاز ہوا مصر سے شیعیت

رفض کے آثار مٹنے لگے، سنت کا فروغ ہوا، جا بجا مدارس قائم ہوئے جن میں علمائے سنت علوم دینیہ کی تعلیم دیتے،

رفتہ رفتہ عبیدی حکومت کے اثرات بالکل زائل ہو گئے، اس کے ساتھ اسماعیلیت جو تقریباً تین صدیوں تک

مصر کا سرکاری مذہب رہا تھا، مصر میں غریب الوطن ہو گیا، مورخ مصر مقریزی لکھتا ہے:-

واختفی مذہب الشیعة والاسماعیلیة ضعیف، اسماعیلیہ اور امامیہ کا مذہب بے پوش ہو گیا،

والامامیة حتی فقد من ارض مصر کلھا۔ یہاں تک کہ پورے ملک مصر میں اس کا کہیں وجود نہیں تھا

عبیدی حکومت کا یہ صد سالہ عہد اسلام کے لئے ایک دور ابتلا تھا، جس میں مسلسل شرایت و سنت اور

عقائد و اخلاق کے ساتھ تمسخر و تملاعب جاری رہا، اہل سنت اور اہل علم مقہور و مغلوب رہے، سفلہ طبیعت

اوباش مزاج، اور بد دین غالب و حاوی رہے، علامہ مقدسی اپنی کتاب کتاب الروضتین فی اخبار الدولتین میں

اس دور کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

وہی ہذا البلاء علی الاسلام من اول عبیدیوں کی حکومت آغاز سے اختتام تک یہ بلا

لہ کتاب المخطط والآثار للمقریزی ص ۳۵۵، ۳۵۶

دولتم الى اخرها وذلك من ذى الحجة سنة تسع وتسعين ومائتين الى سنة سبع وستين وخمسة وفي ايامهم كثرت الرافضة واستحكم امرهم ووضعوا الملك على الناس واقتدى بهم غيرهم وفسدت عقائد طوائف من اهل الجبال الساكنين بغور الشام كالصيرية والدروزية والحشيشة نوع منهم وتمكن دعواتهم منهم لضعف عقولهم وجهلهم ما يتمكنوا من غيرهم واخذت الفرنج اكثر البلاد بالشام والجزيرة الى ان من الله على المسلمين بظهور البيت الاتابكي وتقدمه مثل صلاح الدين فاستردوا البلاد وازالوا هذه الدولة عن ارقاب العباد.

اسلام پر مسطر ہی اس کی ابتدائی تاریخ ۲۹۹ھ سے ہوتی ہے اور اس کا خاتمہ ۵۶۷ھ پر ہوتا ہے ان کے دور حکومت میں وافض کی کثرت اور ان کا غلبہ ہوا لوگوں پر حاصل اور کسی مقرر کے لئے اور دوسروں ان کی اقتدار کی شامی حد پر بسے والے کوہستانوں نصیر پور، دروزیوں کے عقائد انہی کے اثر سے خراب ہوئے، حشیشی (بھنگ استعمال کرنے والے) انہی کی ایک قسم ہیں، ان اسماعیلیوں کے مبلغین کا جو اثر و نفوذ ان کوہستانیوں کے اندر ان کی کم عقلی اور جہالت کی وجہ سے ہوا، وہ دوسروں میں نہیں ہو سکا، انہی کے دور حکومت میں فرنگیوں نے شام اور جزیرہ کے اکثر اسلامی شہروں پر قبضہ کر لیا، یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا کہ خاندان اتابک برسر اقتدار ہوا، اور صلاح الدین جیسے مجاہد سامنے آئے جنہوں نے اسلامی ملک زمر نو باریا کیا، اور اس حکومت سے بندگان خدا کو نجات دی۔

اس انقلاب سلطنت پر جو ایک بڑے دینی و اخلاقی انقلاب کا پیش خیمہ تھا، صحیح العقیدہ مسلمان اور مجتہدین سنت کی مسرت بالکل قدرتی بات تھی، علامہ مقدسی نے جن کی ولادت سے صرف ۲۹ سال پہلے انقلاب ہوا تھا، اور ان تغیرات و اثرات کا انہوں نے خود مشاہدہ کیا تھا، جو اس کے نتیجے میں پیش آئے تھے

اپنی مسرت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:-

انقرضت تلك الدولة وزالت عن الاسلام بصريا بقروضها الذللة. اسلام کی ذلت کا دور بھی اختتام کو پہنچا۔

حافظ ابن قیم نے اپنی کتاب "الصواعق المرسله" میں باطنیوں کے عروج اور اس کے اثرات، پھر نور الدین اور صلاح الدین کے ہاتھوں اس سلطنت کے زوال کا تذکرہ ان پر جو شہ فاطمیں کیا ہے:-

"ان باطنیوں کی دعوت مشرق میں تو مضمحل ہو گئی اور مغرب میں رفتہ رفتہ اس کا ظہور شروع ہوا، یہاں تک کہ وہ بڑی طاقتور دعوت بن گئی اور اس کے پیچھے جم گئے، اور اس کے علمبردار مغرب اقصیٰ کے اکثر شہروں پر قابض ہو گئے پھر انہوں نے آگے قدم بڑھایا، اور مصر تک پہنچ گئے، انہوں نے اس پر قبضہ کر لیا، اور قاہرہ کی بنیاد رکھی، انہوں نے اور ان کے حکام و قضاة نے کھلے طریقے پر اپنی دعوت کا سلسلہ جاری رکھا، انہی کے زمانہ میں رسائل اخوان الصفا تصنیف ہوئے اور ابن سینا نے "اشارات" اور "شفاء" اور دوسری تصنیفات لکھیں، خود ابن سینا کا بیان ہے کہ میرے والد حاکم باشہ (فاطمی خلیفہ اور داعی) کے مبلغین میں سے تھے ان فاطمیوں کے دور میں سنت و آثار کا پلن ہو تو ہوا، اور کتب سنت بالائے طاق رکھی گئیں کہیں کوئی چھپ چھپا کر ان کو دیکھتا ہوگا، اور عمل کرتا ہوگا، اس دعوت کا تمغہ امتیاز اور بنیادی اصول یہ تھا کہ عقل کو انبیاء علیہم السلام کی وحی و تعلیمات پر ترجیح حاصل ہے۔

رفتہ رفتہ سارے ملک مغرب، مصر و شام و حجاز پر ان باطنیوں کا تسلط ہو گیا، عراق پر بھی سال بھر ان کا قبضہ رہا، اہل سنت ان کے دور حکومت اور ان کی مملکت میں ذمیوں (مسلمان حکومت کی غیر مسلم رعیت) کی طرح رہتے تھے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ذمیوں کو وہ امن و امان اور عزت و اعتبار حاصل تھا، جو اہل سنت کو نصیب نہ تھا، کتنے علماء اس دور میں قابل گردن زدنی قرار پائے، کتنے وارثین انبیاء ان کے قید خانوں میں پڑے پڑے دنیا سے چلے گئے۔

آخر غیرت الہی کو جوش آیا، اور نور الدین اور صلاح الدین کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان باطنیوں کے
پنچہ غضب سے چھڑایا، ان ملکوں میں اسلام کا دم واپس معلوم ہوتا تھا، لیکن اس انقلاب سلطنت اسلام
کو نئی زندگی عطا ہوئی، اور اس کا آفتاب اقبال گہن سے نکلا، اور رُسنے زمین کے مسلمانوں کو اس سے مسرت
ہوئی، جب کہ ہر طرف یہ پوچھا جا رہا تھا کہ اس دور ابتلا میں اسلام کا کوئی حامی و مددگار ہے؟ اللہ تعالیٰ
نے اپنے بندے اور شکر مجاہدین کے ذریعہ بیت المقدس کو پرستار ان صلیب سے آزاد کرایا، اور اللہ اور اس کے
رسول کے انصار نے اپنی اپنی ہمت اور توفیق کے مطابق دین حق کی نصرت کا حق ادا کیا!

اس عصر کی تاریخی کتابوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ عالم اسلام نے بالعموم اور شام و عراق نے بالخصوص
اس اطلاع کا گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا، اور عام و خاص مسلمانوں نے اس پر بڑی مسرت کا
اظہار کیا۔

اس طرح صلاح الدین نے ایک طرف مجاہدین صلیب کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک کر
عالم اسلام کو سیاسی غلامی اور اخلاقی و تہذیبی بد نظمی اور مغربی ترکتا زوں کی ہوس کا شکار بننے سے
صدیوں تک کے لئے محفوظ کر دیا، دوسری طرف عبیدی (مشہور بفاطمی) حکومت کا خاتمہ کر کے اس نے
ایک چشمہ فساد کو بند کر دیا، جو مصر سے نکل کر عالم اسلام میں باطنیت و اسماعیلیت کے اثرات کو پھیلا
رہا تھا، اور دو تین صدیوں سے امت میں ذہنی انتشار اور اعتقادی و اخلاقی فساد کا ذمہ دار تھا،
تاریخ اسلام صلاح الدین کے ان دونوں کارناموں کو کسی طرح فراموش نہیں کر سکتی، اور کسی ملک کا
مسلمان اس کردی مجاہد کے بار احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

جزاہ اللہ عن الاسلام والمسلمین خیر الجزاء

شیخ الاسلام عز الدین بن عبد السلام

سلطان صلاح الدین کی مجاہدانہ کوششوں ان کی علمی و دینی سرپرستی، جا بجا دینی مدارس کے قیام،
نیز شیعہ اثرات کے اضمحلال اور سنی العقیدہ سلاطین کے اثر سے علمی و عملی زندگی میں تازگی پیدا ہوئی، اور
علوم شرعیہ کے تعلیم و تعلم اور ان میں کمال پیدا کرنے کی طرف عالم اسلام میں از سر نو توجہ ہوئی، اس کا نتیجہ
تھا کہ ساتویں صدی ہجری میں متعدد باوقار دینی شخصیتیں پیدا ہوئیں، جنہوں نے اپنے اپنے دائرہ میں دعوت
و اصلاح کا فریضہ انجام دیا، اور حکومت اور زمانہ کے غلط رجحانات کا مقابلہ کیا، ان میں سب سے زیادہ
با عظمت شخصیت شیخ الاسلام عز الدین بن عبد السلام (م ۶۶۶ھ) کی ہے، جو اپنے علم و تقویٰ اور حق گوئی
و بیباکی میں نادرہ روزگار اور قرون اولیٰ کی یادگار تھے۔

علمی عظمت

عز الدین بن عبد السلام دمشق میں ۵۶۵ھ میں پیدا ہوئے، اساتذہ دمشق اور مشاہیر علماء سے تعلیم
حاصل کی، جن میں فخر الدین بن عساکر، سیف الدین آمدی، حافظ ابو محمد القاسم بن عساکر جیسے اجلہ علماء و
اساتذہ وقت تھے، بعض روایتوں کے مطابق انہوں نے جوانی میں پڑھنا شروع کیا، لیکن جلد تمام علوم میں تبحر
حاصل کر لیا، اور ان کے معاصرین ان کی علمی جلالت شان اور عظمت کا اعتراف کیا، علامہ ابن دین العبد نے

اپنی بعض تصانیف میں ان کو سلطان العلماء کے لقب سے یاد کیا ہے، وہ جب ۶۳۹ھ میں مصر تشریف لے گئے تو حافظ عبدالعظیم المنذری صاحب کتاب "التزغیب التزہیب" نے فتویٰ دینے سے معذوری ظاہر کی اور کہا کہ جس شہر میں عزالدین بن عبدالسلام ہوں، وہاں دوسرے کے لئے فتویٰ دینا درست نہیں، شیخ جمال الدین بن الحاجب کا قول ہے کہ فقہ میں شیخ عزالدین کا پایہ امام عزالی سے بلند ہے۔ ذہبی اپنی کتاب "العبر" میں لکھتے ہیں:-

انتهت الیہ معرفة المذهب مع الزهد
والورع وبلغ رتبة الاجتهاد۔
فقہ کے علم اور زہد و ورع میں ان کو کمال حاصل
تھا، اور درجہ اجتہاد کو پہنچے ہوئے تھے۔

شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے عرصہ تک دمشق میں "زاویہ عزالیہ" میں درس دیا، جامع اموی میں خطابت و امامت کے منصب پر عرصہ تک فائز رہے، شیخ شہاب الدین ابو شامہ کا بیان ہے کہ ان کی وجہ سے بدعات کا ازالہ ہوا، جو ان کے زمانہ میں رواج پذیر ہو گئی تھیں، صلاۃ الرغائب اور نصف شعبان کی کھل کر مخالفت کی، اور ان کو بدعت ثابت کیا، بعض اکابر علماء ان کے بارہ میں ساکت اور تردد تھے، الملک لکامل نے دمشق کے عہدہ قضا کے لئے بڑا اصرار کیا، شیخ نے بڑی شرطوں کے ساتھ اس کو منظور کیا، اسی عرصہ میں ایک بار وہ الملک لکامل کی طرف سے دربار خلافت (بغداد) میں سفیر بن کر گئے۔

لے طبقات الشافعیہ الکبریٰ ج ۵ ص ۱۳۱ ح ۱۳۱ صلاۃ الرغائب ایک نماز تھی، جو تائیس رجب کو بارہ رکعتوں اور خاص ترکیب کے ساتھ شب کو پڑھی جاتی تھی، اور اس کی بڑی فضیلت بیان کی جاتی تھی، یہ نماز ۴۲۵ھ میں ایجاد ہوئی، اور عام بدعات کی طرح تیزی سے پھیل گئی، شیخ عزالدین بن عبدالسلام نے اس کے ظہور کی پوری تاریخ لکھی ہے، ملاحظہ ہو اتحاف السعادی شرح احیاء المسکون، نصف شعبان پندرہویں شب کو تشریح کی گئی، خاص ترکیب کے ساتھ پڑھی جاتی تھیں، علمائے اہل سنت کے نزدیک یہ دونوں بدعت ہیں، ابن سبکی نے اس کو بدعت مذمومہ لکھا ہے، امام نووی نے اس کے لئے موضوع منکر اور

سلاطین کو صلاح نیک و اسلام اور مسلمانوں کی خیر خواہی

شیخ عزالدین کی شخصیت شام میں سب سے بڑی دینی شخصیت تھی، جس کا سلاطین وقت تک احترام کرتے تھے، وہ بڑے باوقار، بارعب اور خوددار تھے، انھوں نے کبھی کسی بادشاہ کے یہاں حاضری دینا یا دربارداری کرنا گوارا نہیں کیا، جب کبھی بادشاہ وقت نے خود تشریف آوری کی درخواست کی تو تشریف لے گئے، اور اس کو صحیح مشورہ دیا، اور اس کی اور اسلام، مسلمانوں کی خیر خواہی میں کمی نہیں کی۔

سلطان الملک الاشرف نے مرض الموت میں اپنے سب سے بڑے عہدہ دار کو شیخ کی خدمت میں بھیجا، اور کہا کہ آپ کا محب موسیٰ بن الملک عادل ابو بکر سلام عرض کرتا ہے، اور عیادت اور دعا کی درخواست کرتا ہے، اور چاہتا ہے کہ آپ اس کو کوئی ایسی نصیحت فرمائیں، جو کل خدا کے سامنے اس کے کچھ کام آئے، شیخ نے سن کر کہا کہ یہ عیادت افضل عبادت ہے، اس لئے کہ انشاء اللہ اس کا نفع متعدی ہے، چنانچہ تشریف لے گئے، سلطان ان کی تشریف آوری سے بیخبر و بے خبر رہا، ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا، اس سے پہلے سلطان کو کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی، اور سلطان عرصہ تک ان سے ناراض رہا تھا، سلطان نے اس کی معافی چاہی اور کہا کہ آپ

لے چھٹی ساتویں صدی میں اشعریت و حنبلیت کے اختلاف نے باوجود بنیادی اتحاد کے تقریباً وہ شکل اختیار کر لی تھی، جو چوتھی صدی میں اعتزال و سنیت کے اختلاف کی تھی، اشاعرہ صفات کی تشریح اور تاویل کرتے تھے، اور حنابلہ اس کو بالکل اپنی حقیقت اور لفظ پر رکھتے تھے، ہر گروہ خوش نیتی کے ساتھ اس کو دینی خدمت اور سنت و شریعت کے ساتھ خیر خواہی سمجھتا تھا، لیکن بعد کی صدیوں میں اس کو غیر معمولی اہمیت اور طول سے دیا گیا، اور رانی کا پہاڑ بن گیا، تحزب و تعصب اس کو بھی کفر و ایمان کا معیار قرار دے دیا، شیخ عزالدین کے زمانہ میں یہ مباحث بڑی شدت اختیار کر چکے تھے، وہ عقیدہ و علما اشعری تھے، الملک الاشرف حنابلہ کا معتقد اور حنبلیت کی طرف مائل تھا، ابتدا میں اس کو شیخ سے بدگمانی اور شکایت پیدا ہوئی، لیکن شیخ کی ملاقات اور تفصیلی

مجھے معاف فرمائیں میرے لئے دعا بھی فرمائیں اور مجھے کچھ نصیحت بھی فرمائیں، شیخ نے فرمایا کہ جہاں تک معاف کرنے اور باز پرس کرنے کا تعلق ہے، میں روزانہ سونے سے پہلے اللہ کے بندوں کو اپنی طرف سے معاف کر دیتا ہوں، اور اس وقت سوتا ہوں، جب کہ کسی کے ذمہ میرا کوئی حق یا مطالبہ یا شکایت باقی نہیں رہتی اور میرا اجر مخلوق کے بجائے اللہ کے ذمہ ہوتا ہے۔ "فَمَنْ عَفَى وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ"

باقی رہی دعائیں سلطان کے لئے اکثر دعا کیا کرتا ہوں، اس لئے کہ اس کی صلاح میں اسلام اور مسلمانوں کی خیر و فلاح ہے، اللہ تعالیٰ سلطان کو ان امور کی بصیرت عطا فرمائے، جن سے وہ خدا کے سامنے سرخرو ہو، یہی نصیحت تو اب وہ سلطان کی آمادگی اور تقاضے کی وجہ سے فرض واجب ہو گئی ہے، مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ کی فتوح اور دشمنوں پر غلبہ کی دھوم ہے، اس وقت حالت یہ ہو رہی ہے کہ تاتاری اسلامی ممالک میں گھستے چلے جا رہے ہیں، ان کو اس بات سے شہ تی ہے کہ آپ کو اس وقت اللہ تعالیٰ کے دشمنوں اور مسلمانوں کے حریفوں سے جنگ کرنے کی فرصت نہیں، اس وقت آپ کا بیخ الملک لکال سے جنگ کرنے کی طرف ہے، اور آپ ان کے مقابلہ کے لئے پڑاؤ ڈالے پڑے ہیں، الملک لکال آپ کے بڑے بھائی اور قریبی رشتہ دار ہیں، میں صرف یہ عرض کروں گا کہ آپ اپنا بیخ اپنے بھائی کی طرف سے ہٹا کر دشمنان اسلام کی طرف پھیر لیں، اور اس اخیر وقت میں اپنا رشتہ نہ توڑیں، آپ اللہ کے دین کی مدد اور اس کی سر بلندی کی نیت کریں، اگر اللہ تعالیٰ سلطان کو صحت عطا فرماتا ہے، تو ہم اللہ سے کفار پر آپ کے غلبہ کی امید رکھتے ہیں، اور آپ کے نامہ اعمال میں یہ سعادت لکھی جاتی ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ کا کچھ او فیصلہ ہے تو سلطان اپنی نیت کی برکت کے ساتھ دنیا سے جلتے ہیں۔

سلطان نے کہا اللہ تعالیٰ آپ کو اس بروقت تنبیہ اور مخلصانہ مشورہ پر جزائے خیر عطا فرمائے، اسی وقت حکم دیا کہ فوج کا رخ بجائے مصر کے (جو الملک لکال کی جانب تھا) تاتاریوں کی طرف کر دیا جائے اور فوج اس مقام سے کوچ کر کے مقام قصیرہ میں پڑاؤ ڈالے، چنانچہ دن کے دن اس کی تعمیل ہوئی، اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ بادشاہ کا ارادہ اب تاتاریوں سے مقابلہ کرنے کا ہے۔

الملک الاشرف نے مزید نصیحت کی فرمائش کی، شیخ نے فرمایا کہ بادشاہ تو اس حال میں ہے اور نابین سلطنت اور اہل کاران حکومت رنگ رلیاں کر رہے ہیں، شراب کے دور چل رہے ہیں، گناہوں کا ارتکاب ہو رہا ہے، نئے نئے محاصل اور ٹیکس مسلمانوں پر لگائے جا رہے ہیں، آپ کے لئے خدا کے حضور میں سب سے افضل عمل پیش کرنے کا یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ان سب گناہوں کو دور کریں، یہ نئے نئے ٹیکس بند کریں، اور تمام ظالمانہ کارروائیاں روک دیں، اور اہل معاملہ کی داد رسی کریں، الملک الاشرف نے اسی وقت ان سب چیزوں کی ممانعت کے احکام جاری کئے، اور کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس دینی خدمت اور خیر خواہی پر تمام مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر دے، اور اپنے لطف و کرم سے مجھے جنت میں آپ کی معیت نصیب فرمائے، اسی کے ساتھ ایک ہزار دینار مصری نذر کئے، شیخ نے قبول کرنے سے معذرت کی، اور فرمایا کہ میری یہ ملاقات خالصتہً لوجہ اللہ تھی، میں اس میں دنیا کی کوئی آمیزش نہیں کرنا چاہتا۔

بادشاہ شام کے مقابلہ میں جرات و استقامت

الملک الاشرف کے جانشین صالح اسمعیل (ابو الجیش) نے الملک الصالح نجم الدین ایوب بادشاہ شام کے مقابلہ میں (جس کے شام پر حملہ کا خطرہ تھا) فرنگیوں سے مدد چاہی، اور حق الخدمت کے طور پر شہر صیدا اور ثقیف اور چند قلعوں کا پروانہ لکھ دیا، اس دوستانہ تعلق کی بنا پر فرنگی اتنے بے تکلف ہو گئے کہ دمشق میں آکر ہتھیار خریدنے شیخ کو اس بات سے بڑا صدمہ ہوا کہ فرنگی مسلمانوں کے شہر میں آکر ان سے ہتھیار خرید کر مسلمانوں کی گردنوں پر چلائیں، تاجرانِ اسلام نے شیخ سے فتویٰ پوچھا، شیخ نے صاف کہا کہ فرنگیوں کے ہاتھ ہتھیار فروخت کرنا حرام ہے، اس لئے کہ تم کو خوب معلوم ہے کہ یہ تمہارے مسلمان بھائیوں کے خلاف کام آئیں گے، شیخ کی طبیعت پر بادشاہ کی اس بے حسیتی اور اسلام کی اس ذلت و بے بسی کا بڑا اثر تھا، انہوں نے بادشاہ کے لئے خطبہ میں دعا ترک کر دی، اس کے بجائے وہ منبر پر دونوں خطبوں سے فایز ہو کر بڑے جوش کے ساتھ دعا کرتے تھے کہ الہی!

اسلام اور حامیان اسلام کی مدد اور نصرت فرما، اور محمدین و دشمنان دین کو ذلت و نکبت نصیب فرما، اور تمام مسلمان بڑی رقت و اثر کے ساتھ آمین کہتے تھے، حکومتی آدمیوں نے بڑھا چڑھا کر سلطان کو اس واقعہ کی اطلاع دی شیخ کی گرفتاری کا فرمان صادر ہوا، شیخ ایک عرصہ تک محبوس رہے، کچھ عرصہ کے بعد وہ دمشق سے بیت المقدس منتقل کئے گئے۔

اسی اثناء میں سلطان صالح اسمعیل، الملک المنصور والی حمص، اور سلاطین فرنگی اپنی افواج و عساکر کے ساتھ مصر کے ارادہ سے بیت المقدس آئے، صالح اسمعیل کے دل میں شیخ عزالدین کی ناراضگی برا بھلا کھٹکتی رہتی تھی، اور اس کو اس کی فکر تھی، اس نے اپنے عمائد و خواص میں سے ایک شخص کو اپنا رومال دیا، اور کہا کہ یہ رومال شیخ کی خدمت میں پیش کرنا، اور انتہائی خوشامد و استمالت کے ساتھ ان سے کہنا کہ سابقہ خدمات و مناصب پر آپ پورے اعزاز کے ساتھ واپس آسکتے ہیں، اگر وہ منظور فرمائیں تو میرے پاس لے آنا، اگر منظور نہ کریں تو میرے خیمہ کے پہلو میں دوسرے خیمہ میں ان کو محبوس کر دینا، امیر نے شیخ سے بڑی خوشامدانہ باتیں کیں، اور ان کی تنظیم و تکویم اور ان کی دجوئی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا، اور آخر میں کہا کہ آپ ذرا کے ذرا بادشاہ سے نیاز مند نہ لیں، اور اس کی دست بوسی کر لیں، تو قبضہ رفع دفع ہو جائے گا، اور آپ ضافہ و ترقی کے ساتھ اپنے سابقہ عہدوں پر واپس آجائیں گے، شیخ نے اس کا جو جواب یا وہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار ہے گا، انھوں نے فرمایا:-

واللہ یا مسکین ما ارضاه ان یقبل یدی
فضلان اقبل یدیہ یا قوم انتم فی واد
وانافی وادوالحمد للہ الذی عافانی
مما ابتلاکم بہ۔ (طبقات الشافعیہ - ج ۵)

اے نادان! میں تو اس کا بھی روادار نہیں کہ بادشاہ
میرے ہاتھ کو بوسہ دے چہ جائیکہ میں اس کی دست بوسی
کروں؟ گو گو تم کسی اور عالم میں ہو، میں کسی اور عالم میں
خدا کا شکر ہے کہ میرا اس آزاد ہوں جس میں تم گرفتار ہو۔

یہ جواب سن کر امیر نے کہا کہ پھر مجھے حکم ہے کہ میں آپ کو گرفتار کروں، شیخ نے کہا شوق سے جو کچھ تم سے ہو سکے، اسے دریا نہ کرو، امیر نے ان کو بادشاہ کے خیمہ کے پہلو میں دوسرے خیمہ میں رکھا، شیخ اپنے خیمہ میں قرآن مجید

پڑھتے رہتے تھے، اور بادشاہ اپنے خیمہ کے اندر سنتا تھا، ایک روز بادشاہ نے فرنگی بادشاہوں سے کہا کہ تم شیخ کو قرآن مجید پڑھتا ہوا سنتے ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہاں! کہا جانتے ہو، یہ مسلمانوں کا سب سے بڑا پادری ہے (حدیث اکبر قدوس المسلمین) میں نے اس کو اس لئے قید کیا ہے کہ وہ تم کو مسلمانوں کے قلعہ سپرد کرنے کے خلاف تھا، اور اس پر معترض نہ تھا، میں نے اس کو دمشق کی خطابت اور دوسرے منصبوں سے معزول کیا، اور اس کو دمشق سے شہر بدر کر دیا، اب میں نے تمہاری خاطر پھر اس کو قید کر دیا ہے، عیسائی بادشاہوں نے کہا کہ اگر یہ ہمارا پادری ہوتا تو ہم اس کے پاؤں دھو کے پیٹتے۔

اسی عرصہ میں مصری افواج آئیں، صالح اسمعیل کو شکست ہوئی، فرنگی افواج قتل و غارت ہوئیں، اور شیخ صحیح و سلامت مصر روانہ ہو گئے۔
راستہ میں جب کرک کی ریاست سے گزرنا ہوا تو والی کرک نے قیام کی درخواست کی، فرمایا کہ:-
”تمہارا یہ مختصر شہر میرے علم کا متحمل نہیں ہو سکتا“

شیخ عزالدین مصر میں

مصر میں سلطان مصر الملک لصالح نجم الدین نے شیخ کو ہاتھوں ہاتھ لیا، جامع عمرو ابن العاص کا خطیب مقرر کیا، اور الوجہ القبلی مصر کا عہدہ قضا اور ویران مسجد کی آبادی کا کام سپرد کیا، سلطان نے جب مدرسہ صاحبیہ کی تعمیر کی، تو مذہب شافعی کی تعلیم شیخ عزالدین کے سپرد کی، اور انھوں نے پورے اہٹاک کے ساتھ تعلیم و اشاعت علم کا فرض انجام دیا، اور لوگوں کو بہت نفع ہوا۔

شیخ کی حق گوئی و بیباکی

اسی دوران میں ایک مرتبہ فخر الدین عثمان نے جو قصر شاہی کا مہتمم اور عملاً سلطنت مصر کا منظم اعلیٰ تھا

لہ طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۵ ص ۱۱۱ بروایت شیخ شرف الدین عبداللطیف فرزند شیخ عزالدین ابن عبدالسلام

مصر کی ایک مسجد کی چھت پر طبل خانہ کی عمارت بنوائی اور وہاں طبل و نقارہ بجنے لگا، شیخ عبدالدین کو جب اس واقعہ کی تحقیق ہوئی تو انھوں نے (بحیثیت قاضی اور مہتمم مسجد کے) اس عمارت کے انہدام کا حکم دے دیا اور اس جرم میں فخر الدین کو ساقط الشہادۃ قرار دیا، اور ساتھ ہی ساتھ عہدہ قضا سے استعفا دے دیا اس کا روای سے سلطان کی نگاہ میں شیخ کی منزلت کم نہیں ہوئی، مگر اس نے عہدہ قضا پر شیخ کا دوبارہ تقرر نہیں کیا، ادھر شیخ کے فیصلوں کا اتنا احترام اور ان کا ذہنی نفوذ و اثر اس قدر تھا کہ اسی زمانہ میں الملک الصالح سلطان مصر نے خلیفہ بغداد کی خدمت میں ایک سفارت بھیجی، جب سفیر کی باریابی ہوئی، اور اس نے سلطان مصر کا پیغام پہنچایا تو اس سے دریافت کیا گیا کہ یہ پیغام تم نے خود سلطان مصر کی زبان سے سنا ہے یا کسی کے واسطے سے؟ اس نے کہا کہ میں نے یہ پیغام مہتمم قصر شاہی فخر الدین کی زبان سے سنا ہے، خلیفہ نے کہا کہ فخر الدین کی شہادت معتبر نہیں، اس کو شیخ عبدالدین نے ساقط الشہادۃ قرار دیا ہے، اس لئے ہم اس کی روایت قبول نہیں کر سکتے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سفارت پھر مصر واپس آئی اور براہ راست سلطان سے پیغام سن کر بغداد واپس ہو کر خلیفہ کو پیغام پہنچایا۔

ان کی جرات کا اس سے زیادہ حیرت انگیز واقعہ یہ ہے کہ عید کے دن قلعہ میں دربار شاہی تھا، بادشاہ اپنے ترکہ احتشام کے ساتھ سریر آرا تھا، دورویہ افواج شاہی دست بستہ کھڑی تھیں، امراء حاضر ہو کر آداب تسلیمات بجالاتے تھے، اور زمین بوس ہوتے تھے، اس بھرے دربار میں دفعۃً شیخ نے بادشاہ کو نام لے کر خطاب کیا اور کہا کہ ایوب! خدا کو تم کیا جواب دو گے، جب پوچھا جائے گا کہ تم نے تم کو مصر کی سلطنت اس لئے دی تھی کہ شراب آزادی سے پی جائے؟ بادشاہ نے کہا کہ کیا یہ واقعہ ہے؟ شیخ نے بلند آواز سے فرمایا، ہاں فلاں میخانہ میں شراب آزادی سے بک رہی ہے، اور دوسرے ناگفتنی کام ہو رہے ہیں، اور تم یہاں بیٹھے داد عیش دے رہے ہو، بادشاہ نے کہا کہ جناب والا مجھے اس میں کچھ دخل نہیں، یہ میرے والد کے زمانہ سے ہو رہا ہے، شیخ نے فرمایا کہ پھر تم بھی انہی لوگوں میں سے ہو، جن کا جواب یہ ہوتا ہے: **اِنَّا وَجَدْنَا اٰبَاءَنَا عَلٰی اُمَّةٍ** (یہ ہمارے باپ دادا کے زمانہ سے چلا آیا ہے) سلطان نے فوراً اس شراب خانہ کی بندش کا حکم جاری کیا۔

شیخ کے ایک شاگرد کہتے ہیں کہ دربار سے واپسی پر میں نے عرض کیا کہ حضرت! کیا واقعہ ہے؟ فرمایا کہ میں نے بادشاہ کو جب اس شان و شوکت کے ساتھ اجلاس کرتا ہوا دیکھا تو مجھے اندیشہ ہوا کہ ہمیں یہ نظر دیکھ کر اس پر تکبر کا حملہ ہو، اور وہ اپنے نفس کا شکار ہو جائے، میں نے اس کی اصلاح کے لئے یہ بات کہی، میں نے کہا کہ آپ کو کچھ خوف نہیں معلوم ہوا؟ فرمایا اللہ تعالیٰ کی ہیبت و جلال اس وقت ایسا مستحضر اور پیش نظر تھا کہ وہ مجھے اس کے مقابلہ میں ایک بلے کی طرح معلوم ہوتا تھا۔

فرنگیوں سے جہاد

وہ زمانہ فرنگیوں کی ریشہ دوانیوں سے خالی نہ تھا، ایک مرتبہ فرنگی فوجیں منصورہ تک پہنچ گئیں، اور مسلمانوں پر انھوں نے غلبہ حاصل کر لیا، شیخ مسلمانوں کے ساتھ شریک جہاد تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو استجابت دعا کی نعمت عطا فرمائی تھی، ابن السبکی طبقات میں لکھتے ہیں کہ ان کی دعا سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح دی، ہوا کا رخ بدل گیا، فرنگیوں کے جہاز ٹوٹ گئے، اور اکثر فرنگی غرق ہوئے۔

مصارف جہاد کے لئے شیخ کا انتظام

اس زمانہ میں تاتاری عالم اسلام پر جا بجا سے یورش کر رہے تھے، اسی اثنا میں انھوں نے مصر کا رخ کیا، تاتاریوں کی مسلمانوں پر جو ہیبت مٹھی ہوئی تھی، وہ ضرب المثل ہے، مصر میں سراسیمگی پھیل گئی، سلطان مصر اور اہل مصر کی ہمت مقابلہ کی نہیں ہوتی تھی، شیخ الاسلام نے ہمت دلائی، اور فرمایا کہ تم اللہ کا نام لے کر نکلو، میں فتح کی ضمانت کرتا ہوں، بادشاہ نے کہا کہ میرے خزانہ میں روپیہ کم ہے، میں تجار سے قرض لینا چاہتا ہوں، شیخ نے فرمایا کہ پہلے اپنے محل کے جواہرات نکالو، ارکان سلطنت،

اور امراء اور بار اپنی اپنی بیگمات کے وہ زیورات حاضر کریں جو حرام ہیں اور اس کے سکے ڈھلوائے جائیں، اور وہ لشکر میں تقسیم ہوں، اس کے بعد اگر ضرورت ہو تو قرض لیا جاسکتا ہے، لیکن اس سے پہلے قرض کی کوئی ضرورت نہیں، شیخ کا اتنا رعب تھا کہ بادشاہ اور امراء سلطنت نے بے چون و چرا جو اہرات و زیورات شیخ کے سامنے حاضر کر دیئے، اور ان سے جنگ کے مصارف پورے ہو گئے، اور مسلمانوں کو فتح ہوئی۔

امراء سلطنت کا نیلام

شیخ کی زندگی کا سب سے زیادہ حیرت انگیز اور اہم واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے ان امراء سلطنت کو نیلام کیا، جو ان کے نزدیک مسلمانوں کے بیت المال کی ملکیت تھے، اور شرعی طریقہ پر آزاد نہیں کئے گئے تھے، یہ امراء سلطنت نسلا ترک تھے، اور سلطنت مصر پر بڑے حاوی تھے، ان میں سے ایک نائب سلطنت تھا، شیخ نے فتویٰ دیا کہ جب تک یہ امراء شرعی طریقہ پر آزاد نہ ہوں، ان کے معاملات شرعاً صحیح نہیں ہیں، اور وہ عالم غلاموں کے حکم میں ہیں، ان کے فتویٰ کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں احتیاط شروع کر دی اور وہ بڑی دقت میں پڑ گئے، یہ دیکھ کر ان امراء کے حلقہ میں بڑی برہمی اور تشویش پیدا ہوئی، انھوں نے ایک دن جمع ہو کر شیخ کو طلب کیا، اور کہا کہ آپ کیا چاہتے ہیں، شیخ نے فرمایا کہ ہم ایک مجلس طلب کریں گے، اور بیت المال کی طرف سے آپ کا نیلام کریں گے، اور شرعی طریقہ پر آپ کو آزادی کا پروانہ دیا جائے گا، انھوں نے سلطان سے عرض کیا کہ شیخ ہم کو ذلیل کرنا چاہتے ہیں، اور سر بازار نیلام کرنے کو کہتے ہیں، بادشاہ نے شیخ کو راضی کرنا چاہا، مگر انھوں نے اپنی رائے سے رجوع نہیں کیا، اس گفت و شنید میں بادشاہ کی زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکل گیا، جو شیخ کے خلاف شان تھا، بادشاہ نے اس کا بھی اظہار کیا کہ شیخ کو اس معاملہ سے کیا تعلق، اور وہ امراء کے قضیہ میں کیوں پڑتے ہیں، شیخ یہ سن کر ناراض ہوئے اور انھوں نے مصر سے چلے جانے کا عزم کر لیا، اپنا سامان جانور پر بار کیا، اور گھر والوں کو سوار کیا، اور روانہ ہو گئے، ان کی روانگی

کی خبر سن کر قاہرہ میں کھلبلی مچ گئی، شہر کی مسلمان آبادی کا بڑا حصہ ان کے پیچھے ہویا، علماء، صلحاء، تجار، سب ان کے پیچھے پیچھے روانہ ہو گئے، سلطان کو اطلاع ہوئی، اور کسی نے اس سے کہا کہ شیخ عبدالدین چلے گئے تو تمہاری سلطنت جاتی رہے گی، سلطان خود سوار ہو کر ان کے پاس پہنچا، اور ان کو منا کر شہر واپس لایا اور طے ہوا کہ امراء سلطنت کا وہ خود نیلام کریں، سین کر نائب سلطنت نے بڑے خوشامدانہ لہجہ میں ان کو اس راہ سے باز رکھنا چاہا، لیکن وہ اپنی رائے پر قائم رہے، نائب کو غصہ آ گیا، اس نے کہا کہ یہ شیخ کیسے ہمارا نیلام کرے گا، ہم ملک کے حاکم ہیں؟ خدا کی قسم! میں اس تلوار سے اس کی گردن اڑا دوں گا، چنانچہ وہ اپنے عملہ کے ساتھ سوار ہو کر شیخ کے دروازہ پر پہنچا، ننگی تلوار اس کے ہاتھ میں تھی، دروازہ کھٹ کھٹایا، شیخ کے صاحبزادہ باہر نکلے تو یہ حال دیکھا کہ نائب سلطنت شمشیر برہنہ لئے دروازہ پر کھڑا ہے، انھوں نے اندر جا کر شیخ سے یہ حال کہا، شیخ نے بے پرواہی سے جواب دیا کہ بیٹا! تمہارے والد کا یہ رتبہ کہاں کہ اللہ کے راستے میں شہید ہو، یہ کہہ کر وہ باہر نکلے، ان کا نکلنا تھا کہ تلوار نائب سلطنت کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور اس کے جسم پر عرشہ طاری ہو گیا، اس نے رو کر شیخ سے دعا کی درخواست کی، اور کہا کہ میرے آقا! آپ کیا کرنا چاہتے ہیں، فرمایا، میں تمہارا نیلام کروں گا، اور تمہیں فروخت کروں گا، اس نے کہا کہ ہماری قیمت آپ کس حد میں صرف کریں گے؟ فرمایا، مسلمانوں کے کاموں میں اس نے عرض کیا کہ قیمت وصول کون کرے گا؟ فرمایا، میں خود اس نے کہا، بہت اچھا، چنانچہ شیخ نے ایک ایک کے سب امراء کو نیلام کیا، ہر ایک پر بولی بولی گئی، شیخ نے (ان کے اعزاز کے طور پر) ان کے دام بہت لگائے اور بہت بڑی بولی پر ان کو فروخت کیا، اور قیمت وصول کر کے خیر کے کاموں میں صرف کی، اور وہ آزاد ہو کر اپنے اپنے گھر گئے، ابن السبکی لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ کسی اور کے متعلق سننے میں نہیں آیا، ایک عالم کی عظمت اور اس کے رعب و داب کی یہ انتہائی مثال ہے۔

شیخ عبدالدین اور سلاطین مصر

مصر میں شیخ کی زندگی میں بڑے انقلابات آئے، وہ مصر آئے تھے تو ایوبی سلطنت کا زمانہ تھا، اور

صلاح الدین کا خاندان حکومت کر رہا تھا، ان کی زندگی ہی میں یہ خاندان ختم ہوا، الملک لصلاح نجم الدین ایوب کے جانشین الملک المعظم توران شاہ کے بعد ترکی النسل امرا کا دور حکومت آیا، وہ شیخ کے قدردان اور نیاز مند رہے اور ان کی تعظیم و تکریم اور بزرگی اشدت میں کوئی کمی نہیں آئی، خصوصیت کے ساتھ مصر کا نامور ترک سلطان الملک الظاہر بیبرس، شیخ کا بڑا ادب شناس اور ان کی شخصیت سے متاثر تھا، شیخ ہی کے مشورہ سے سقوط بغداد اور سلطنت عباسیہ کے اختتام پر سلطان نے بغداد کے آخری خلیفہ مستعصم کے چچا ابو القاسم احمد کو جن کا لقب المستنصر ہے، ۶۵۹ھ میں مصر میں اعزاز و اکرام کے ساتھ ٹھہرایا، پہلے شیخ عبداللہ نے بیعت کی، پھر الملک الظاہر بیبرس نے، پھر قاضی القضاة تاج الدین وغیرہ نے۔

مکارم اخلاق

شیخ اپنے علم و فضل و وقار و ہیبت کے ساتھ بڑے کریم النفس، فیاض اور بخیر تھے، قاضی القضاة بدر الدین بن جماعہ ناقل ہیں کہ دمشق کے زمانہ قیام میں ایک سال بڑی گرانی کا آیا، باغات کے دام بہت گر گئے، اور بہت سستے بننے لگے، شیخ کی اہلیہ محترمہ نے ان کو ایک زیور دیا کہ گرمی گزارنے کے لئے ایک بلوغ خرید لیں انھوں نے وہ زیور فروخت کر کے ساری قیمت خیرات کر دی، اہلیہ نے پوچھا کہ آپ نے باغ خرید لیا؟ فرمایا کہ ہاں! مگر جنت میں، میں نے دیکھا کہ لوگ بڑی عسرت اور تکلیف میں ہیں، میں نے اس کی قیمت ان پریشان حال لوگوں پر صرف کر دی، انھوں نے فرمایا، جَزَاكَ اللهُ!

قاضی القضاة موصوف یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ شیخ تنگ حالی کے باوجود بڑے فراخ دست اور بخیر تھے، یہاں تک کہ بعض اوقات ان کے پاس کچھ دینے کو نہ ہوتا تو اپنا عامہ چیر کر اس کا ایک ٹکڑا دے دیتے، شیخ عبداللہ صرف سلاطین ہی کے مقابلہ میں جری اور جی گونہ تھے، بلکہ اپنے نفس کے معاملہ میں بھی

اسی طرح بیباک اور حق شناس تھے، ابن السبکی اور سیوطی راوی ہیں کہ ایک مرتبہ مصر کے زمانہ قیام میں ان سے ایک فتویٰ میں غلطی ہو گئی تو انھوں نے اعلان کر دیا کہ جس کو ابن عبدالسلام نے فلاں فتویٰ دیا ہو، وہ اس پر عمل نہ کرے اس لئے کہ وہ غلط ہے۔

ابن السبکی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ علوم ظاہری کے کمالات کے ساتھ دولت باطنی سے بھی مالا مال تھے، اگرچہ ان کے ایمان و یقین، اعتماد علی اللہ، بے خوفی و شجاعت، ارباب دنیا کی بے وقعتی کے واقعات خود اس پر دلیل ہیں، لیکن ابن السبکی نے طبقات میں تصریح کی ہے کہ انھوں نے امام طریقت شیخ شہاب الدین سہروردی سے استفادہ کیا تھا، اور ان کی طرف سے ارشاد و تربیت کے لئے مجاز تھے، سیوطی نے شیخ ابوالحسن شاذلی سے بھی ملاقات و استفادہ کا ذکر کیا ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارہ میں شیخ کا مسلک

شیخ علمی و نظری طور پر بھی اس کے قائل تھے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بدعات اور گمراہیوں کی علامتہ مخالفت و انکار علماء کا فریضہ ہے اور اس سلسلہ میں ان کو خطرات اشد اندک بھی برداشت کرنے چاہئیں، اور ہر طرح کے مصائب کے لئے تیار رہنا چاہئے۔

الملک الاشراف کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:-

وبعد ذلك فانا نزعنا من جملة
 حزب الله وانصار دينه وجنده
 وكل جندي لا يخطا بنفسه فليس
 بجندي
 ہمارا دعویٰ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی جماعت میں
 ہیں اور اس کے دین کے مددگار اور اس کا لشکر
 ہیں، وہ لشکر ہی جو اپنے کو خطرہ میں ڈالنے کے لئے
 تیار نہ ہو، وہ لشکر ہی نہیں ہے۔

ان کا خیال تھا کہ علم و زبان علماء کا ہتھیار ہیں، اس لئے ان کا جہاد یہ ہے کہ وہ ان دونوں کو حق کی تائید اور باطل کی مخالفت میں کام میں لائیں، ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:-

قد امرنا الله بالمجاهدة في نصرته دينه، الا
ان سلاح العالم علمه ولسانه كما ان
سلاح الملك سيفه وسانه، فكلما اعجز
للعولك اغماداً ملحتهم عن المحدثين
والمشركين لا اعجز للعلماء اغماد
الستهم عن الزائغين والمبتدعين له
الله تعالى نے ہم کو اپنے دین کی مدد کے لئے جہاد و
جدوجہد کا حکم دیا ہے اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ عالم
کا ہتھیار اس کا علم اور اس کی زبان ہے، جیسا کہ بادشاہ
کا ہتھیار اس کی تلوار اور تیر و سان ہے تو جس طرح بادشاہوں
کے لئے اپنے ہتھیاروں کو نیام میں رکھنا جائز نہیں،
اسی طرح علماء کے لئے اہل زین و ضلال اور مبتدعین
سے اپنی زبان کو بند کرنا جائز نہیں۔

ان کے نزدیک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں عالم ربانی کو ہر طرح کے خطرات برداشت کرنا چاہئیں، گویا ان کو ان علماء سے اتفاق نہیں ہے، جو ہر طرح کے خطرہ میں پڑنے کو مطلقاً ناجائز سمجھتے ہیں اور آیت "وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ" سے غلط اور بے محل استدلال کرتے ہیں، اسی خط میں بڑے موثر انداز میں فرماتے ہیں:-

والمخاطرة بالنفوس مشروعة في اعزاز
الدين، ولذلك يجوز للبطل من المسلمين
ان ينغمر في صفوف المشركين وكذلك
المخاطرة بالامر بالمعروف والنهي عن المنكر
ونصرة قواعد الدين بالحق والبراهين
دين کے اعزاز و غلبہ کے لئے جانوں کو خطرہ میں ڈالنا
دین میں مشروع ہے، اسی لئے مسلمان خنزور کے لئے جائز
ہے کہ مشرکین کی صفوں میں گھس جائے، اسی طرح سے امر بالمعروف
اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں اپنے کو خطرہ میں ڈالنا اور
اصول دین کی دلائل و براہین کے ذریعہ تقویت مشروع ہے

مشروعة فمن خشي على نفسه سقط عنه
العوجوب ونهى الاستحباب ومن قال بان
التعزير بالنفوس لا يجوز فقد بعد عن الحق
ونأى عن الصواب وعلى الجملة فمن أثر
الله على نفسه أثره الله ومن طلب رضا
الله بما يسخط الناس رضى الله عنه وارضى
عنه الناس ومن طلب رضا الناس بما
يسخط الله سخط الله عليه وأسخط عليه
الناس وفي رضا الله كفاية عن رضا
كل احد. (طبقات ج ۵ ص ۹)

عرب شاعر نے خوب کہا ہے:-

فليتك تحلو والحياة مريرة
وليتك ترضى ولا نام غضاب
(کاش کہ آپ کی محبت کی حلوات مجھے حاصل ہو جاتی، پھر چاہے زندگی کتنی ہی تلخ ہو تو، اور کاش کہ آپ مجھے راضی ہو جاتے، چاہے ساری دنیا ناراض ہو تو۔)

ان کی زندگی بتلاتی ہے کہ انھوں نے ساری عمر اپنے اس عقیدہ اور مسلک پر عمل کیا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں اور اپنے نزدیک کسی غلط اور خلاف شرع چیز کی تردید میں اپنی جان مال آبرو وطن و عہدہ کی کبھی پرواہ نہیں کی۔

شیخ کی تصنیفات

شیخ جس طرح کامیاب مدرس، وسیع النظر فقیہ اور تبحر مفسر تھے، اسی طرح کہنہ مشوق مصنف بھی تھے،

ان کی تصنیفات میں "القواعد الکبریٰ" اور کتاب "مجاز القرآن" خاص وقعت رکھتی ہے، ابن ابی لکھتے ہیں:

وهذان الكتابان شاهدان بامامتہ

یہ دونوں کتابیں ان کی امامت اور علوم شریعت

وعظیم منزلتہ فی علوم الشریعۃ۔

میں ان کے علوم منزلت پر شاہد ہیں۔

ان دونوں کتابوں کا انھوں نے دو الگ کتابوں میں اختصار کیا ہے، ابن ابی نے ان کی دو اور کتابوں "شجرۃ المعارف" اور "الدلائل المتعلقة بالملائکة والانس علیہم السلام" کی بھی خصوصی تعریف کی ہے، ان کی ایک کتاب "مقاصد الصلوة" خود ان کے زمانہ میں بڑی مقبول ہوئی، اور لوگوں نے اس کی ہزاروں نقلیں کیں، چھوٹی بڑی تصنیفات کے علاوہ ان کے فتاویٰ کا ضخیم مجموعہ ہے، جو فقہ شافعی کا قیمتی ذخیرہ ہے۔

امام غزالی کے بعد شیخ عبدالدین غالباً دوسرے عالم اور مصنف ہیں جنھوں نے خصوصیت کے ساتھ احکام شریعت کے مقاصد و لطائف پر گفتگو کی، اور شریعت کے اسرار و نکات بیان کئے، اس موضوع کے سب سے بڑے مصنف شیخ الاسلام شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی تھے، حجة الشریعہ کے مقدمہ میں اس موضوع کے پیش رو مصنفین میں تین بزرگوں حجیۃ الاسلام غزالی، ابوسلیمان خطابی اور شیخ الاسلام عبدالدین کا نام لیا ہے۔

شیخ کی وفات

۹ جمادی الاولیٰ ۶۶۷ھ میں ۸۳ سال کی عمر میں شیخ کی وفات ہوئی، یہ الملک نظام شہسپہن کا عہد حکومت تھا، اس کو شیخ کی وفات کا بڑا صدمہ ہوا، کہتا تھا کہ خدا کی شان ہے، شیخ کی وفات میرے عہد حکومت ہی میں مقدر تھی، جنازہ میں امر اور دربار ارکان سلطنت اور افواج شاہی شریک تھیں، سلطان نے خود کا زہاد دیا، اور دفن میں شریک ہوا۔ شیخ کا جنازہ جب قلعہ کے نیچے سے گزرا اور سلطان نے خلقت کا ازدحام دیکھا تو اپنے خواص میں سے کسی سے کہا کہ آج میں سمجھتا ہوں کہ میری سلطنت مضبوط ہوئی ہے، اس لئے کہ یہ شخص جو مرجع خلافت ہے، اگر اشارہ کرتا تو میری سلطنت چلی جاتی، اس کے انتقال کے بعد مجھے اپنی سلطنت کی طرف سے اطمینان ہوا ہے۔

لہ طبعات الشافعیۃ الکبریٰ ۱۵۱ ۱۵۲ ایضاً ۱۵۳ ۱۵۴ حجة الشریعہ عبدالدین غزالی ۱۵۵ طبع صدیقی ۱۵۶ طبعات الشافعیۃ الکبریٰ ۱۵۷ ۱۵۸

فتنہ تاتار اور اسلام کی ایک نئی آزمائش

تاتاری حملے اور اس کے اسباب

ساتویں صدی میں عالم اسلام کو وہ حادثہ پیش آیا جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی، اور جو قریب تھا کہ اس کی ہستی کو فنا کر دے، یہ تاتاری غارتگروں کا حملہ تھا، جو مور و ملح کی طرح مشرق سے بڑھے، اور سارے عالم اسلام پر چھا گئے۔

اس منحوس واقعہ کا سبب سلطان وقت علاء الدین محمد خوارزم شاہ کی بظاہر ایک غلطی اور بے تدبیری تھی کہ اس نے پہلے ان تاتاری تاجروں کو قتل کر دیا، جو اس کے ملک میں تجارت کے لئے آئے تھے، پھر جب جنگیز خاں نے اس کا سبب دریافت کرنے کے لئے ایک سفارت بھیجی تو خوارزم شاہ نے سفیر کو بھی قتل کر دیا، اس پر تاتاری خاقان جنگیز خاں نے برا فروختہ ہو کر خوارزم شاہی سلطنت اور پھر پورے عالم اسلام پر حملہ کر دیا۔

لیکن قرآن مجید میں اعمال و اخلاق کے نتائج اور اقوام و ملل کے عروج و زوال کا جو ابدی اور عالمگیر قانون بتایا گیا ہے، اور خاص طور پر سورہ اسرا کی ابتدا میں بنی اسرائیل کی تباہی، قتل عام و نکبت و ذلت اور بیت المقدس کی تخریب بے حرمیتی کی جو داستان عبرت سانی گئی ہے، اس کی روشنی میں اس فتنہ عالم آشوب

لہ اس موقع پر سورہ اسرا کی آیات وَ قَضَيْنَا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ فِي الْكَلْبِ لَقِئْتُمْ فِي الْأَرْضِ عَمْرَيْنِ وَ لَمَّا عَلُوا كَيْدًا

سے لے کر وَ لَمَّا عَلُوا كَيْدًا تک آیات پر غور کیا جائے۔

اور اس وقت کی دنیا کے اسلام کی اس قیامتِ صغریٰ کا حقیقی سبب صرف اتنا نہیں معلوم ہوتا کہ ایک بادشاہ نے کوتاہ نظری و بے تدبیری سے کام لیا، اور اچانک یہ سیلابِ عالم اسلام پر امنڈ پڑا، اور ایک فرد کی غلطی سے ساری ملت اسلامیہ کو یہ روزِ بد دیکھنا پڑا، جس کے لئے نہ وہ تیار تھی، نہ اس کی مستحق، قرآن مجید کا چراغ اگر ہاتھ میں لے کر اس وقت کے مسلمانوں کی اخلاقی، دینی، تمدنی اور سیاسی حالات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو حقیقت روز روشن کی طرح سامنے آجاتی ہے کہ یہ محسوس واقعہ اچانک پیش نہیں آیا، اور اس کے اسباب اس سے کہیں زیادہ وسیع، گہرے اور ٹھوس ہیں، جتنے سمجھے اور بیان کئے گئے ہیں، اس کے لئے ہم کو کئی سال سچھے ہٹ کر اپنا کام شروع کرنا پڑے گا، اور اس وقت کی اسلامی سلطنتوں، اہم ترین تمدنی مراکز اور اسلامی معاشرہ پر ایک جمالی نگاہ ڈالنی ہوگی۔

سلطان صلاح الدین ایوبی کی وفات (۵۸۹ھ) پر اس کی وسیع وزیر خیز سلطنت اس کی اولاد و خاندان کے افراد میں تقسیم ہو گئی، دنیا کے بہت سے بانیان سلطنت اور الوالعزم فرمانرواؤں کی طرح اس کی اولاد اس کی صلاحیتوں کی وارث اور اس کی صحیح جانشین ثابت نہ ہو سکی، عرصہ تک وہ ایک دوسرے سے دست و گریبان اور برسرِ پیکار رہے، بعض اوقات ان میں سے بعض افراد نے اپنے ہی بھائیوں اور افراد خاندان کے خلاف صلیبی فرمانرواؤں اور فرنگی حریفوں سے بھی مدد لینے اور ان سے ساز باز کرنے سے بھی احتراز نہیں کیا، جس کا ایک نمونہ شیخ الاسلام عزالدین بن عبدالسلام کے تذکرہ میں گذر چکا ہے، اس طوائف الملوکی خاندانی رقابتوں اور خانہ جنگیوں سے سلطنت کے زیرِ فرماں ممالک میں سیاسی انتشار، انتظامی ابتری اور اخلاقی زوال رونما تھا، لوگ ایک بے یقینی کی فضا میں زندگی گزار رہے تھے، صلیبیوں اور فرنگیوں کی بار بار ان اسلامی شہروں پر تاخت ہوتی رہتی تھی جن کو سلطان صلاح الدین نے بڑی جدوجہد اور قربانیوں کے بعد واپس لیا تھا، انتظامی و اخلاقی دونوں طرح کی کوتاہیوں اور بے راہ روی کا نتیجہ وباؤں، امراض اور شدید قحط کی شکل

لے ہندوستان میں عالمگیر اعظم اور اس کے جانشینوں کی مثال ہمارے لئے کافی ہے۔

میں رونما ہوا، اور مصر جیسے زرخیز ملک میں جو دوسرے ملکوں کا بھی سپٹ بھر سکتا تھا، ۵۹۶ھ میں جبکہ چھپتے ہوئے ملک عادل اور الملک لافضل کی خانہ جنگی نے مصر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا، دریائے نیل میں طغیانی نہیں آئی اور مصر میں ایسی گرانی رونما ہوئی، اور ایسا شدید قحط پڑا کہ آدمی نے آدمی کو بھون کر کھایا، موت کی ایسی گرم بازو تھی کہ مردوں کو کفن دینا ممکن نہ تھا، مورخ ابوشامہ کے بیان کے مطابق تنہا الملک عادل (سلطان مصر) نے صرف ایک مہینہ میں دو لاکھ بیس ہزار مردوں کو اپنے ذاتی مال سے کفن دیا، کتوں اور مردوں کے کھانے کی نوبت آگئی، بہت بڑی تعداد میں بچے بھون بھون کر کھائے گئے، اور اس کی ایسی عمومیت ہوئی کہ اس میں لوگوں کو کوئی قناعت نہیں محسوس ہوتی تھی، مورخ ابن کثیر کے بیان کے مطابق جب کھانے کے لئے بچے اور چھوٹی عمر کے لڑکے نہیں رہے تو جس آدمی کا جس آدمی پر زور چلا، اس نے اس کو بھون کر کھالیا، سنت اللہ کے مطابق آسمانی تنبیہات کا سلسلہ بھی جاری تھا، اور ایسے غیر معمولی واقعات پیش آ رہے تھے، جو توبہ، انابت اور اصلاح حال کا خیال و جذبہ پیدا کرنے کے لئے کافی تھے، چنانچہ اسی ۵۹۶ھ میں ایک عظیم زلزلہ آیا جس کی زد میں خاص طور پر ملک شام، بلادِ روم اور عراق تھے، اس کی ہلاکت آفرینی اور دہشت انگیزی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے، کہ تنہا شہر نابلس اور اس کے اطراف میں بیس ہزار انسان زلزلہ میں دب کر مر گئے، "مرآة الزمان" کے مصنف کا بیان ہے (جو شدید مبالغہ سے خالی نہیں ہے) کہ اس زلزلہ کا شکار گیارہ لاکھ انسان ہوئے۔ ادھر یہ غیر معمولی حوادث پیش آ رہے تھے، جو مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لئے بالکل کافی تھے، ادھر عالم اسلام کے مختلف حصوں میں خانہ جنگی اور برادر کشی کا سلسلہ جاری تھا، ۶۰۱ھ میں ایک ہی خاندان کے دو افراد قتادہ حسینی امیر مکہ اور سالم حسینی امیر مدینہ میں سخت جنگ ہوئی، ۶۰۲ھ میں غوریوں اور خوارزم شاہیوں کی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا، اور مسلمانوں نے مسلمان کا خون بہایا، ادھر یہ ہور ہا تھا، ادھر (۶۰۲ھ) میں فرنگیوں نے شام کے مختلف علاقوں پر حملے شروع کئے،

لے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "البدایۃ والنہایۃ" ج ۱۳ ص ۲۶۱ حوادث ۵۹۶ھ۔

۶۱۶ھ میں جزیرہ کے مسلمان حکام نے فرنگیوں سے سازش کی، اور ۶۱۶ھ میں فرنگیوں نے مصر کے شہر
دمیاط پر قبضہ کر لیا، جو فوجی و دفاعی حیثیت سے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔

ادھر مکرہ خلافت دارالسلام بغداد میں سلطنت کی ظاہری شان و شوکت عجمی تکلفات اور دولت و
تمدن کے کھوکھلے مظاہر اپنے لفظ 'عروج کو پہنچ گئے تھے، خلفاء کے منظور نظر مصاحبین اور معتدین کی دولت
(جو غلام کی حیثیت سے حرم خلافت میں داخل ہوتے تھے، اور فرانس، ساقی، ہنتم، توشک خانہ وغیرہ کے منصبوں پر فائز
تھے) کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، اس کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خلیفہ الظاہر کے زر خرید علاء الدین الطبری الظاہری
کی سالانہ آمدنی جو اس کو اپنی نئی جائداد سے حاصل ہوئی تھی، تین لاکھ دینار تھی، بغداد میں اس کے محل کی کوئی
نظیر نہ تھی، یہی حال مجاہد الدین ایبک الدویدار المستنصری کی دولت کا تھا، ان لوگوں نے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں
کی شادی میں جو ہیز دیا، اور جو تحائف تقسیم کئے، ان کو پڑھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے، آخر الذکر کی جاگیر کی آمدنی پانچ
لاکھ دینار سالانہ تھی، یہی حال الصلاح عبدالغنی بن فاخر فرانس کا تھا، جو زیور علم سے عاری، لیکن شاہانہ معیار کی
زندگی گزارتا تھا، اس کے مقابلہ میں سلطنت عباسیہ کے سب سے بڑے مدرسہ المستنصریہ کے لائق اساتذہ کی
تنخواہیں اتنی حقیر تھیں کہ اس کا یقین کرنا مشکل ہے، ان میں سے بڑے بڑے اساتذہ کو ۱۲ دینار ماہوار سے
زیادہ نہیں ملتے تھے، جب کہ اس کے مقابلہ میں عہد عباسی کے ایک امیر الشراہی کے ایک خادم نے چار ہزار دینار ایک
امیر کی شادی میں لٹائے، اور تین ہزار دینار شراہی کی طرف سے ایک پرندہ کی قیمت میں جو اس کے لئے تحفہ میں
موصول سے لایا گیا تھا، ادا کئے گئے۔

شان و شوکت کے اظہار کے لئے عید اور جانشینی کے موقع پر جو شاہانہ جلوس بغداد میں نکلتے تھے، سارا شہر

لے جزیرہ سے مراد وہ علاقہ ہے جو جبل اور فرات کے درمیان واقع ہے، اس کو بلاد ما بین النہرین بھی کہتے ہیں، اس کا مغربی شمالی حصہ 'جزیرہ'
کے نام سے مشہور ہے، اور جنوبی شرقی حصہ عراق کے نام سے مشہور ہے۔ ۵۹۰ البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۵۹

۵۹۰ یہ سب معلومات اس عہد کی معاصر تاریخوں 'الحوادث الجامعہ' اور 'العسیر المسبوک' سے ماخوذ ہیں۔

ان میں شرکت کرنے، ان کا تماشہ دیکھنے میں مجاور خود فراموش ہو جاتا تھا، نمود و نمائش کے ماسوا جس طرح بے تکلف
دینی فرائض ان میں نظر انداز ہوتے تھے، اور نمازیں قضا ہوتی تھیں، اس کا اندازہ کرنے کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ
۶۱۶ھ کے عید کے موقع پر جو شاہی جلوس نکلا، وہ رات کو جا کر ختم ہوا، اس کی ایسی مشغولیت اور محویت رہی کہ
لوگوں نے اس دن عید کی نماز نصف شب سے پہلے قضا کر کے پڑھی، اسی طرح ۶۱۶ھ کی عید الاضحیٰ کو اہل بغداد
شہر کے باہر خلیفہ کا شاہی جلوس دیکھنے نکلے، اور نماز عید انھوں نے غروب آفتاب کے وقت پڑھی۔

خلیفہ کے لئے زمین بوسی کا عام رواج تھا، اسی طرح سے آستانہ بوسی اور زمین پر ناک رکھنے کا بھی
دستور تھا، اور اس میں کسی کو کوئی قیامت نہیں محسوس ہوتی تھی، جائدادوں کی غنطی کے واقعات بکثرت پیش آتے تھے،
رشوت کی گرم بازاری تھی، باطنیوں، عیاروں اور ٹھگوں کی سرگرمی تیز ہو گئی تھی، اخلاقی بے راہ روی بہت بڑھی،
تھی، دل بہلانے والے مشاغل کا زور تھا، مغنیات کی کثرت تھی، اور دولت جمع کرنے کا شوق حد سے فزوں تھا۔
یہ وہ زمانہ تھا کہ تاتاری، ایران و ترکستان کو تہ و بالا کر رہے تھے، اور اسلام کے سب سے بڑے قلعہ بغداد

پران کی نگاہیں تھیں، مورخ ابن کثیر ۶۲۶ھ کے آغاز کی ان الفاظ کے ساتھ خبر دیتا ہے کہ 'اس سن ہجری کی ابتدا
اس شان سے ہوئی کہ سلاطین بنی ایوب (سلطان صلاح الدین کے خاندان کے بادشاہ) ایکے دوسرے سے
نبرد آزما اور برس برس پیکار میں، دارالخلافت بغداد میں کچھ ایسا انتشار برپا رہا کہ ۶۲۰ھ سے ۶۲۳ھ تک خلفاء اسلام
کے قدیم و سلسل معمول کے خلاف خلیفہ کی طرف سے نہ حج کا انتظام ہوا، اور نہ غلاف کعبہ بدلا گیا، ۲۱ دن تک
بیت الشرف کی دیواریں بالکل کھلی رہیں، لوگوں نے اس سے بدشگونی لی۔

۵۴۵ھ میں الناصر لدین الشرف تحت خلافت پر بیٹھا، اس کو چھیا بیس سال سے زیادہ سلسل خلافت
حکومت کا موقع ملا، یہ اتنی طویل مدت ہے، جو کسی عباسی خلیفہ کو بھی نصیب نہیں ہوئی، لیکن اس کا دور خلافت
عباسیہ کا تاریک ترین دور تھا، مورخین نے بڑے سخت الفاظ میں اس پر تنقید اور اس کے اعمال و اخلاق کی

۵۴۵ھ الحوادث الجامعہ، واقعات ۶۲۶ھ ملاحظہ فرمائیں، عصر الشراہی بغداد، از ناہی حروف رسالہ الاقلام، بغداد محرم ۱۳۸۶ھ

خدمت کی ہے، مورخ ابن اثیر نے ان لفظوں میں اس کو یاد کیا ہے۔

” رعیت کے ساتھ اس کا سلوک نہایت خراب اور ظالمانہ تھا، اس کے زمانہ میں عراق کا ملک ایران ہو گیا ملک کے باشندے مختلف شہروں اور ملکوں میں متفرق و آوارہ ہو گئے، اس نے ان کی جائیدادیں اور دولتیں ضبط کر لیں، اس کے کاموں میں بڑا انصاف تھا، آج ایک بات کرتا تھا، کل اس کے خلاف اس کو تمام تہذیبی تفریحی مشاغل سے تھی اس نے جو انفرادی و سپہ گری کے لئے ایک خاص وردی ایجاد کی، صرف اس وردی والوں کے لئے مردانہ کھیلوں اور فنون سپہ گری کے مظاہرہ کی اجازت تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مردانہ کمالات اور فنون سپہ گری کا عراق سے خاتمہ ہو گیا، خلیفہ کی شیفنگی ان تفریحات سے حد کو پہنچ گئی، اہل ایران کا بیان ہے کہ اسی نے سب پہلے تاتاریوں کو اسلامی قلم و پرچم کرنے کی طرف متوجہ کیا، اور ان کے پاس پیام بھیجا“

۶۲۲ھ میں الاناصر لدین اللہ کی وفات ہوئی، اور مستنصر باللہ (۶۲۳-۶۲۷) اس کا جانشین ہوا، یہ خلیفہ دیندار، پاکباز، نیک سیرت، پاکیزہ خصائل اور بہت سے اوصاف و خصوصیات میں خلفاء صالحین کی یادگار تھا، لیکن افسوس ہے کہ اس کو انتظام و اصلاح کے لئے زیادہ مدت نہ مل سکی، ۶۲۷ھ میں اس کی وفات پر اس کا فرزند مستعصم باللہ خلیفہ ہوا، مستعصم ایک صحیح العقیدہ، دیندار، محتاط خلیفہ تھا، جو کبھی مسکرات و محرمات کے قریب نہیں گیا، ہر مہینہ دو شنبہ اور جمعرات اور ماہِ رجب کے روزے رکھتا تھا، قرآن کا حافظ تھا، وقت پر نماز پڑھنے کا شدت سے پابند تھا، لیکن مورخ ابن اثیر کے قول کے مطابق طبیعت میں ضرورت سے زیادہ نرمی اور بیدار مغزی کی کمی تھی، دولت کے معاملہ میں کسی قدر حرص اور بخیل واقع ہوا تھا۔

۶۴۲ھ میں ابن العلقمی کے نام خلافت عباسیہ کی وزارت عظمیٰ کا قرعہ فال نکلا، خلافت کے نظم و نسق میں اس وقت سے بڑی برہمی پیدا ہوئی، جب ۶۵۵ھ میں بغداد میں شیعہ سنی کا زبردست جھگڑا ہوا،

۱۔ خوارزمی سلطنت کا زور توڑنے کے لئے جس سے خلیفہ بغداد کے تعلقات خراب تھے، ۵ تاریخ الکامل ج ۱۲ ص ۱۸۱۔

۲۔ ملاحظہ ہو البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۱۵۹۔ پورا نام مؤید الدین ابوطالب محمد بن احمد بن علی محمد العلقمی ہے۔

شیعوں کے مکانات یہاں تک کہ ابن العلقمی کے عزیزوں کے مکانات تک لوٹ لئے گئے، ان واقعات کے دل میں بڑی کا پیدا ہونا اور جذبہ انتقام کا ابھرنا بعید از قیاس نہیں، اس وقت اگرچہ تاریخی خطرہ بغداد کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا، اور تاریخی فوجیں بغداد کی طرف بڑھ رہی تھیں، وزیر ابن العلقمی کی ہدایت اور حکم سے بغداد کی افواج میں زبردست تخفیف کی گئی، سواروں کی تعداد گھٹا کر دس ہزار کر دی گئی، بقیہ سپاہیوں کو رخصت کر دیا گیا، اور ان کے منصب روک لئے گئے یہاں تک کہ ان کو بازاروں اور مسجدوں کے دروازوں پر بھیک مانگتے ہوئے دیکھا گیا، شعرا نے اسلام کی کسمپرسی پر مرثیے کہے۔

مستعصم اگرچہ ذاتی طور پر نیک سیرت اور نیک خیال خلیفہ تھا، اور اصلاح و ترقی کا خواہشمند بھی تھا، لیکن زمانہ کا فساد، معاشرہ کا انتشار اور اہل حکومت کا بگاڑ اس حد کو پہنچ گیا تھا کہ اس کو روکنے اور حکومت و معاشرہ میں اصلاح کی نئی روح پھونکنے اور اس کو نئی زندگی عطا کرنے کے لئے ایسے اولوالعزم اور طاقتور شخصیت رکھنے والے افراد کی ضرورت تھی، جو عام طور پر تاریخ میں نئی سلطنتوں کے بانی اور نئے عہد کے فاتح ثابت ہوئے ہیں، یہ واقعہ تاریخ میں بار بار پیش آیا ہے کہ اکثر حکمران خاندانوں کے آخری افراد اول کسی زوال پذیر سلطنت کا آخری فرمانروا اپنی ذات سے صلاحیت شعرا، اصلاح پسند اور نیک سیرت تھا، لیکن اس خاندان یا اس سلسلہ سلطنت کی زندگی کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اور فساد بڑھتے بڑھتے اس آخری نقطہ پر پہنچ چکا تھا کہ اب اس کو آخری منزل پر پہنچنے اور اس کے قدرتی نتائج کے ظاہر ہونے سے بظاہر کوئی طاقت نہیں روک سکتی تھی، چنانچہ اس خاندان اور حکومت کا زوال تاریخ میں اسی شخص کے نام لکھا گیا، جو اپنے بہت سے پیشروں سے بہتر تھا، اور بہت حد تک اصلاح حال کا خواہشمند تھا۔

اگرچہ بغداد میں اہل اصلاح کی ایک تعداد علم و درس اور عبادت میں مشغول تھی، اور کچھ اشرکے بندے خانقاہوں اور مساجد میں خلوت نشین اور کیسو تھے، لیکن حکام اور آسودہ حال طبقے میں بگاڑ پھیل گیا تھا،

۱۔ البدایہ والنہایہ ج ۱۳ ص ۱۹۶۔ ۲۔ ایضاً ص ۲۰۱۔

اس عہد کا ایک مورخ ابوالحسن خزر جی اپنے زمانہ کے اہل عراق کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

”جاگیروں اور جاہلادوں کے حصول کا شوق بہت بڑھ گیا ہے، رفاہ عام کے کام اور اجتماعی مصالح

سے لوگوں کی نظر ہٹ گئی ہے، ان دنیاوی امور میں شغولیت بہت بڑھ گئی ہے، جو جائز نہیں ہے، اعمال سلطنت

نظم پر کم باندھ رکھی ہے، اور سب کو زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی فکر ہے“

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ :-

”یہ صورت حال بڑی خطرناک ہے، سلطنت کفر کے ساتھ تورہ جاتی ہے، ظلم کے ساتھ نہیں رہتی“

اُدھر عالم اسلام کے مشرقی حصہ میں خوارزم شاہی بلا شریک غیرے حکومت کر رہے تھے، یہ بڑے

جاہ و جلال کی سلطنت تھی، جو پانچویں صدی کے آخر میں سلطنت سلجوقیہ کے کھنڈروں پر قائم ہوئی، مصر و شام

عراق و حجاز اور شمال مغرب میں ایشیا کوچک کے مختصر سلجوقی علاقہ اور جنوب مشرق میں غوریوں کی نوخیز سلطنت

کو مستثنیٰ کر کے تقریباً سارا عالم اسلام خوارزم شاہیوں کے زیر نگین تھا، اس خاندان کا سب سے بڑا حوصلہ مند

عالی ہمت اور کشور کشا سلطان علاء الدین محمد خوارزم شاہ (۵۹۶ - ۶۱۷ھ) تھا، جو اپنے عہد کا سب سے

بڑا نہ صرف مسلمان بادشاہ بلکہ شاید اپنے عہد کا سب سے طاقتور سلطان تھا، ہیرلڈ لیمب (H. LAMB) اپنی

کتاب ”چنگیز خاں“ میں صحیح لکھتا ہے :-

”اسلامی ملکوں کے قلب میں سلطان محمد خوارزم شاہ اورنگ شاہی پر خدا نے جنگ بنا بیٹھا تھا، اس کی قلمرو

ہندوستان کی سرحد سے بغداد تک اور بحر خوارزم (آرال) سے خلیج عجم تک چلی گئی تھی، سلجوقی ترکوں کے سوا

جنھوں نے صلیبیوں پر فتوحات حاصل کی تھیں، اور مصر کے سلاطین ملوک سے قطع نظر کر کے جو روز افزوں

ترقی پر تھے، باقی جس قدر اسلامی سلطنتیں تھیں، ان پر سلطان محمد خوارزم شاہ بالکل چھایا ہوا تھا، سلطان محمد

رتبہ میں شہنشاہ تھا، عباسی خلیفہ ناصر الدین الشراس سے ناراض تھے، مگر اس کی قوت کو مانتے تھے، خلیفہ

لے ملاحظہ ہو مضمون ”عصر الشراہی بغداد“ از ناجی معروف رسالہ ”الاقلام“ بغداد شماره محرم ۱۳۸۶ھ

بغداد دنیاوی اقتدار سے محروم ہو کر پاپائے روم کی طرح صرف دین کا ہادی و رہنما رہ گیا تھا۔

عرب مورخین علاء الدین محمد خوارزم شاہ کی سیرت و اخلاق کی کسی بڑی کمزوری اور کسی قابل ذکر شخصی

عیب کی طرف اشارہ نہیں کرتے، بلکہ اس کی دینداری، خوش اعتقادی اور شجاعت و صلابت کا عام طور پر

اعتراف کرتے ہیں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی ساری صلاحیتیں اور طاقتیں ان چھوٹی بڑی اسلامی

سلطنتوں کے ختم کرنے میں صرف ہوئیں، جو اس وسیع مشرقی حصہ میں کہیں واقع تھیں، ایک طرف شمال و مغرب

میں اس نے سلجوقیوں کو ان کے آخری حدود تک پسپا ہونے پر مجبور کیا، دوسری طرف مشرق اور جنوب میں وہ

ہمیشہ غوریوں سے نبرد آزما رہا، اور ان کو بھی ایک محدود حصہ میں محصور ہونے پر مجبور کر دیا، ایران و ترکستان کی

سپہ گری کا بہترین عنصر اس غیر مختتم سلسلہ جنگ میں حصہ لینے کی وجہ سے ٹھک کر چور ہو گیا تھا، ان زرخیز و مردم خیز

مالک کے شہروں و قصبات کی فضا اور ذہن پر جنگ ہر وقت چھائی ہوئی رہتی تھی، ہفتویہ مالک کی دولت شاداب و

حاصل خیز ملکوں کی پیداوار، دستکاروں اور اہل صنعت کی ترانس و خراش کی وجہ سے جو سلطنت و طاقت

کے اس مرکز میں جمع ہو گئے تھے، تمدن اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گیا تھا، اور فراغت و مارت اور فتوحات کے

سائے لوازم جمع ہو گئے تھے، اس وقت کی تمدنی خرابیوں و کمزوریوں کا ذکر تو ان تاریخوں میں ملنا مشکل ہے،

جن کو صرف سرکار دربار سے سروکار تھا، اگر اس کا سراغ کچھ مل سکتا ہے، تو اہل دل صوفیاء و مشائخ اور مصلحین

کی بیاضوں، ملفوظات اور مواعظ میں، جن کا بڑا حصہ تاتاری سیلاب کے نذر ہو گیا، چنگیز خاں کا مسیحی مورخ

ہیرلڈ لیمب کا یہ بیان محض دینی تعصب اور مبالغہ آرائی پر محمول نہیں کیا جاسکتا کہ :-

”مسلمانوں کی دنیا جنگ و پیکار کی دنیا تھی، اور ایسی دنیا تھی جو لغتہ و سرود سے بھی شغل رکھتی تھی، اور

کان بھی اچھے پائے تھے، لیکن اس ظاہر کے ساتھ باطن میں ایک ہیجان کی حالت ہمہ وقت ضرور رہتی تھی،

بادشاہوں کی جگہ غلام اور ملوک حکومت کرتے تھے، دولت جمع کرنے کا شوق بہت تھا، اخلاقی برائیاں

لے چنگیز خاں ص ۱۴۷ ماخوذ از ترجمہ مولوی عنایت اللہ صاحب مرحوم۔

اور ملکی نازشیں بھی کچھ کم نہ تھیں، انتظام امور ایسے لوگوں کے سپرد تھا، جو رعایا کو لوٹتے اور کھاتے تھے، عورتوں کی نگہداشت خواجہ سراؤں کے ذمہ تھی، اور ایمان کا مالک خدا تھا!

خوارزم شاہی سلاطین سے اس موقع پر بھی وہی مہلک غلطی ہوئی، جو اسپین کے عرب فرمانرواؤں نے کی تھی، اور جس کو الہی قانون مکافات نے معاف نہیں کیا، یعنی یہ کہ انھوں نے اپنی ساری طاقت سلطنت کی توسیع و استحکام اور حریفوں کی سرکوبی میں صرف کی، اور اس انسانی آبادی میں جو ان کی سرحد سے متصل تھی، اور بجائے خود ایک دنیا تھی، تبلیغ اسلام، اور ان تک خدا کا آخری پیغام پہنچانے کی کوئی فکر نہیں کی، جذبہ دینی سے قطع نظر کر کے سیاسی فراست اور دور بینی کا بھی تقاضا تھا کہ وہ اس وسیع انسانی آبادی کو اپنا ہم آہنگ اور ہم عقیدہ بنانے کی کوشش کرتے، اور اس طرح ہمیشہ کے لئے اس خطرہ سے محفوظ ہو جاتے، جو نہ صرف ان کو بلکہ پورے مسلمانوں کو پیش آیا۔

یہ زمانہ اور حالات تھے، جب تاتاری ابتدا اپنے سردار اور قائد چنگیز خاں کی قیادت میں عذاب الہی کی طرح عالم اسلام کے مشرقی حصہ ایران و ترکستان کی طرف بڑھے، پھر اس بغداد کی بھی نوبت آگئی، جہاں کا نقشہ اوپر کی سطروں میں گذر رہا، اور بالآخر انھوں نے ۱۲۵۸ء میں اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی، وَاقِعُوا فِتْنَةً لِّأَصْحَابِ الَّذِينَ ظَلَمُوا إِنَّهُمْ خَاصَّةٌ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ“

عالم اسباب میں اس کا قریبی محرک یہ واقعہ ہوا کہ چنگیز خاں نے خوارزم شاہ کو پیام بھیجا کہ میں بھی ایک وسیع سلطنت کا فرمانروا ہوں، اور آپ بھی ایک وسیع سلطنت کے تاجدار ہیں، بہتر ہے کہ ہم دونوں تجارتی تعلقات قائم کریں، ہمارے تاجر بے خوف و خطر آپ کے قلمرو میں جائیں، اور یہاں کی مخصوص پیداوار اور مال

لے چنگیز خاں ۱۲۱۹ء ہیرلڈ لیمب ماخوذ از ترجمہ مولوی عنایت اللہ صاحب مرحوم ۱۲۵۸ء چنگیز خاں کی سلطنت کی ابتدا ۱۲۵۵ء سے ہوئی، خوارزم شاہ کی حکومت پر پہلا حملہ ۱۲۱۹ء میں ہوا، اس کا انتقال ۱۲۲۵ء میں ہوا، اس کے بیٹوں اور پوتوں نے اس کے مقاصد کی

کمیل کی ۱۲۶۵ء میں جب بغداد پر حملہ ہوا تو تاتاری افواج کا قائد اور امیر چنگیز خاں کا پوتا ہلاک خواں تھا۔

وہاں فروخت کریں، اور آپ کے تاجر اطمینان کے ساتھ ہمارے ملک میں آئیں، اور وہاں کا مال فروخت کریں، خوارزم شاہ نے اس کو منظور کر لیا، اور تجارتی تعلقات قائم ہو گئے، اور تجارتی قافلے بے تکلف دونوں ملکوں میں آنے جانے لگے، اس کے بعد کیا پیش آیا، جس سے عالم اسلام اچانک خون کے سمندر میں ڈوب گیا، اس کی تفصیل مغربی مورخ کی زبان سے سنئے، جس کی اسلامی مورخین کے بیان سے حرف بگرفت تصدیق ہوتی ہے۔

ہیرلڈ لیمب اپنی کتاب ”چنگیز خاں“ میں لکھتا ہے:-

”لیکن تجارت کے تعلقات جو چنگیز خاں نے قائم کئے تھے، وہ اتفاق سے یک بخت ختم ہو گئے، اور یہ اس طرح پیش آیا کہ قراقرم سے تاجروں کا ایک قافلہ مغرب کو آ رہا تھا کہ راستہ میں اترار کے حاکم نے جس کا نام اینل جن تھا قافلہ کے سب آدمیوں کو گرفتار کر لیا، اور اس کی اطلاع اپنے آقا یعنی خوارزم شاہ کو اس طرح کی گویا اس قافلہ میں جاسوس بھی موجود ہیں، اینل جن کا یہ خیال بالکل قرین عقل تھا۔“

حاکم اترار کے پاس سے اطلاع کے آتے ہی سلطان محمد خوارزم شاہ نے بے سوچے سمجھے حکم دے دیا کہ قافلہ کے کل تاجروں کو ہلاک کر دیا جائے، چنانچہ اس حکم کے مطابق قراقرم سے آئے ہوئے کل تاجر قتل کر دیئے گئے، اس کی اطلاع جس وقت چنگیز خاں کو ہوئی تو اس نے فوراً اپنے سفیر بھیج کر خوارزم شاہ سے اس کی شکایت کی، سلطان محمد نے سفیروں کے سردار کو بھی قتل کر دیا، اور جو لوگ اس کے ساتھ تھے، ان کی داڑھیاں تلواروں میں اس سفارت میں سے جن لوگوں کی جان بچ گئی تھی، وہ چنگیز خاں کے پاس آئے اور کل حال عرض کیا، دشت گوبی کا خان حال سنتے ہی ایک پہاڑی پر چڑھ گیا کہ تنہائی میں اس واقعہ پر غور کرے، مغلوں کے ایچی کو مار ڈالنا ایسا فعل تھا، جسے بغیر سزا کے چھوڑنا ممکن نہ تھا، یہ حرکت ایسی تھی جس کا بدلہ لینا مغلوں کی گذشتہ روایات کے لحاظ سے ضروری تھا۔

چنگیز خاں نے کہا جس طرح آسمان پر دو آفتاب نہیں رہ سکتے، اسی طرح زمین پر دو خاقان

نہیں رہ سکتے۔“

۱۲۱۹ء چنگیز خاں ۱۲۵۸ء ہیرلڈ لیمب - لہ ملاحظہ ہو البدایہ والنہایہ ج ۱۳، الکامل لابن الاثیر ج ۱۲، ۱۲۵۹ء چنگیز خاں ۱۲۵۸ء ہیرلڈ لیمب -

اسلام کے مشرقی ممالک تاتاریوں کی زد میں

تاتاریوں نے پہلے بخارا کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور اس کو ایک تودہ خاک بنا دیا، شہر کی آبادی میں سے کوئی زندہ نہیں بچا، پھر سمرقند کو خاک سیاہ کر دیا، اور ساری آبادی کو فنا کے گھاٹ اٹا دیا یہی حشر عالم اسلام کے نامی گرامی شہروں سے، ہمدان، زنجان، قزوین، مرو، نیشاپور، خوارزم کا ہوا، خوارزم شاہ جو عالم اسلامی کا واحد فرماؤ اور سب سے طاقتور سلطان تھا، تاتاریوں کے خوف سے بھاگا پھرتا تھا، اور تاتاری اس کے تعاقب میں تھے، یہاں تک کہ ایک نامعلوم جزیرہ میں اس نے فضا کی۔

خوارزم شاہ نے ایران و ترکستان کی اسلامی ریاستوں اور خود مختار حکومتوں کو اپنی شاہی زمین میں ضم کر لیا تھا، اس لئے جب انھوں نے تاتاریوں کے مقابلہ میں شکست کھائی تو پھر ان کا مقابلہ کرنے والا مشرق میں کوئی نہ تھا، تاتاریوں کی ہیبت اور مسلمانوں کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات ایک تاتاری ایک گلی میں گھسا ہے، جہاں مسلمان موجود تھے کسی کو مقابلہ کی ہمت نہ ہوئی، اور اس نے ایک ایک کر کے سب کو قتل کر دیا، اور کسی نے ہاتھ تک نہ اٹھایا، ایک گھر میں ایک تاتاری عورت مرد کے بھیس میں گھس گئی اور تنہا سائے گھر والوں کو قتل کر دیا، پھر ایک قیدی کو جو اس کے ساتھ تھا، احساس ہوا کہ یہ عورت ہے تو اس نے اس کو قتل کیا، بعض اوقات تاتاری نے کسی مسلمان کو گرفتار کیا، اور اس سے کہا کہ اس پتھر پر سر رکھ دے، میں خنجر لاکر تجھے ذبح کروں گا، مسلمان سہا پڑا رہا، اور بھاگنے کی ہمت نہ ہوئی، یہاں تک کہ وہ شہر سے خنجر لایا اور اس کو ذبح کیا۔

تاتاری یورش عالم اسلام کے لئے ایک بلائے عظیم تھی، جس سے دنیا، اسلام کی چولیس ہل گئیں، مسلمان مہوت و ششدر تھے، ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک ہر اس اور یاس کا عالم طاری تھا

لے تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو "الکامل" (ابن اثیر) ج ۱۲۔ اور دارالقرآن (بستان ج ۶۔ مادہ تتر)

تاتاریوں کو ایک بلائے بے درماں سمجھا جاتا تھا، ان کا مقابلہ ناممکن اور ان کی شکست ناقابل قیاس سمجھی جاتی تھی، یہاں تک کہ ضرب المثل کے طور پر یہ فقرہ مشہور تھا کہ "اِذَا قِيلَ لَكَ اِنَّ التَّتْرَ اَذْهَبَ مَوْافَا لَتَصَدَّقَ" یعنی اگر تم سے کہا جائے کہ تاتاریوں کو ہمیں شکست ہوئی ہے تو یقین نہ کرنا، جن ملکوں یا شہروں کی طرف ان کا رخ ہو جاتا، سمجھ لیا جاتا تھا کہ ان کی شامت آگئی، جان و مال، عزت و آبرو، مساجد و مدارس کسی کی خیر نہیں تھی، تاتاریوں کا رخ کرنا بربادی، قتل عام، ذلت و بے آبروئی کا مرادف تھا، ایک مرتبہ تقریباً سارا عالم اسلام (خصوصاً اس کا مشرقی حصہ) اس فتنہ جہاں سوز کی لپٹ میں آ گیا، مورخ ہر طرح کے واقعات پڑھتا اور لکھتا ہے، اس کے سامنے قوموں کی بربادی اور ملکوں کی تباہی کے اتنے مناظر گذرتے ہیں کہ اس کی طبیعت بے حس اور اس کا قلم بیدرد ہو جاتا ہے، لیکن اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے ابن اثیر جیسا مورخ (جس نے بڑے صبر و تحمل کے ساتھ دنیا کی تاریخ لکھی ہے) اپنی قلبی کیفیت اور تاثر کو چھپا نہیں سکا وہ لکھتا ہے

"یہ حادثہ اتنا ہولناک اور ناگوار ہے کہ میں کئی برس تک اس پیش میں رہا کہ اس کا ذکر کروں یا نہ کروں اب بھی بڑے تردد و تکلف کے ساتھ اس کا ذکر کر رہا ہوں، واقعہ بھی یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی خبر موت سنانا کس کو آسان ہے، اور کس کا جگر ہے کہ ان کی ذلت و رسوائی کی داستان سناے؟ کاش میں نہ پیدا ہوا ہوتا، کاش میں اس واقعہ سے پہلے مر چکا ہوتا، اور بھولا بسرا ہو جاتا، لیکن مجھے بعض دوستوں نے اس واقعہ کے لکھنے پر آمادہ کیا، پھر بھی مجھے تردد تھا، لیکن میں دیکھا کہ نہ لکھنے سے کچھ فائدہ نہیں، یہ وہ حادثہ عظیم اور مصیبت کبریٰ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی، اس واقعہ کا تعلق تمام انسانوں سے ہے، لیکن خاص طور پر مسلمانوں سے ہے، اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ از آدم تا این دم ایسا واقعہ دنیا میں پیش نہیں آیا تو وہ کچھ غلط دعویٰ نہ ہوگا، اس لئے کہ تاریخوں میں اس واقعہ کے پانگ بھی کوئی واقعہ نہیں ملتا، اور شاید دنیا قیامت تک (یا جوج ماجوج کے سوا) کبھی ایسا واقعہ نہ دیکھے، ان وحیوں نے کسی پر رحم نہیں کھایا، انھوں نے عورتوں، مردوں، اور بچوں کو قتل کیا، عورتوں کے پیٹ چاک کر دیئے، او

پیٹ کے بچوں کو مار ڈالا اِنَّا لِلّٰهِ رَاجِعُونَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ

یہ حادثہ عالمگیر و عالم آشوب تھا یہ ایک طوفان کی طرح اٹھا اور دیکھتے دیکھتے سارے عالم میں پھیل گیا!

”مرصا و العباد کا مصنف جو اس تاتاری حملہ کا شاہد یعنی ہے اور جس کا مولدے اور مسکن ہمدان اس

تاتاری غارت گری کے نذر ہو چکے تھے لکھتا ہے:-

”تاریخ شہور سنہ سبع و عشر و ستائے لشکر مخدول کفار تاتار خذلہم اللہ و دمرہم امتیلا یا

برآں دیار و آن فتنہ و فساد و قتل و ہدم و حرق کہ ازاں ملائین ظاہر گشت در بیچ عصر در زمان کفر و اسلام

کس نشان نہ دادہ است و در بیچ تاریخ نیامدہ قبل ازین پیشتر چگونہ بود کہ از یک شہرے کہ مولد و منشا

این ضعیف است قیاس کردہ اند کہ بیش ہفت صد ہزار آدمی بقتل آمدہ است و اسیر گشتہ از شہر و

ولایت و فتنہ و فساد آن ملائین مخاذیل بر حملگی اسلام و اسلامیات ازاں زیارت است کہ در حیرت

گنجد و این واقعہ ازاں شائع تر است در جہاں کہ بشرح حاجت فتد و اگر عیاد ابالشہ غیرت و حمیت

اسلام در نہاد ملوک و سلاطین بجنبہ کہ عہدہ رعایت مسلمانوں و مسلمانان در ذمہ ایشان است کہ

”الامیر سراج علی سر عیتم و هو مستول عنہم“ و اریحیت و رجولیت دین و امن ایشان

نگیرد تا اتفاق جمعیت کنند و مکر انقیاد فرمان ”انفرو و احققا و ثقالا و جاہدا و ابا موالکم

و انفسکم فی سبیل اللہ“ بر میان جان بندند و نفس و مال و ملک در دفع این فتنہ نہا کنند بوی آن آید

کہ بیک بارگی مسلمانوں بر انداختہ شود و اکثر بلاد اسلام بر افتاد این بقیت رانیز بر اندازند و جہاں کفر گیرد و نغوذ

بالحہ خوف و خطر آن است کہ مسلمانوں آن قدر اسے کہ ماندہ بود دشمنی معاملہ مامد جہاں بے معنی چنان بر خیزد

کہ نہ اسم ماند نہ رسم!

تنہا عالم اسلام نہیں اس وقت کی پوری تمدن دنیا تاتاریوں کے حملہ سے لرزہ بر اندام تھی جہاں

ان کے پہنچنے کے بہت کم امکانات تھے، وہاں بھی دہشت پھیلی ہوئی تھی، لیکن اپنی مشہور کتاب ”تاریخ
انحطاط و سقوط روم“ میں لکھتا ہے:-

”سوڈن کے باشندوں نے روس کے ذریعہ تاتاری طوفان کی خبر سنی ان پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ

وہ ان کے خوف سے اپنے ممول کے مطابق انگلستانی سواحل پر شکار کھیلنے کے لئے نہیں نکلتے۔“

کیمبرج کی تاریخ عہد وسطیٰ کے مصنفوں نے مغلوں کے اس شدید تصادم کو جس کا محرک چنگیز خان اور

بڑی خوبی کے ساتھ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

”انسان کی طاقت سے باہر تھا کہ مغلوں کو روک سکے، دشت و صحرا کے تمام خطروں پر وہ غالب آئے

پہاڑ سمندر موسمی سختیاں، قحط و بائیں کوئی بھی ان کی راہ میں مزاحم نہ ہو سکا کسی قسم کے خطروں کا انھیں خوف

نہ تھا، کوئی قلعہ ان کے حملہ کی تاب نہ لاسکتا تھا، اور رحم کے لئے کسی مظلوم کی فریاد ان پر اثر نہ کرتی تھی، یہاں

میدان تاریخ میں ایک نئی طاقت سے ہم کو واسطہ پڑتا ہے، یہ طاقت اور زور ایسا تھا جس نے بہت سی ملکی اور

سیاسی قضیوں کا چشم زدن میں فیصلہ کر دیا، اور انھیں اس طرح مٹا دیا، جیسے آسمان زمین پر گر کر سب چیزوں

کو مٹائے، یہ ملکی اور سیاسی قضیے بھی ایسے تھے کہ اگر آفت نازل نہ ہوتی تو آگے چل کر یا تو کسی کے حل کے وہ حل

نہ ہوتے اور اگر جاری رہتے تو کبھی ختم ہونا نہ جانتے، تاریخ عالم میں اس نئی قوت کا ظہور یعنی ایک شخص واحد کی

یہ قابلیت کہ بنی نوع انسان کے تمدن کو بدل دے، چنگیز خاں سے شروع ہوا، اور اس کے پوتے قوبیلای خاں

پر ختم ہو گیا، جس کے زمانہ میں مغلوں کی سالم اور بسیط سلطنت نے تقسیم و تفریق کے آثار ظاہر کرنے شروع

کر دیے، ایسی طاقت پھر کبھی دنیا کے پردہ پر ظاہر نہیں ہوئی!

بغداد کی تباہی

بالآخر یہ وحشی عالم اسلام کو زیر و زبر کرتے، خون کے دریا بہاتے اور آگ لگاتے ۱۲۵۶ء میں چنگیز خاں

تھے، ایک دل دوزم شہ تیہ کہا جس میں اس وقت کے تمام مسلمانوں کے زخمی دلوں کی ترحمانی ہے، اس کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں:-

آسماں راحق بود گر خون مبارد بر زمین	برزوال ملک مستعصم امیر المومنین
لے محمد گر قیامت می بر آری سر ز خاک	سر بر آوردین قیامت در میان خلق بین
نازنینان حرم را خون خلق نازنین	ز استان بگذشت و مارا خون دل آراستین
زینهار از دور گیتی و انقلاب روزگار	در خیال کس نگشتی کا پنچناں گرد و جنسین
دیدہ بردار لے کہ دیدی شوکت بیت احوال	قبصر ارا روم سر بر خاک خاقاں بر زمین
خون فرزندان عم مصطفی شدر بختہ	ہم بر آں خاکے کہ سلطاناں نہا ندے جسین
و جلد خوننا بست زین پس گر ہند سر پر نشست	خاک نخلستان بطجرا کنتد بان خون عجبین
رفے در یاد رہم آمد زین حدیث ہولناک	می تو اں دانست بر ریش ز برج افتادہ چہین
نوحہ لائق نیست بر خاک شہیدان زانکہ ہست	کمترین دولت مرایشاں را بہشت برترین
لیکن از رے مسلمانان و راہ مرحمت	مہربان رادل بسوزد در فراق نازنین

بغداد کے بعد تاتاریوں نے حلب کا رخ کیا، اور ابن کثیر کے بیان کے مطابق اس کے ساتھ ہی بغداد کا سا سلوک کیا، وہاں سے دمشق کی طرف بڑھے، اور جمادی الاولیٰ ۶۵۵ھ میں اس پر قبضہ کر لیا، شہر کے عیسائیوں نے تاتاری فاتحوں کا شہر سے نکل کر استقبال کیا، اور ان کو تحائف پیش کئے، اور ان کے حاکم کے پاس سے فرمان لے کر آئے، اور شہر میں فاتحانہ داخل ہوئے، ابن کثیر جو خود دمشق کے رہنے والے ہیں، اس واقعہ کی تصویر کھینچتے ہیں، جس سے مسلمانوں کی بے بسی، ذلت و کمزوری کا اندازہ ہوتا ہے:-

”عیسائی باب تو ما سے داخل ہوئے، وہ صلیب کو لوگوں کے سروں پر بلند کئے ہوئے تھے اور اپنا مخصوص نعرہ

لگا رہے تھے، وہ پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ دین برحق یسوع مسیح کا دین غالب آیا، اور اسلام اور اہل اسلام کی صاف صاف مذمت کرتے تھے، ان کے ہاتھوں میں شراب کے برتن تھے، جن مسجد کے پاس سے گزرتے، اس کے پاس شراب چھڑکتے، کچھ شراب کی بوتلیں تھیں، جن کو لوگوں کے چہروں اور کپڑوں پر چھڑکتے تھے، گلیوں اور بازاروں میں جو شخص بھی گزرتا، اس کو حکم دیتے تھے کہ صلیب کی کھڑے ہو کر تعظیم کرے، مسلمان یہ نقشہ دیکھ کر جمع ہو گئے، اور ان کو دھکائے کر کنیہ مریم تک پہنچا دیا، وہاں عیسائی مقرر نے کھڑے ہو کر مسیحیت کی تعریف میں تقریر کی، اور دین اسلام، اور اہل اسلام کی مذمت کی:-

ابن کثیر ذیل المرأة کے حوالہ سے آگے لکھتے ہیں:-

”عیسائی جامع مسجد میں شراب لے ہوئے داخل ہوئے، ان کی نیت تھی کہ اگر تاتاریوں کا زیادہ رہنا ہوا، تو وہ بہت سی مسجدوں کو گرا دیں گے، جب شہر میں یہ واقعات پیش آئے تو مسلمان قاضی، شاہد اور علماء جمع ہو کر قلعہ میں گئے، اور تاتاری حاکم قلعہ ایل سیان سے شکایت کی، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان بڑی ذلت سے نکال دیئے گئے، اور عیسائیوں کے سر پر آوردہ لوگوں کی بات کی گئی، اِنَّا لَنَبِیْرٌ رَّا جَعُوْنَا لَہٗ

شام کے قبضہ کے بعد تاتاریوں کا رخ قدرتی طور پر مصر کی طرف تھا، اور وہی تنہا اسلامی ملک تھا، جو ان کی غارت گری سے بچا ہوا تھا، سلطان مصر الملک المنظر سیف الدین قطر کو معلوم تھا کہ اب مصر کی باری ہے، اور تاتاریوں کی چڑھائی کے بعد ملک کی حفاظت مشکل ہے، اس نے مناسب سمجھا کہ وہ مصر میں مدافعت کرنے کے بجائے آگے بڑھ کر شام میں تاتاریوں پر خود حملہ کرے، چنانچہ ۲۵ رمضان المبارک ۶۵۵ھ کو عین جالوت کے مقابلہ پر تاتاریوں اور مصر کی اسلامی افواج کا مقابلہ ہوا، اور سابق تجربوں کے بالکل خلاف تاتاریوں کو شکست فاش ہوئی، وہ بڑی طرح سے بھاگے مصریوں نے ان کا تعاقب کیا، اور کثرت سے ان کو قتل کیا، اور بڑی تعداد میں گرفتار۔

سیوطی تاریخ الخلفاء میں لکھتے ہیں:-

تاتاریوں کو شرمناک ہزیمت ہوئی اور خدا کے فضل و کرم سے مسلمانوں نے ان پر فتح پائی، تاتاریوں کا قتل عام ہوا، اور وہ اس طرح سرا سیمہ ہو کر بھاگے کہ لوگوں کی ہمتیں بڑھ گئیں، وہ آسانی سے ان کو کپڑے لیتے تھے اور لوٹتے تھے۔

عین جالوت کے معرکہ کے بعد سلطان الملک الظاہر سیرس نے متعدد بار تاتاریوں کو شکست دی اور سارے ملک شام سے ان کو بے دخل اور خارج کر دیا، اور اس طرح وہ کہاوت غلط ثابت ہوئی کہ تاتاریوں کی شکست ممکن نہیں!

تاتاریوں میں اشاعتِ اسلام

قریب تھا کہ سارا عالم اسلام اس سیلابِ بلا میں بہ جائے اور جیسا کہ اس وقت کے اہل نظر اور درد مند مسلمان مصنفین نے خطرہ ظاہر کیا ہے، اسلام کا نام و نشان بھی مٹ جائے کہ دفعۃً تاتاریوں میں اشاعتِ اسلام شروع ہو گئی اور جو کام مسلمانوں کی شمشیریں اور مسلمان بادشاہ نہ کر سکے، وہ اسلام کے داعیوں اور خدا کے مخلص بندوں نے انجام دیا، اور خود اسلام نے اپنے خون آشام دشمنوں کے دل میں گھر کرنا شروع کر دیا۔ تاریخ کے عجیب ترین واقعات اور حقائق میں سے اس ناقابلِ تسخیر قوم کا اسلام سے سحر اور مسلمانوں کے فاتح کا اسلام سے مفتوح ہو جانا ہے۔ تاتاریوں کا ایک سال کے عرصہ میں برق و باد کی طرح وسیع اسلامی دنیا پر چھا جانا، اور عالم اسلام کو بڑی شمشیر فتح کر لینا، اتنا عجیب و غریب واقعہ نہیں، اس لئے کہ ساتویں صدی کا عالم اسلام ان بیماریوں، کمزوریوں کا شکار تھا، جو بالعموم تمدن و تہذیب کی انتہائی ترقی کے بعد قوموں میں پیدا ہو جاتی ہیں، اور ان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہیں، اس کے بالمقابل تاتاری تازہ دم، جفاکش، بدوی زندگی کے عادی اور خون خوار خون آشام تھے، لیکن عجیب واقعہ اور تاریخ کا معمایہ ہے کہ اپنے انتہائی عروج کے زمانہ میں

نیم وحشی قوم اپنے مفتوح اور بے دست و پا مسلمانوں کے دین کی حلقہ بگوش بن گئی، جو اپنی ہر قسم کی مادی اور سیاسی طاقت کھو چکا تھا، اور جس کے پیروؤں کو تاتاری سخت ذلت اور خفارت کی نظر سے دیکھتے تھے، پروفیسر ٹی، ڈبلیو، آرنلڈ اپنی مشہور کتاب دعوتِ اسلام (PREACHING IN ISLAM) میں استعجاب کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

”لیکن اسلام اپنی گذشتہ شان و شوکت کے خاکستر سے پھر اٹھا، اور واعظین اسلام نے ان ہی وحشی مخلوق کو جنھوں نے مسلمانوں پر کوئی ظلم باقی نہ رکھا تھا، مسلمان کر لیا، یہ ایسا کام تھا جس میں مسلمانوں کو سخت مشکلیں پیش آئیں کیونکہ دو مذہب اس بات کی کوشش میں تھے کہ مخلوق اور تاتاریوں کو اپنا معتقد بنائیں، وہ حالت بھی عجیب غریب اور دنیا کا بے مثل واقعہ ہو گی جس وقت بد مذہب اور عیسائی مذہب و اسلام اس جدوجہد میں ہوں گے کہ ان وحشی اور ظالم مخلوق کو جنھوں نے ان تین بڑے مذہبوں کے معتقدوں کو اپنا مال کیا تھا، اپنا مطیع بنائیں۔“

”اسلام کے لئے ایسے وقت میں بد مذہب اور عیسائی مذہب کا مقابلہ کرنا، اور مخلوق کو ان دونوں مذہبوں سے بچا کر اپنا پیرو بنانا ایسا کام تھا، جس میں بظاہر کامیابی ناممکن معلوم ہوتی تھی، مخلوق کے طوفانِ ہلاکت سے مسلمانوں کے برابر کسی نے نقصان نہ اٹھایا تھا، وہ شہر و محروم شہر جو ایک زمانہ میں اسلامی علوم و فنون کا مرکز تھے، اور جہاں ایشیا کے ارباب علم و فضل آباد تھے، اکثر جلا کر خاک کر دیئے گئے تھے، مسلمانوں کے عالم اور فقیر یا تو قتل کئے گئے، یا ان کو غلام بنایا گیا، خانانِ مغل جو اسلام کے سوائے اور سب مذہبوں پر بہرہ بان تھے، اسلام کے ساتھ مختلف درجہ کی نفرت اور عداوت رکھتے تھے، چنگیز خاں نے حکم دیا تھا کہ جو لوگ جانوروں کو شریعہ کے مطابق

لے دعوتِ اسلام (مترجمہ مولوی عنایت اللہ) ص ۲۲۱، ۲۲۲ سے مخلوق نے مسلمانوں پر ایسے ظلم کئے کہ چینی تاشے والے جب پردہ پر عکس کی تصویریں دکھاتے ہیں، تو ایک تصویر میں سفید دائرہ کا ایک بڑھا آدمی آتا ہے، جس کی گردن گھوڑے کی دم سے بندھی ہوتی ہے، اور گھوڑا اس کو گھسیٹے گھسیٹے پھرتا ہے، یہ تصویر گویا ظاہر کرتی ہے کہ مخلوق کے سواروں نے مسلمانوں کو کیسے آزاد پہچائے (ہوور تھ پہلی جلد ص ۱۵۹)۔

ذبح کریں ان کو قتل کر دیا جائے، اسی حکم کو تو بلائی خان نے اپنے زمانہ میں از سر نو جاری کیا، اور اس کی پیروی کے لئے نخب اور نخبوں کے لئے انعام مقرر کئے، اور اس طرح سات برس تک مسلمانوں کو سخت سے سخت آزار پہنچائے، مغلوں نے اس موقع پر دولت جمع کر لی، اور غلاموں نے آزاد ہونے کے لئے آقاؤں پر ذبیحہ کا الزام لگایا، گیوک خاقان کے عہد میں (۱۲۲۶ء تا ۱۲۳۸ء) جس نے کل انتظام سلطنت دو عیسائی وزیروں کے سپرد کر رکھا تھا، مسلمانوں کو سخت اذیتیں پہنچائیں، ارغوخان نے بھی جو چوتھا ایٹجان (۱۲۸۳ء اور ۱۲۹۱ء) ہوا مسلمانوں پر ظلم کئے اور عدالت اور مال کے محکموں میں جس قدر ارمیاں لٹکی پاس تھیں وہ خالی کرالیں اور ان کا دربار میں آنا بند کر دیا۔
 باوجود ان مشکلات کے مغلوں اور وحشی قوموں نے جو مغلوں کے بعد آئیں انہی مسلمانوں کا مذہب قبول کیا، جن کو انھوں نے اپنے پیروں میں روندنا تھا۔

یہ واقعہ جتنا عجیب اور عظیم الشان ہے، اتنا ہی یہ امر حیرت انگیز ہے کہ تاریخ میں اس کی تفصیلات اور جزئیات بہت کم ملتی ہیں اور جن لوگوں کے ہاتھوں یہ کارنامہ انجام پایا، ان کا تاریخ کے دفتر میں بہت کم سراغ ملتا ہے جن مخلصین نے اس خون آشام تاریخی قوم کو اسلام کا حلقہ بگوش بنایا، ان میں بہت کم لوگوں کا نام دنیا کو معلوم ہے مگر ان کا یہ کارنامہ کسی اسلامی کارنامہ سے کم نہیں، اور ان کا احسان نہ صرف مسلمانوں پر بلکہ پوری انسانیت پر قیامت تک رہے گا کہ انھوں نے دنیا کو وحشت و بربریت سے محفوظ کر کے ایک ایسی قوم کی تولیت میں دے دیا، جو خدائے واحد کی پرستار اور رحمتہ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی علمبردار تھی۔
 چنگیز خاں کی سلطنت انتقال کے بعد اس کے چار بیٹوں کی چار شاخوں میں بٹ گئی تھی، ان چاروں شاخوں میں اسلام کی اشاعت شروع ہو گئی اور تاتاری خاقان اور ان کی دعوت و تبلیغ اور اثر سے تاتاری قوم مسلمان ہونا شروع ہو گئی، یہاں تک کہ ایک صدی کے اندر اندر تقریباً ساری تاتاری قوم مسلمان ہو گئی۔
 لے ہو ورتھج ۱۲۰۱ء (جس وقت یہ لکھا گیا کہ اس حکم سے مسلمان تاجروں کا دربار میں آنا بند ہو گیا) اور اس کی وجہ سے تجارت کو نقصان پہنچا تو یہ حکم منسوخ کر دیا گیا) لے ہو ورتھج ۱۶۵۱ء دی گوین ج ۲۶۵۳ لے دعوت اسلام ۲۲۵۵ء ۲۲۶۱ء

پروفیسر آرنلڈ نے "دعوت اسلام" میں اس کے جستہ جستہ واقعات لکھے ہیں، چنگیز خاں کے بڑے بیٹے جو جی خاں کی شاخ میں جو سلطنت کے مغربی حصہ سیراد اور اپر حکمراں تھی، اشاعت اسلام کی تاریخ بیان کرتے ہوئے آرنلڈ لکھتا ہے:-

"مغلوں کا پہلا بادشاہ جو مسلمان ہوا، وہ برک خاں تھا، جو ۱۲۵۶ء سے ۱۲۶۶ء تک سیراد اور کا خان رہا، اس بادشاہ کے مسلمان ہونے کی نسبت لکھا ہے کہ ایک دن وہ ایک کارواں میں پہنچا، جو بخارا سے آتا تھا، اس میں دو مسلمان تاجر تھے، جن کو برک خاں الگ لے گیا، اور اسلام کے متعلق کچھ سوالات ان سے کئے، مسلمانوں نے اپنے مذہب کے احکام و ارکان اس خوبی سے بیان کئے کہ سیراد اور کو مسلمان ہونے کا شوق پیدا ہوا، وہ اسلام لایا، اس کا حال برک خاں نے اپنے چھوٹے بھائی سے بیان کیا، اور اس کو بھی اسلام قبول.... کرنے کی ہدایت کی، اس کے بعد برک خاں نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا، اسلام قبول کرنے کے بعد برک خاں نے سلطان مصر رکن الدین بمرس سے مصاحبت کرنی، اس مصاحبت کا باعث خود سلطان مصر اس طرح ہوا کہ اس نے سیراد اور کے دو سو مغلوں کی نہایت خاطر مدارت کی، ان مغلوں کا قصہ یہ ہے کہ جب خان سیراد اور ہلاکو خاں فاتح ہند میں عداوت زیادہ بڑھی تو یہ دو سو مغل جو ہلاکو خاں کی فوج میں بھرتی تھے، بھاگ کر شام کے ملک میں چلے آئے اور یہاں سے وہ بڑے اعزاز کے ساتھ قاہرہ پہنچائے گئے، جہاں دربار مصر سے ان کو اسلام قبول کرنے کی ہدایت ہوئی، سلطان رکن الدین نے ان مغلوں میں سے دو سو آدمیوں کے ساتھ اپنے چند سفیر کئے، اور برک خاں کو ایک خط ان کی معرفت روانہ کیا، جب یہ لوگ سیراد اور سے قاہرہ کو واپس آئے تو سلطان کو خبر دی کہ برک خاں کے امیروں کے ہاں اور ایک شہزادی کے ہاں ایک ایک امام اور موزن مقرر ہے، اور بچوں کو کتب میں قرآن پڑھایا جاتا ہے، سلطان سے انھوں نے یہ بھی کہا کہ جب ہم قاہرہ سے

لے ۱۲۶۶ء میں نجم الدین مختار الزاہدی نے برک خاں کے لئے ایک کتاب لکھی جس میں رسالت کو برہان ثابت کیا اور مسلمانوں اور عیسائیوں کے مذہبی مناظروں کا حال لکھا۔ لے ابو الغازی قوم ۱۸۴۱ء ۱۸۴۲ء مقرر یومی ۲۱ قوم ۱۸۴۱ء ۱۸۴۲ء ایضاً ۲۱۵

روانہ ہوئے تھے تو راستہ میں برکخان کے سیرنے، جو سلطان مصر کی خدمت میں اطلاع کے لئے حاضر ہوئے تھے کہ برکخان اور اس کی رعایا مسلمان ہو گئی ہے، غرض جب سلطان رکن الدین اور برکخان میں رسم اتحاد پیدا ہوئی تو سیراد اور آکے بہت مغل مصر میں آئے، جہاں ان کو اسلام قبول کرنے کی ترغیب ہوئی۔^۱

تاتاری سلطنت اور خاندان چنگیز خاں کی دوسری شاخ دولت ایلیخانیہ میں اشاعتِ اسلام کے متعلق آرنلڈ لکھتا ہے:-

”ایران میں جہاں ہلاکو خاں دولت ایلیخانیہ کا بانی ہوا، ترکوں میں اسلام کی اشاعت رفتہ رفتہ ہوئی (ہلاکو خاں کا بیٹا کوردو اپنے بھائی باقا خاں کا جانشین ہوا، دولت ایلیخانیہ کا پہلا بادشاہ تھا، جس نے اسلام قبول کیا، ایک عہد نویس عیسائی مصنف نے لکھا ہے کہ کوردو دار کی تعلیم و تربیت عیسوی مذہب پر ہوئی تھی، بچپن میں اس کو اصطباغ ملا تھا، اور نکولس اس کا نام رکھا گیا تھا، لیکن کوردو جب بڑا ہوا تو اس نے مسلمانوں کے اثر و صحبت سے جن کو وہ بہت عزیز رکھتا تھا، عیسائی مذہب چھوڑ کر اسلام اختیار کیا، اور سلطان محمد (یا احمد) نام رکھا، اور جس قدر ہو سکا، اس بات کی کوشش کی کہ سب تاتاری اسلام قبول کر لیں، اور اس کے لئے انعام و اکرام اور اختیار اور عزت لوگوں کو بخشی، یہاں تک کہ اس کے زمانہ میں بہت تاتاری مسلمان ہو گئے، اس بادشاہ نے سلطان مصر کو اپنے مسلمان ہونے کی خبر ذیل کے مراسلہ سے بھیجی۔

”خدا کی قوت اور قان کے اقبال سے سلطان احمد کا فرمان بادشاہ مصر کے نام، بعد تہید کے واضح ہو کہ خدانے اپنی عنایت اور ہدایت کی روشنی سے آغازِ نوجوانی کے زمانہ میں ہم کو اپنی الوہیت اور وحدانیت کا اقرار کرنے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق کرنے اور اپنے دوستوں اور نیک بندوں کی نسبت خوش اعتقاد رہنے کی ہدایت کی تھی، وہ جس کسی کو ہدایت پر لانا چاہتا ہے اس کے دل کو مذہبِ اسلام قبول کرنے کے لئے

۱۔ مغربی ۱۸۵۰ء ایضاً ۲۲۲ ص ۲۲۲ وصفات نے اس بادشاہ کو مسلمان ہونے سے پہلے کوردو اور مسلمان ہونے کے بعد احمد

لکھا ہے۔ ۱۸۵۰ء ہیٹوم (راموسیوٹوم ۲ ص ۲)

کھول دیتا ہے، ہم اس وقت سے آج تک دین کا بول بالا کرنے اور مذہبِ سلام اور مسلمانوں کے معاملات کی اصلاح کرنے پر مائل رہے یہاں تک کہ والد بزرگوار اور برادر بزرگ کی طرف سے حکمرانی کی نوبت ہم تک پہنچی، اور خدانے اپنی نہر بانی سے ہماری امیدوں کو پورا کیا، اور حکومت و سلطنت ہم کو عنایت کی، پھر قزلبانی (کورتانی) مبارک میں جس سے وہ مجلس مراد ہے، جس میں تمام بھائی بند اور شہزادے اور بڑے بڑے امیر اور فوج کے سردار مشورہ کرنے کے لئے بیٹھتے ہیں، سب مل کر یہ اقرار کیا کہ ہمارے برادر بزرگ کے حکم سے فوج کشی کو جاری کیا جائے، اور ہماری فوجوں میں سے جن کی کثرت سے زمین باوجود وسیع ہونے کے تنگ ہے، اور جن کی صولت اور ہیبت سب کے دل کا پتہ اور تھرتے ہیں، ایک جم غفیر کو اطراف میں روانہ کیا جائے، اور یہ فوج کشی ایسے مضبوط ارادہ کے ساتھ ہو، جس کے سامنے بلند پہاڑ جھک جاویں، اور سنگ خارہ کے چٹان نرم پڑ جاویں، ہم نے اس مقصد پر غور کیا، جس پر ان کے ارادے پختہ اور ان کی رائیں متفق تھیں، اور ان سب کا خلاصہ جو معلوم ہوا، وہ اس عام نمکی کے خلاف تھا، جس کے جاری کرنے کا ہم ارادہ رکھتے تھے، اور جس سے مراد یہ ہے کہ شعارِ اسلام کو زندہ کیا جائے، اور جو احکام ہماری طرف سے جاری ہوں، ان سے خونریزی موقوف ہو، اور دنیا کی مصیبت کم ہو، اور دنیا کے اطراف میں امن و امان کی ہوا چلے، اور تمام شہروں کے حاکم ہماری شفقت اور مہربانی سے آرام پاویں، کیونکہ ہم خدا کی تعظیم کرتے ہیں، اور خدا کی مخلوق پر مہربان ہیں، اس لئے خدانے ہمارے دل میں الہام کیا کہ ہم مشتعل آگ کو بجھائیں، اور فتنہ و فساد کو فرو کریں، اور جن لوگوں نے یہ رائے دی ہے، ان کو اس تدبیر سے مطلع کریں، جس سے دنیا کی بیماریاں اور تکلیفوں کے دور ہونے کی امید ہے، اور جس کو سب سے پہلے عمل میں لانے کی سب سے آخری علاج سے باندھنے کی خدانے ہم کو ہدایت کی ہے، اس لئے ہم پیکانوں کو جنبش میں لانے، اور کمانوں پر چلے چڑھانے میں جلدی نہیں کرتے ہیں، اور جب تک حق بات ظاہر نہ ہو، حجت قوی نہ ہو، ہم اسلام کی اجازت نہیں دیتے، شیخ الاسلام قدوة العارفین کی نصیحت سے جو امور مذہبی میں ہمارے سب سے بہتر مددگار ہیں، ہمارے اس ارادہ کو جو فلاح و بہبودی کی خواہش پر مبنی ہے، اور اس رائے کو جس سے کامیابی کی امید ہے، پختہ اور مصمم کر دیا، چنانچہ ہم نے یہ فرمان

جاری کیا جو ماننے والوں کے لئے خدا کی رحمت اور زمانے والوں کے لئے خدا کا عذاب ہے، ہم نے اس فرمان کے لئے والوں کے لئے قاضی القضاة قطب الدین شیرازی اور تاجک بہا الدین کو جو اس سلطنت کے علمائے روزانہ کیا ہے تاکہ لوگوں کو ہمارے طریقے سے واقف کریں اور تمام مسلمانوں کے فائدہ کے لئے جو بات ہمارے دل میں پوشیدہ ہے، سب اس سے آگاہ ہوں، نیز ان سب لوگوں کو اس بات سے مطلع کریں کہ خدا نے ہم کو بصیرت و ہدایت عطا کی ہے اور اسلام ان تمام گناہوں کو معاف کرتا ہے جو مسلمان ہونے سے پہلے وقوع میں آئے ہوں، اب تو خدا نے ہم کو ہدایت کی ہے کہ ہم حق کی اور اہل حق کی پیروی کریں، پس اگر لوگوں کے دل ایسی دلیل کی جستجو میں ہیں جن سے وہ ہم پر بھروسہ کر سکیں، اور ایسی حجت طلب کرتے ہیں جس سے کامیابی کی امید کر سکیں، تو وہ ہماری ان تمام فضیلتوں پر نظر ڈالیں، جو دنیا میں عام طور پر مشہور ہو چکی ہیں، کیونکہ ہم نے خدا کی عنایت سے دین کے فتانوں کو بلند کیا ہے اور ہر ایک حکم جاری کرنے میں اس امر کو پیش نظر رکھا ہے، اور شرع محمدی کے قوانین کو بلحاظ ان کی عظمت اور بزرگی کے عین مقتضائے انصاف پر جاری کیا ہے، ہم نے تمام رعیت کے دلوں کو خوش کیا ہے اور جن سے پہلے کوئی برائی یا خطا سرزد ہوئی تھی، ان سب کو یہ کہہ کر معاف کر دیا ہے کہ خدا بھی تمہاری اگلی خطاؤں کو معاف کرے، ہم نے مسلمانوں کے اوقات کی جن میں مسجدیں اور مقبرے اور مدرسے شامل ہیں، اصلاح کی ہے، اور تمام خیرات خانوں اور زہان سراؤں کو جن کے نشانات مٹ گئے تھے، دوبارہ آباد کیا ہے، اور اوقات کی آمدنی کو ان کے قدیم دستور اور وقت کرنے والوں کے شرائط کے موافق حقداروں تک پہنچا دیا ہے، ہم نے حکم دیا ہے کہ ہمارے حکام حاجیوں کے معاملہ کو ہمتہم باشان سمجھیں، اور ان کے لئے سامان سفر مہیا کریں، اور جن رستوں سے وہ سفر کرتے ہیں، ان کو آباد و بے خطر رکھیں، اور حاجیوں کے قافلوں کو آرام تمام روانہ کریں، ہم نے تمام سوداگروں کو جو ملک میں آمدورفت رکھتے ہیں، پوری آزادی عطا کی ہے کہ وہ اپنے طریقے سے جس طرح چاہیں سفر کریں، اور فوج اور قزاقوں اور شیخوں کو جو ملک کے اطراف میں مقرر ہیں، سخت ممانعت کی ہے کہ وہ سوداگروں کی آمدورفت میں کسی طرح کی مزاحمت کریں، تاکہ شہر اور ملک

آباد ہوں، نقصان اور فساد فرود ہوں نیز تلواریں میان میں رہیں، اور تمام باشندے آرام و آسائش سے بسر کریں اور مسلمانوں کی گردنیں ذلت و خواری کے طوق سے نکل جائیں۔

”تاریخ مغلیہ کے ناظرین کو ان صد ہا ظلموں اور متواتر کشت و خون کے ہنگاموں کو پڑھنے کے بعد جو غل اور تاتاریوں نے برپا کئے، اس فرمان کے مطالعہ کرنے سے بہت راحت معلوم ہوئی ہوگی، اور تعجب ہوا ہوگا کہ ایک غل فرمانروا کی زبان سے بھی اس قدر فیاضی اور انسانی ہمدردی کے خیالات ادا ہوئے۔“

۱۲۸۴ء میں تگودارا احمد کے خلاف ایک بغاوت برپا ہوئی جس کا سرغنہ ارغون خاں تھا، تگودارا کو اس نے قتل کیا، اور خود مالک تخت و تاج بن گیا، ارغون کے عہد حکومت میں (۱۲۸۴ء تا ۱۲۹۱ء) جو چند سال تک جاری رہا، عیسائیوں پر پھر سلطنت کی طرف سے مہربانی ہوئی اور مسلمانوں کو سختیاں اٹھانی پڑیں اور سرکاری عہدوں اور نوکریوں سے وہ بظرف کر دیئے گئے، ۱۲۹۵ء تک تگودارا کے جانشین اپنے قدیم مذہب شانان کے پیرو رہے، لیکن ۱۲۹۵ء میں البتہ ان کا ساتواں بادشاہ غازان جو خاندان الیمخانیہ کا سب سے زیادہ باہر اور پرسلطوت بادشاہ ہوا، مسلمان ہو گیا، اور اس نے اسلام کو ایران کا شاہی مذہب قرار دیا۔

مسلمان ہونے سے پہلے سلطان غازان کی تعلیم و تربیت بدھ مذہب پر ہوئی تھی، اور خراسان میں اس بادشاہ نے بدھوں کے لئے مندر تعمیر کر دیئے تھے، بدھ مذہب کے عالموں کی صحبت سے وہ بہت خوش ہوتا تھا، اور یہ لوگ جس وقت دولت مغلیہ کو عرض ہوا تھا، ایران میں کثرت سے چلے آئے تھے، سلطان غازان کو مختلف مذہبوں کی تحقیق و تفتیش کا بڑا شوق تھا، اور ہر مذہب کے عالموں سے وہ مذہبی مباحثہ کرتا تھا، غازان کا وزیر اور اس کے عہد کا مورخ حکیم رشید الدین تھا، جس کا یہ خیال غالباً صحیح معلوم ہوتا ہے کہ سلطان غازان سچی نیت اور عقیدہ سے مسلمان ہوا، اور اپنے تمام زمانہ بادشاہی میں وہ اسلام کا نہایت پیروار تھا۔

۱۵ وصاف ۲۳، ۲۳۴ ۵۲ دعوت اسلام ۲۵۱، ۲۵۸ ۵۳ دے گبن ج ۳ ص ۲۶۵، ۲۶۶ ۵۴ دہوسن قوم ۴ ص ۱۴

۵۵ ایضاً ص ۳۶۵ ۵۶ دعوت اسلام ص ۲۵۳

مورخ ابن کثیر نے بھی غازان کے اسلام لانے کا ذکر ۶۹۲ھ کے واقعات میں بڑی مسرت کے ساتھ کیا ہے اور ان کے اور دوسرے مورخین کے بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سہرا نیک دل مسلمان ترک میر تو زون کے سر ہے جن کی تلقین اور سعی سے تاتاری سلطان نے اسلام قبول کیا، ابن کثیر ۶۹۲ھ کے واقعات میں لکھتے ہیں :-

”اس سال چنگیز خان کا پرپوتا قازان بن ارغون بن ایغابن تولدین چنگیز خان تاتاریوں کا بادشاہ ہوا اور امیر تو زون رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر علانیہ مشرف باسلام ہوا اور تاتاری کل یا بیشتر اسلام میں داخل ہو گئے جس روز بادشاہ نے اسلام قبول کیا، اس روز سونا چاندی اور موتی لوگوں کے سر پر بچھا کر رکھے گئے، اس نے اپنا نام محمود رکھا اور جمعہ اور خطبہ میں شرکت کی، بہت سے مندر اور گرجے گرا دیے گئے، اور ان پر جزیہ مقرر کیا بغداد اور دوسرے شہروں اور ملکوں کی غصب کی ہوئی چیزیں واپس کی گئیں اور انصاف کیا گیا، لوگوں نے تاتاریوں کے ہاتھ میں تسبیحیں اور سیاہل (۹) دیکھے اور اللہ کے فضل و احسان کا شکر ادا کیا“

”آرنلڈ لکھتا ہے کہ ۱۳۰۵ء میں غازان کا بھائی سلطان بن محمد خدا بندہ کے نام سے تخت ایران پر بیٹھا، اس سلطان کی ماں عیسائی تھی اور بچپن میں اس کی تعلیم و تربیت بھی عیسوی طریقے سے ہوئی تھی اور نکولس کے نام سے اس نے اصطبارغ پایا تھا، لیکن ماں کے مرنے پر وہ اپنی بیوی کے کہنے سے مسلمان ہو گیا، ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ نکولس خان یعنی سلطان خدا بندہ کے مسلمان ہونے سے مغلوں میں بڑا اثر پیدا ہوا، غرض اس زمانہ سے قلمرو ایغانیہ میں اسلام سب مذہبوں پر غالب آ گیا“

اس خاندان کی تیسری شاخ میں جو بلاد متوسطہ پر قابض تھی اور جس کا بانی چغتائی بن چنگیز خان تھا، اشاعت اسلام کی کیفیت بیان کرتے ہوئے آرنلڈ لکھتا ہے :-

”بلاد متوسطہ میں جو چغتائی ابن چنگیز خان اور اس کی اولاد کے حصہ میں آئے تھے، دعوت اسلام کے حالات

لے آرنلڈ اور دوسرے مورخین اس کو نوروز بیگ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ۵۷۰ البدایۃ والنہایۃ۔ ج ۱۳ ص ۳۴

۵۷ ابن بطوطہ ج ۲ ص ۵۷ دعوت اسلام ص ۲۵۴

کا پتہ کم چلتا ہے اس سلسلہ میں پہلا بادشاہ جس کو نور اسلام کی برکت ملی وہ براق خان تھا جو چغتائی خان کا پرپوتا تھا اور جس نے تخت نشین ہونے کے دو برس کے بعد مسلمان ہو کر سلطان غیاث الدین (۱۲۵۶ء) کا اپنا نام رکھا، لیکن یہاں شروع زمانہ میں اسلام کی ترقی زیادہ عرصہ تک جاری نہ رہ سکی، چونکہ براق خان کے مرنے کے بعد جو مغل مسلمان ہوئے تھے، انھوں نے پھر اپنا قدیم مذہب اختیار کیا، اور چودھویں صدی عیسوی سے پہلے اس حالت کی اصلاح نہ ہو سکی، البتہ مشرق میں خاں جس نے ۱۳۲۲ء سے ۱۳۳۳ء تک سلطنت کی، جس وقت مسلمان ہوا، تو چغتائی مغلوں نے بالعموم اسلام اختیار کر لیا، اور جب ایک فوج انھوں نے اپنے بادشاہ کی طرح اسلام قبول کر لیا تو وہ مضبوط دل سے اس مذہب پر قائم رہے، لیکن اس سال میں بھی اسلام کا اور مذہبوں پر غالب آنا جو حریت مقابل تھے، یعنی امر نہ تھا، کیونکہ مشرق میں کے جانشینوں نے مسلمانوں کے اوپر ظلم و ستم کرنے شروع کر دیے، اور جب تک کا شغر کا بادشاہ جس کی ریاست چغتائیہ سلطنت کی تقسیم و ضعف سے خود مختار ہو گئی تھی، اسلام کی حمایت کو نہ اٹھا، اس وقت تک اسلام کی ترقی ممکن نہ ہوئی، سلطان کا شغر کے مسلمان ہونے کی نسبت جس کا نام تغلق تیمور خاں (۱۳۳۶ء-۱۳۶۳ء) تھا، لکھا ہے کہ بخارا سے ایک بزرگ شیخ جمال الدین کا شغر میں آئے، اور انھوں نے تغلق تیمور کو مسلمان کیا، شیخ جمال الدین اور ان کے ساتھی سفر میں تھے کہ نادانستہ تغلق کی شکاری زمین پر سے ان کا گذر ہوا، بادشاہ نے اس قصور میں ان سب لوگوں کی مشکلیں کسو کر اپنے سامنے طلب کیا، اور نہایت غصہ کی حالت میں ان سے پوچھا کہ تم لوگ کیوں ہماری زمین پر بے اجازت داخل ہوئے، شیخ نے جواب دیا کہ ہم اس ملک میں اجنبی ہیں اور ہم کو مطلق خبر نہ تھی کہ ہم ایسی زمین پر چل رہے ہیں جس پر چلنے کی ممانعت بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ لوگ ایرانی ہیں تو اس نے کہا کہ ایرانی سے تو کتا بہتر ہوتا ہے، شیخ نے کہا کہ سچ ہے، اگر دین برحق ہمارے پاس نہ ہوتا تو فی الحقیقت ہم کتے سے بھی بدتر تھے یہ جواب سن کر تغلق تیمور حیران رہ گیا اور

لے ابو الغازی قوم ص ۱۵۹

حکم دیا کہ جب ہم شکار سے واپس آئیں تو یہ ایرانی ہمارے سامنے حاضر کئے جائیں چنانچہ ایسا ہی ہوا اور بادشاہ نے شیخ جمال الدین کو علیحدہ لے جا کر کہا کہ جو کچھ تم اس وقت کہتے تھے اس کو اب سمجھاؤ، دین برحق سے تمہارا کیا مطلب؟ میں کہ شیخ نے اسلام کے احکام اور ارکان کو ایسے جوش سے بیان کیا کہ تعلق تیمور کا دل جو پہلے پتھر تھا اب موم کی طرح نرم ہو گیا، شیخ نے حالت کفر کا ایسا مہیب نقشہ کھینچا کہ بادشاہ کو اپنی غلطیوں سے اب تک بے بصیرت رہنے کا یقین ہو گیا، لیکن اس نے کہا کہ اگر اس وقت میں اپنا مسلمان ہونا ظاہر کروں گا، تو پھر رعایا کو راہ راست پر نہ لاسکوں گا، اس لئے کچھ عرصہ کے لئے تم سکوت کرو، جب میں اپنے باپ کے تخت اور ملک کا مالک ہوں تو اس وقت تم میرے پاس آنا چنتائیہ سلطنت اب حصہ ہو کر چھوٹی چھوٹی عملداریوں میں تقسیم ہوگی تھی اور برسوں کے بعد تعلق تیمور اس قابل ہوگا کہ ان سب عملداریوں کو شامل کر کے پھر قلم و چنتائیہ کی مثل ایک سلطنت قائم کرے، اس عرصہ میں شیخ جمال الدین اپنے وطن کو چلے گئے، اور یہاں سخت بیمار پڑے، جب موت کا وقت قریب آیا، تو اپنے بیٹے رشید الدین سے کہا کہ تعلق تیمور ایک ن بڑا بادشاہ ہوگا تم اس وقت اس کے پاس جانا، اور میرا سلام پہنچا کر بے خوف و خطر بادشاہ کو یاد دلاؤ تاکہ اس نے مجھ سے کیا وعدہ کیا تھا چند سال کے بعد تعلق نے باپ کا تخت حاصل کر لیا تو ایک ن رشید الدین بادشاہ کے لشکر میں پہنچا کہ باپ کی وصیت کو پوری کرے، لیکن باوجود کوشش کے اس کو خان کے دربار میں حضور نہ ہوئی، آخر کار اس نے مجبور ہو کر یہ تدبیر کی کہ ایک دن علی الصباح تعلق کے خیمہ کے قریب دان کہنی شروع کی، تعلق کی جب نیند خراب ہوئی تو غصہ ہوا، اس نے رشید الدین کو اپنے سامنے بلوایا، رشید الدین آیا اور اپنے باپ کا پیغام تعلق کو سنایا، تعلق کو پہلے ہی سے اپنے وعدہ کا خیال تھا، وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوا، اس کے بعد اس نے اپنی رعایا میں اسلام کی اشاعت کی، اور اس کے زمانہ میں ان تمام ملکوں کا مذہب اسلام ہو گیا، جو چنتائیہ ابن چنگیز خاں کی اولاد کے تسلط میں رہتے تھے۔

بعض ترکی مورخین کی تاریخوں میں یہ روایت اس طرح منقول ہے کہ تعلق تیمور نے اپنے شکار کی

کی طرف اشارہ کر کے کمال حقارت سے شیخ جمال الدین سے پوچھا کہ یہ بہتر ہے کہ تم بہتر ہو، شیخ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ اگر میں دنیا سے ایمان کے ساتھ چلا گیا تو میں بہتر ہوں ورنہ یہ کتاب تعلق تیمور کے دل میں یہ بات چھب گئی، اور اس نے اس کی تفصیل دریافت کی اور پوچھا کہ ایمان کسے کہتے ہیں؟ شیخ نے ایمان کی حقیقت بیان کی، اس پر تعلق تیمور نے اس سے خواہش کی کہ اس کی تخت نشینی کے بعد وہ اس کو اپنی زیارت سے مشرف کریں، اور پھر وہ واقعہ پیش آیا، جو اوپر مذکور ہوا، بہر حال اتنا محقق ہے کہ تعلق تیمور کے اسلام لانے، اور بالواسطہ کاشغرا اور سلطنت چنتائیہ میں اسلام کی اشاعت کا ظاہری سبب شیخ جمال الدین ہیں، جن کے دل سے نکلے ہوئے ایک فقرہ نے اور ان کی قوت ایمانی اور اخلاص و دردنہ وہ کام کیا، جو ہزاروں تقریریں اور لاکھوں شمشیریں نہیں کر سکتیں "جَزَاكَ اللهُ عَنِ الْإِسْلَامِ دُنْيَا خَيْرَ الْجَزَاءِ" چنگیز خاں کی چوتھی شاخ کے متعلق (جس کا بانی اوگتائی خاں تھا، اور جس میں منگو خاں و قوبلائی خاں جیسے نامور فرمانروا گذرے ہیں، اور جو تاتاری سلطنت عظمیٰ کے مشرقی حصہ پر قابض تھی) آرنلڈ لکھتا ہے۔

"تمام سلطنت مغلیہ میں ہر جگہ ایسے مسلمان موجود تھے جو منکرین کو خفیہ طور پر مسلمان کر لیتے تھے، اوگتائی خاں

(۱۲۲۹ء - ۱۲۴۱ء) کے عہد میں حاکم ایران کرگز نامی کا حال لکھا ہے کہ وہ اول بد مذہب کا پیر تھا، پھر

اس نے یہ مذہب چھوڑ کر اسلام اختیار کیا، تیمور خاں کے زمانہ میں (۱۳۲۹ء - ۱۳۳۵ء) خان اندل نے جو قوبلائی خاں

کا پوتا تھا، اور چین میں صوبہ کانسوہ کا حاکم تھا، اسلام قبول کیا، اور تانگوت میں اس نے بہت لوگوں کو مسلمان

کیا، بلکہ جو فوج اس کے تخت میں تھی، اس کے بھی اکثر لوگ مسلمان ہو گئے، تیمور خاں نے اندل خاں کو اپنے

دربار میں بلایا اور کوشش کی کہ اندل خاں اسلام چھوڑ کر بد مذہب قبول کرے، لیکن اس نے انکار کیا

اور قید میں بھیج دیا گیا، تھوڑے عرصہ کے بعد اندل خاں قید سے رہا کر دیا گیا، کیونکہ تانگوت کی رعایا

جس کو اپنے حاکم کے ساتھ بہت الفت تھی، بغاوت پر آمادہ ہو چکی تھی۔

غرض اس طرح پوری تاتاری قوم جس نے پورے عالم اسلام کو پامال کر کے رکھ دیا تھا، اور جس کے سامنے کوئی اسلامی طاقت ٹھہر نہیں سکتی تھی، چند برس کے عرصہ میں اسلام کی حلقہ بگوش بن گئی، اور اسلام نے دوبارہ اس کا ثبوت دیا کہ اس کو اپنے دشمنوں کو تسخیر اور اپنے دام محبت میں اسیر کرنے کی عجیب و غریب قدرت حاصل ہے، تاتاری نہ صرف مسلمان ہوئے، بلکہ ان میں بڑے بڑے مجاہد، بڑے بڑے عالم اور فقیہ اور بڑے بڑے باخدا رویش پیدا ہوئے، اور انھوں نے بہت سے نازک موقعوں پر اسلام کی پاسبانی کا فرض بھی انجام دیا۔

ہے عیاں فتنہ تاتار کے افسانے سے
پاساں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے



مولانا جلال الدین رومیؒ

علم کلام و عقلیت کا بحران

ساتویں صدی میں سارا عالم اسلام علم کلام کے مسائل و مباحث سے گونج رہا تھا، جو شخص علم کلام کی اصطلاحات اور معتزلہ و اشاعہ پھر اشاعہ و حنابلہ کے مختلف فیہ مسائل سے واقف نہیں ہوتا تھا، وہ پڑھا لکھا انسان نہیں سمجھا جاتا تھا، اسی صدی کی ابتدا میں (۷۶۰ھ میں) امام رازی نے انتقال کیا تھا، جنھوں نے علم کلام کا صور اس بلند آہنگی سے پھونکا تھا، کہ اس کی صدائے بازگشت کے علاوہ کوئی آواز سننے میں نہیں آتی تھی، عالم اسلام کے علمی و فکری حلقے استدلال و قیاس کے خوگر تھے، کسی شئی کا وجود، کسی چیز کی حقیقت، دین کا کوئی عقیدہ اس وقت تک قابل تسلیم نہیں سمجھا جاتا تھا، جب تک کہ اس کو عقلی دلائل منطقی ترتیب اور فلسفیانہ مقدمات سے ثابت نہ کر دیا جاتا۔

منکلمین اشاعہ نے عام زندگی میں اگرچہ معتزلہ اور فلاسفہ پر فتح حاصل کر لی تھی، اور ان کے علم کلام کے مقابلہ میں اعتزال و فلسفہ کی آواز پست ہو چکی تھی، لیکن اعتزال کی روح اور عقلیت خود اپنے فاتحین کو مفتوح بنا چکی تھی، اشاعہ کے علم کلام میں معتزلہ کی عقلیت پرستی کی روح سرایت کر گئی تھی، انھوں نے بھی عقل کو اتنی وسعت دے دی تھی کہ وہ ذات و صفات کے نازک اور اورائے عقل (نہ کہ مخالف عقل) مسائل و تفصیلات میں آزادانہ بحث کر سکے، انھوں نے بھی ظواہر و محسوسات کو بڑی حد تک

فیصلہ کن سمجھ لیا تھا، انھوں نے بھی دینی مسائل کے اثبات اور حقائق اشیاء کے وجود کی بنیاد استدلال و قیاس پر رکھی تھی۔

اس کا نتیجہ نکھا کہ تمام عالم اسلام پر ایک لفظی و استدلالی ذوق غالب تھا، علم کلام نقل و نقل ہو کر رہ گیا تھا، جس میں عرصہ سے کوئی جدت پیدا نہیں کی جاسکتی تھی، اس کے حلقہ میں مدتہائے دراز سے امام ابو الحسن اشعری یا حجت الاسلام عزالی صاحب تہذیب اور ذہین و طباع پیدا نہیں ہوئے، قیاس و استدلال کے غلو نے دماغوں کو خواہ کتنی جولانی بخشی ہو، دلوں کی حرارت اور یقین کی روشنی کو نقصان پہنچایا تھا، منکملین نے اپنی قوت استدلال اور مقدمات و نتائج کی آراستگی سے معترضین کی زبانوں کو خاموش کر دیا تھا، لیکن وہ قلوب کو سکینت و ایمان و اہل شک و ارتیاب کو یقین و اذعان عطا کرنے میں ناکام رہے تھے، ان کے اس طریق بحث و استدلال نے دماغوں اور دلوں میں بیسیوں گریں ڈال دی تھیں، جن کو علم کلام سلجھانے سے قاصر تھا، "وہدان" جو علم و یقین کا ایک بہت بڑا سرچشمہ ہے، علم کلام کی مسلسل بے اعتنائیوں بلکہ تحقیر کی وجہ سے بالکل معطل ہوتا جا رہا تھا، ظاہری جو اس خمسہ کے علاوہ کسی اور باطنی حاسہ کا وجود تسلیم نہیں کیا جا رہا تھا، اس لئے بہت سے وہ مسائل و حقائق جو حاسہ باطنی کے بغیر محسوس و معلوم نہیں کئے جاسکتے تھے، محل اعتراض بنے ہوئے تھے، اور ان کے انکار و نفی کا رجحان پیدا ہوتا جا رہا تھا، غرض سارا عالم ایک کلامی بحران میں مبتلا تھا، اور سب پر ایک "عقلی ظاہریت" چھائی ہوئی تھی، امت کی قوت عمل او اس سے بڑھ کر "حرارت عشق" جو اس امت کا سرمایہ اس کی طاقت کا سرچشمہ اور نبوت کا فیضان ہے، سرد ہوتی جا رہی تھی، دل سوز سے خالی اور "حرارت عشق" سے عاری ہوتے جا رہے تھے، فلسفیانہ مباحث اور علم کلام کی معرکہ آرائیوں نے عالم اسلام کو ایک "مدرسہ" میں تبدیل کر دیا تھا، جس میں قیل و قال تو بہت تھی، مگر "زندگی" اور محبت "معرفت" اور نگاہ "نایاب" تھی، اہل قلوب کے روحانی جزیروں میں البتہ عشق کا سرور اور یقین کا نور پایا جاتا تھا، ورنہ عالم کا عالم الفاظ کے طلسم کا گرفتار اور ظواہر و محسوسات کا پرستار تھا۔

صاحب دال متکلم کی ضرورت

ایسی حالت میں عالم اسلام کو ایک ایسی بلند اور طاقت ور شخصیت کی ضرورت تھی، جو دل دردمند اور فکر راجمند دونوں سے فیضیاب ہو، جس کے لئے عقلیات کا سمندر پایاب ہو چکا ہو اور الفاظ و ظواہر کا طلسم ٹوٹ چکا ہو، جو اپنی گرمی عشق اور سوزِ دروں سے اس یخ بستہ عالم اسلام میں زندگی کی نئی حرارت پیدا کر دے اور عقل کے اس نگار خانہ میں عشق کا صورت چھونک دے، جو ایک ایسے نئے علم کلام کی بنیاد رکھے جو دماغوں سے زور آزمائی اور مخالفتین کی زبان بند کی بجائے دماغ کی شکن دور کر دے اور دل کی گره کھولے اور ان کو سکینت و ایمان اور یقین و اطمینان سے بھر دے، شخصیت مولانا جلال الدین رومیؒ (م ۶۷۲ھ) کی تھی، جن کی نثوی علم کلام کی بے اعتدالیوں اور عقل کی ہوس پرستی کے خلاف ایک صدائے احتجاج بلکہ اعلان جنگ ہے، اور ایک ایسے نئے علم کلام کی بنیاد جس کی بدلتے ہوئے عالم اسلام کو سخت ضرورت تھی۔

مختصر حالات

مؤلف "مرآة المثنوی" نے اپنی (غیر مطبوعہ) تصنیف "صاحب المثنوی" میں مولانا کے حالات نہایت تفصیل و تحقیق سے لکھے ہیں، یہاں اس کا خلاصہ درج کیا جاتا ہے۔

لے قاضی تلمذ حسین گورکھپوری مرحوم اس دورِ آخر میں مثنوی اور صاحب مثنوی کے بہت بڑے شیدائی اور محقق عالم تھے، ان کی کتاب "مرآة المثنوی" سے متعلق لٹریچر میں اپنا جواب نہیں رکھتی، "مرآة المثنوی" کے علاوہ (جو طبع ہو کر مقبول ہو چکی ہے) ان کی دو اور مختصانہ تصانیف ہیں، جو ابھی تک طبع نہیں ہوئیں۔ (۱) صاحب المثنوی (۲) نقد المثنوی۔ ان دو کتابوں کی اشاعت "ادبیات رومی" میں ایک گراں قدر اضافہ اور ایک بڑی خدمت ہوگی، صاحب المثنوی دارالمصنفین میں زیر طبع ہے، راقم سطور کو ان کے صاحبزادہ توکل حسین کی عنایت سے اس پیش بہا کتاب سے استفادہ و اقتباس کا موقع ملا، جزاء اللہ خیراً۔

خاندان اور والدین

محمد نام، لقب جلال الدین، شہرت مولانا روم یا مولانا رومی کے لقب سے ہے، آپ کا نسب باپ کی جانب سے نو واسطوں سے حضرت ابو بکر صدیق سے مل جاتا ہے اور ماں کی جانب سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے۔
مولانا کے آباؤ اجداد کرام بلخ واقع خراسان کے رہنے والے تھے، مولانا کی وہیں پیدائش ہوئی مولانا کے پدری و مادری سلسلے میں اجلہ علماء اور سلاطین وقت ہیں، مولانا کی دادی ملکہ جہان شاہان خوارزم کے خاندان سے تھیں۔

مولانا کے والد کا نام محمد اور لقب بہار الدین ولد تھا، ان کی ولادت غالباً ۵۲۳ھ میں ہوئی حضرت بہار الدین ولد نو عمری ہی میں تمام علوم میں کامل و ماہر ہو گئے تھے، آپ کے علم و فضل کی کیفیت یہی کہ اقصائے خراسان سے مشکل فتاویٰ آپ ہی کے پاس آتے تھے، مجلس کا طریق بادشاہوں کا ساتھ، سلطان العلماء، خطاب بھی تھا، معمول تھا کہ صبح سے دوپہر تک درس عام ہوتا، ظہر کے بعد اپنے خاص اصحاب کے حلقہ میں حقائق و معارف بیان فرماتے، دو شنبہ اور جمعہ کو عام وعظ کہتے، ہیبت نمایاں رہتی اور ہمیشہ متفکر معلوم ہوتے۔

مولانا کی پیدائش اور ابتدائی تعلیم

آپ کے صاحبزادہ مولانا جلال الدین رومی ۶ ربیع الاول ۶۰۴ھ کو پیدا ہوئے، سلطان العلماء کے مریدان خاص میں ایک بلند پایہ بزرگ سید برہان الدین محقق ترمذی تھے، سلطان العلماء نے آپ ہی کو مولانا کا اتالیق مقرر فرمایا، اور ۴-۵ سال کی عمر تک مولانا آپ ہی کے زیر تربیت رہے، اور اپنے والد بزرگوار کے انتقال کے بعد آپ ہی کے زیر ہدایت منازل سلوک طے کئے۔

لے حال واقع ملک افغانستان - (ندوی)

والد کی بلخ سے ہجرت

مولانا کے والد ماجد کا اثر حجب زیادہ بڑھا، اور آپ کی دعوت و نصیحت کو حد سے زیادہ قبول عام حاصل ہوا، اور مریدوں کی تعداد بے شمار ہو گئی تو بعض علماء عصر کو رشک ہونے لگا، حضرت سلطان العلماء اپنے وعظ میں مذہب حکمائے یونان کی مذمت فرمایا کرتے کہ کچھ لوگوں نے کتب آسمانی کو پس پشت ڈال رکھا ہے، اور فلسفیوں کے ازکار رفتہ اقوال کو اپنا مسلک بنا لیا ہے، یہ لوگ کیوں کر نجات کی امید کر سکتے ہیں، اس برطانومت سے علماء ظاہر کے دلوں میں آپ کی طرف سے کدورت بٹھ گئی، مگر چونکہ خوارزم شاہ آپ کا نہایت معتقد تھا، ان لوگوں کو شکایت کا موقع نہیں ملتا تھا، اتفاق کہ ایک روز سلطان آپ کی زیارت کو آیا تو دیکھا کہ مجمع نہایت کثیر ہے، ایک عالم سے جو رکاب شاہی میں تھے، مخاطب ہو کر کہا کہ کتنا کثیر مجمع ہے، فاضل مذکور کو موقع ملا، اور کہا کہ اگر اس کی تدبیر نہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ انتظام سلطنت میں خلل واقع ہو اور تدارک مشکل ہو جائے، یہ بات خوارزم شاہ کے دل میں بٹھ گئی، اس نے پوچھا کہ کیا تدبیر کرنا چاہئے، فاضل مذکور نے

لے عام طور پر تذکروں میں ہے کہ یہ مکالمہ امام فخر الدین رازی سے ہوا جو سلطان کے ساتھ تھے، مصنف صاحب المثنوی کی تحقیق ہے کہ یہ ایک تاریخی غلطی ہے، جو منقول چلی آرہی ہے، اس لئے کہ حضرت بہار الدین ولد نے بلخ کو ۶۰۹ھ یا ۶۱۰ھ میں ترک کیا ہے، امام رازی نے ۶۱۰ھ میں اپنے وطن ہرات میں انتقال کیا، جہاں انہوں نے اپنے انتقال سے کئی سال پیشتر سے مستقل قیام اختیار کر لیا تھا۔
مولانا روم کے فاضل سوانح نگار بدیع الزماں فروزانفر جن کی محققانہ کتاب زندگانی و مولانا جلال الدین محمد ابھی ایران سے شائع ہو کر آئی ہے، کی بھی یہی تحقیق ہے کہ یہ روایت تاریخی حیثیت سے ناقابل اعتبار ہے، اور ان کی بنیاد بھی یہی ہے کہ بہار الدین ولد کی ہجرت بقول اکثر سلفیہ کا واقعہ ہے اور امام فخر الدین رازی ۶۱۰ھ میں ہرات میں انتقال کر چکے تھے۔ ملاحظہ ہو ص ۱۵۰۔

قاضی تلمذ حسین مرحوم فرماتے ہیں، ممکن ہے یہ عالم سید بہار الدین رازی ہوں، جو خوارزم شاہ کے مقربین میں تھے، اور

طبقات ناصری ص ۳۳۵ میں ان کا ذکر آتا ہے۔ (ندوی)

یہ صلاح دی کہ خزانہ اور قلعوں کی کنجیاں مولانا کے پاس بھیج کر یہ کہلانا چاہئے کہ جمعیت و کثرت تو سب کچھ جناب کو حاصل ہے ہی میرے پاس امور سلطنت میں سے صرف کنجیاں رہ گئی ہیں، وہ بھی حاضر ہیں۔ اس پیغام کو سن کر آپ نے ارشاد فرمایا کہ سلطان اسلام سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ اس ملک فنا کا یہ تمام خزانہ و دفتینہ ملک و لشکر بادشاہوں کے لائق ہے، ہم درویشوں کو اس سے کیا سروکار؟ میں نہایت خوشی سے سفر کرتا ہوں کہ بادشاہ اپنے اتباع و احباب کے ساتھ یہاں با استقلال سلطنت کرے، جمعہ کو وعظ کہہ کر چلا جاؤں گا۔ ابانی بلخ کو جب یہ حال معلوم ہوا، شہر میں ایک تہلکہ عظیم برپا ہو گیا، خوارزم شاہ سخت متوہم ہوا، قاصد بھیجے، اور رات کو خود مع وزیر کے آیا کہ ارادہ سفر سے باز رہئے، مگر آپ نے قبول نہ کیا، آخر یہ استدعا کی کہ آپ اس طرح روانہ ہوں کہ لوگوں کو خبر نہ ہو، ورنہ سخت فتنہ برپا ہو جائے گا، مولانا نے اس کو منظور فرمایا، جمعہ کو وعظ کہا، اور شنبہ کو بلخ سے بغداد کی طرف روانہ ہو گئے، اس وعظ میں خوارزم شاہ کو متنبہہ کر دیا کہ میرے بعد لشکر تار آ رہا ہے۔

سلطان العلماء بلخ سے اس شان کے ساتھ روانہ ہوئے کہ جس شہر کے قریب پہنچتے تھے، وہاں کے عمائد و علماء شہر سے باہر نکل کر استقبال کرتے اور نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ شہر میں لاتے تھے۔ بغداد کو محظوم دمشق اور مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے آپ ملاطیہ پہنچے، آقشہر میں آپ نے چار سال قیام فرمایا، اور درس و تدریس میں مشغول رہے، آقشہر سے لارندہ تشریف لائے، جو توابع قونیہ سے تھا۔

مولانا قونیہ میں

علاء الدین کی قباد سلطان روم کی خواہش و درخواست پر آپ ۶۲۶ھ میں قونیہ تشریف لے گئے،

لے بدیع الزمان فروز النفر کا رجحان یہ ہے کہ بہاء الدین ولد کی ہجرت کا اصل سبب تاریخوں کا عدم خراسان ایران تھا، اس اطلاع سے بڑے بڑے خاندان شرفاء و علماء ترک وطن کر رہے تھے، اور محفوظ مقامات کی طرف رخت سفر باندھ رہے تھے، ملاحظہ ہو۔ ص ۱۵ (ندوی)

سلطان نے خود استقبال کیا، محل کے قریب گھوڑے سے اتر پڑا، اور بڑی فروتنی کا اظہار کیا، آپ نے مدرسہ قونیہ میں قیام فرمایا، سلطان مع اکثر امراء کے مرید ہو گیا۔

حضرت بہاء الدین ولد نے قونیہ میں دو برس قیام کے بعد ۶۲۸ھ میں انتقال فرمایا۔

اس تمام مدت میں مولانا ہمیشہ اپنے والد کے ہمراہ رہے، اور علوم ظاہری و باطنی آپ سے حاصل کرتے رہے، ۲۲ برس کے سن میں آپ شہر (قونیہ) میں وارد ہوئے، جو آئندہ آپ کا مسکن و مدفن بننے والا تھا۔ قونیہ میں سلطان کے اتالیق امیر بدر الدین گہر تاش نے آپ کے تبحر علمی اور خداداد ذہانت سے متاثر ہو کر آپ کے لئے مدرسہ خداداد تعمیر کیا، اور اس کے لئے بہت بڑا وقت کیا۔

سلطان علاء الدین کی قباد آپ کی بڑی تعظیم کرتا تھا، اور آپ سے بڑی عقیدت رکھتا تھا، سلطان نے جب قونیہ کا قلعہ تیار کیا تو ایک روز آپ سے سیر کی درخواست کی، آپ نے فرمایا کہ دفع سیل و منح خیل کے لئے اچھا ہے، مگر مظلوموں کی تیر دعا کا کیا علاج آپ نے سوچا ہے، جو ہزاروں لاکھوں بروجوں سے گذر جاتی، اور عالم کو خراب کر ڈالتی ہے، عدل و انصاف کا قلعہ بنائیے کہ اس میں دنیا کا امن اور عافیت کی خیر ہے، سلطان پر اس نصیحت کا بڑا اثر ہوا۔

مولانا بہاء الدین ولد کے انتقال کے بعد سلطان وقت اور علماء و اکابر کے اتفاق رائے سے آپ مولانا کے جانشین ہوئے، اور آپ نے سلسلہ درس و تدریس اور تلقین و ارشاد کو بدستور جاری رکھا، امیر برہان الدین محقق ترمذی جو آپ کے اتالیق رہ چکے تھے، اور ترمذ کو چلے گئے تھے، مولانا بہاء الدین ولد کے انتقال کے بعد قونیہ تشریف لائے، مولانا آپ کے مرید ہو گئے، اور اپنے والد ماجد کے بعد مراتب سلوک آپ ہی سے طے کیے، ۹ برس مولانا کی آپ سے صحبت رہی، ۶۲۹ھ میں انھوں نے انتقال کیا۔

آپ کے تعلیمی سفر اور مشاغل

۶۳۰ھ میں مولانا نے مزید تکمیل علوم و اکتساب فیض کے لئے شام کا سفر کیا، اور حلب میں وارد ہوئے،

سلطان صلاح الدین کے فرزند الملک لظاہر نے قاضی بہاء الدین ابن شداد کی تحریک سے جو اجلہ علماء میں سے تھے، ۵۹۱ھ میں متعدد بڑے بڑے مدرسے قائم کئے تھے جس کی وجہ سے حلب بھی دمشق کی طرح مدینۃ العلوام بن گیا تھا۔

حلب میں مولانا مدرسہ صلاویہ میں قیام پذیر ہوئے اور کمال الدین ابن العدیم سے استفادہ کیا مولانا یہاں اگرچہ تحصیل علم میں مشغول تھے، مگر آپ کے کمال کا یہ حال تھا کہ بقول سپہ سالار جو مشکل مسائل کسی سے حل نہ ہوتے تھے، وہ آپ ہی حل کرتے تھے اور ایسے وجوہ بیان کرتے تھے، جو کسی کتاب میں درج نہ ہوتے۔

حلب سے مولانا دمشق تشریف لے گئے، یہاں آپ نے مدرسہ مقدسیہ میں قیام فرمایا، دمشق اس وقت مجمع علماء تھا، سپہ سالار نے لکھا ہے کہ دمشق میں شیخ محی الدین ابن عربی، شیخ سعد الدین حموی، شیخ عثمان رومی، شیخ اوحہ الدین کرمانی، شیخ صدر الدین قنوی سے مولانا کی صحبت رہا کرتی، اور باہم دگر حقائق و معارف بیان ہوتے تھے۔

۶۳۵ یا ۶۳۶ھ میں آپ نے دمشق سے واپس آ کر قونیہ میں مستقل قیام اختیار کیا، سید بہان الدین کے انتقال (۶۳۷ھ) کے بعد ۵ سال تک آپ علماء ظاہر کے لباس میں رہے اور علمی و تدریسی مشاغل میں ہمہ تن مہمک رہے، ۶۳۸ھ میں شیخ محی الدین ابن عربی نے انتقال کیا، جو بزم علم آپ کے گرد جمع تھی اس کے اکثر افراد قونیہ میں آ گئے، جن میں شیخ صدر الدین بھی تھے، مشرق کی طرف سے جو علماء و فضلاء وہاں کی تباہیوں سے پریشان ہو کر روم کا رخ کرتے تھے، وہ بھی اکثر قونیہ کو اپنا لجا و ماویٰ بناتے، اس طرح قونیہ اس زمانہ میں مدینۃ العلماء بن گیا، اور ان علماء میں مولانا کی حیثیت سب سے بلند تھی، اس زمانہ میں مولانا کے وہی اشغال تھے، جو علماء ظاہر کے ہوتے ہیں یعنی درس و تدریس، وعظ و تذکیر اور فتاویٰ نویسی، مولانا بہت زیادہ وقت مشغول تدریس میں صرف کرتے، خود آپ کے مدرسہ میں چار سو سے زیادہ طلبہ تھے۔

درس و تدریس کے علاوہ مولانا کا دوسرا مشغول یا فرض وعظ کہنا تھا، فتویٰ نویسی کا مشغول بھی مستقل

تھا، بیت المال سے مولانا کے لئے ایک دینار مقرر تھا، اسے اسی فتویٰ نویسی کا معاوضہ تصور فرماتے تھے اور اس معاملہ میں اس قدر سخت تھے کہ جب فقر کارنگ غالب ہوا، اور مجلس میں مستغرق رہنے لگے اس وقت بھی حکم تھا کہ جس وقت کوئی فتویٰ آئے فوراً خبر کی جائے، قلم و دوات ہمہ وقت ساتھ رہتا تھا۔

انقلاب حال

یہ حالت ۶۴۲ھ تک قائم رہی، اس کے بعد مولانا کی زندگی میں وہ واقعہ پیش آیا، جس نے زندگی میں انقلاب عظیم پیدا کر دیا، اور مولوی جلال الدین قنوی کو مشہور روزگار مولانا کے روم بنا دیا، یہ واقعہ مولانا کی شمس تبریزی سے ملاقات اور ان کی ذات سے شفقتگی و فناءیت تھی۔

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم تا غلام شمس تبریزی نہ شد

شمس تبریزی

(محمد بن علی بن ملک داد) شمس تبریزی کا نسب اور وطن کیا تھا؟ آپ کے مخالفین نے جہاں اور الزامات آپ پر لگائے تھے، وہاں ایک الزام یہ بھی تھا کہ آپ کا نسب نامہ معلوم ہے۔

نے دراصل و نے نسب پیدا است می نہ دانیم ہم کہ اوز کجا است

آپ بچپن سے اعلیٰ استعداد اور جذبہ عشق و محبت کے حامل تھے، مناقب العارفین میں خود آپ ہی کی زبانی منقول ہے کہ ابھی سن بلوغ کو بھی نہیں پہنچے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں

لے بعض تاریخوں میں ہے کہ آپ حسن بن صباح اسماعیلی کے جانشین و رفیق و طریق کیا بزرگ میدکی نسل سے تھے، ان کے والد جلال الدین جن جب منصب امامت پر فائز ہوئے تو انھوں نے اپنے بزرگوں کا طریقہ ترک کر کے صحیح اسلامی عقائد اختیار کئے، اور نوسل

کے لقب مشہور ہوئے، لیکن یہ روایات مشتبہ اور قابل بحث ہیں، ملاحظہ ہو زندگانی مولانا جلال الدین محمد ۵۲۵ھ (۵۲۵ھ)

تیس تیس چالیس چالیس روز تک آپ کو غذا کی خواہش نہیں ہوتی تھی، علوم ظاہری سے فارغ ہونے کے بعد آپ شیخ ابو بکر سلیمان کے مرید ہوئے، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ شیخ زین الدین سنجاسی کے مرید تھے، بعض روایتوں میں دوسرے نام لئے گئے ہیں، ممکن ہے آپ نے سب سے اکتساب فیض کیا ہو۔

جب آپ کو اس طرح سیری نہ ہوئی تو آپ اطراف عالم میں مردانِ خدا کی تلاش میں پھرنے لگے، یہ سفر اس طرح کرتے تھے کہ خود آپ کی ولایت و کمال سے لوگ آگاہ نہیں ہوتے تھے، ندریاہ پہنچتے، اور جہاں جاتے سرانے میں قیام کرتے، دروازہ میں قیمتی قفل لگا دیتے کہ لوگ سمجھیں کہ کوئی بڑا تاجر ہے، مگر اندر سوائے بوریہ کے کچھ نہ ہوتا، کثرتِ سفار کی وجہ سے لوگ آپ کو شمس پرندہ کہنے لگے تھے، تبریز، بغداد، اردن، الروم، قیصریہ و دمشق کا سفر فرمایا، معاش کا یہ طریقہ تھا کہ ازار بند بن لیا کرتے، اور اسی کوچ کر کام چلاتے تھے، غذا کی کیفیت یہ تھی کہ دمشق میں ایک برس رہے، ہفتہ میں ایک پیالہ سری کا شوربا اور وہ بھی بے روغن پی لیا کرتے، کسی کو اپنی صحبت کا متحمل نہیں پاتے تھے، اکثر یہ دعا فرماتے کہ خدایا کوئی رفیق ایسا عطا کر جو میری صحبت کا متحمل ہو۔

مولانا کی ملاقات اور تغیر عظیم

آپ کے شیخ نے آپ سے فرمایا کہ روم جاؤ، وہاں ایک دل سوختہ ہے، اسے روشن کر آؤ، دو شنبہ ۲۶ جمادی الاخریٰ ۶۴۲ھ کو قونیہ پہنچے، اور شکر فروشوں کے محلہ میں قیام فرمایا، ایک روز دیکھا کہ مولانا سوا چلے آئے ہیں، اور لوگ گرد و پیش استفادہ کر رہے ہیں، شمس نے آگے بڑھ کر پوچھا کہ ریاضات و علوم کی غرض کیا ہے؟ مولانا نے کہا آداب و شریعت کا جاننا، شمس نے کہا نہیں، غرض یہ ہے کہ معلوم تک رسائی ہو جائے اور حکیم سنائی کا یہ شعر پڑھا ہے

لے بدیع الزماں فروزا نے بجائے زین الدین سنجاسی کے رکن الدین سنجاسی لکھا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ سنجاس، زنجان کے توابح میں سے ہے، صلاہ، لیکن تاریخی حیثیت سے ان کو اس روایت کی صحت میں کلام ہے، (ندوی)

علم کر، تو ترانہ بستاند، جہل ازاں علم بہ بود بسیار، مولانا اس سے متغیر و متحیر ہوئے، اور تیر نشانہ پر بیٹھا۔

مولانا حضرت شمس کو ہمراہ لے کر اپنے مقام پر آئے، اور بقول افلاک چالیس روز تک حضرت شمس کے ساتھ ایک حجرہ میں رہے، جس میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا تھا، سپہ سالار نے لکھا ہے کہ چھ ماہ تک صلاح الدین زکوب کے حجرہ میں دونوں بزرگ عزت نشین رہے، سوائے شیخ صلاح الدین کے کسی کی مجال نہ تھی کہ حجرہ میں داخل ہو سکے۔

شمس کی ملاقات نے مولانا کو نئی روح اور حقائق و اذواق کی نئی دنیا عطا کی وہ خود فرماتے ہیں۔

شمس تبریزی بارہ حقیقت بنمود، باز فیض قدم اوست کہ ایماں داریم

ابھی تک مولانا اساتذہ دوراں تھے، اور خود صاحبِ سجادہ تھے، اور علماء و طلبہ و صوفیہ مستفیدہ طالب، اب مولانا مستفیدہ طالب تھے، اور شمس تبریزی صاحبِ فیض و ارشاد، مولانا کے صاحبزادہ سلطان ولد فرماتے ہیں۔

شیخ استاذ گشت نو آموز، درس خواندی بخدش ہر روز

گرچہ در علم فخر کامل بود، علم نو بود کو بوسے بہ نمود

خود مولانا اپنی زبان سے فرماتے ہیں۔

زاہد بودم تر نہ گویم کردی، سرفتنہ بزم و بادہ جویم کردی

سجادہ نشین باوقارے بودم، بازیچہ کو دکان کویم کردی

نتیجہ یہ ہوا کہ شمس کی ملاقات کے بعد مولانا نے درس و تدریس، و عظ گوئی وغیرہ سب یک قلم

لے صاحب المثنوی کی مختلف روایات میں سے اس روایت کو انتخاب کیا گیا ہے، یہ روایت تذکرہ دولت شاہ کی ہے، ۱۹۶، ۱۹۷

فروزا نے اس سلسلہ کی تمام روایات کو نقل کر کے ان سے بے اطمینانی کا اظہار کیا، اور شمس سے مولانا کے تاثر و فیض کی سبب کسی ایسا تک اقدار صرف کو قرار نہیں دیا بلکہ مردانِ خدا کی تلاش عشق و اہل عشق سے مولانا کی مناسبت فطری کو قرار دیا ہے، ملاحظہ فرمائیں مولانا کی جلال الدین محمد غفرانی (ندوی)

ترک کر دی، خود فرماتے ہیں ۷

عطار دوار دفتر پارہ بودم ز دشت اوزمانے می نشستم
چو دیدم نوح پیشانی ساقی شدم مست و قلم ہارا شکستم

شورش عام

مولانا جب اس طرح ہربات میں حضرت شمس کی پیروی کرنے لگے اور تمام تعلقات منقطع ہونے لگے تو یہ امر مولانا کے شاگردوں اور مریدوں پر سخت شاق گذرا، ایک شورش کی سی کیفیت پیدا ہو گئی، ایک برس ہی کے ساتھ گونہ حیرت بھی شامل تھی، شمس کے حالات سے لوگ واقف نہ تھے، مریدوں کا خیال تھا کہ ہم نے عمریں مولانا کی خدمت میں گذاریں، مولانا کی کرامتوں کو دیکھا، تمام اطراف و اکناف میں آپ کی شہرت کا باعث ہوئے، اب ایک بے نام و نسب شخص آیا، اور مولانا کو سب سے الگ کر لیا کہ آپ کی صورت تک دیکھنا نصیب نہیں ہوتی، درس و تدریس و عظ سب بند ہو گئے، ضروری کوئی ساحر یا مکار شخص ہے، ورنہ اس کی کیا ہستی ہے کہ ایسے پہاڑ کو تنگ کی طرح بہا لے جائے۔

غرض سب کے سب شمس کے دشمن ہو گئے، مولانا کے سامنے کچھ نہ کہہ سکتے تھے، ادھر ادھر ٹل جاتے تو برا بھلا کہتے، اور رات دن اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتے کہ کسی طرح حضرت شمس کو وہاں سے نکالیں کہ پھر حسب سابق مولانا کی صحبت سے فیض یاب ہو سکیں۔

شمس کی غیبت

حضرت شمس الدین ان لوگوں کی گستاخیوں کا تحمل کرتے رہے، اور سمجھتے رہے کہ مولانا کی وفور عقیدت

کی وجہ سے یہ لوگ اس طرح آزرده ہیں، مگر جب معاملہ حد سے تجاوز کر گیا، اور آپ نے سمجھ لیا کہ اب انجام اس کا

فقہ و فساد پر ہوگا، تو آپ ایک ن خاموشی کے ساتھ قونیہ سے نکل گئے، افلاکی نے اس غیبت اول کی تاریخ روز

پنجشنبہ کم شوال ۶۵۳ھ دی ہے، اس طرح بار اول قونیہ میں آپ کا قیام سوارس رہا۔

شمس کی جدائی مولانا پر سخت شاق گذری، مریدوں نے جو کچھ سوچا تھا، اس کے برعکس واقع ہوا، اس کے

بجائے کہ شمس کے چلے جانے کے بعد مولانا ان لوگوں کی طرف متوجہ ہوتے، جو کچھ تو جہتھی، وہ بھی جاتی رہی، اور

ان ناقصوں کی وجہ سے اصحاب صدق و وفا بھی مولانا کی صحبت سے محروم ہو گئے۔

مولانا کی بقراری اور شمس کی واپسی

بقول سپہ سالار انقطاع کلی کی یہ حالت اس وقت تک قائم رہی کہ دمشق سے شمس الدین کا خط اچانک

مولانا کے نام آیا، اس خط کے پانے کے بعد مولانا کی کچھ حالت بدلی، اور شمس کے شوق و عشق میں سماع کی جانب

متوجہ ہوئے، اور جن لوگوں نے حضرت شمس کے خلاف حرکات میں شرکت نہیں کی تھی، ان پر حسب سابق عنایت

فرمانے لگے، اس عرصہ میں مولانا نے حضرت شمس کی خدمت میں چار منظوم خطوط لکھے جن میں اپنی کیفیت اور

اشتیاق ملاقات کی بیباکی کا ذکر کیا ہے، پہلے نامہ شوق میں فرماتے ہیں ۷

ایہا النور فی الفواد تعال غایۃ الوجد والمواد تعال

ایہا السابق الذی سبقت منک صدوقۃ الوداد تعال

چوں بیباکی زہے کشاد و مراد چوں نیباکی زہے کساد تعال

انت کا شمس اذ دنت و نأت یا قریبا علی البعاد تعال

اس اثنا میں شورش بہت کچھ فرو ہو گئی، اطمینان ہو جانے کے بعد کہ اب لوگوں نے شمس کی مخالفت

ترک کر دی ہے، مولانا نے شمس کو واپس بلانے کی تدبیر کی، صاحبزادہ سلطان ولد سے فرمایا کہ تم میری طرف سے

اس شاہ مقبول کی طرف جاؤ، اور یہ لے جا کر ان کے قدموں پر نثار کرو، اور میری جانب سے کہو کہ جن

مریدوں نے گستاخی کی تھی، وہ سب صدق دل سے توبہ کرتے، اور التجا کرتے ہیں کہ جو خطا ہوئی درگزر فرمائیں، اور اس جانب قدم رنجہ فرمائیں، ان کے ہاتھ جو نیا زنا نہ بھیجی اس میں اس مفارقت سے اپنی حالت بیان کرتے ہیں۔

کہ ازاں دم کہ تو سفر کر دی
از حلاوت جدا شدیم چو موم
ہم شب چو شمع سے سوزیم
ز آتش جفت وز انگبیں محروم
در فراق جمال تو مارا
جسم ویران و جان ازویوں بوم
ہاں عنان را بدیں طرف برتاب
زفت کن پیل عیش را خرطوم
بے حضورت سماع نیست حلال
ہمچو شیطان طرب شدہ مرحوم
یک غزل بے تو ہیچ گفتہ نشد
تار سید آں مشرفہ مفہوم
پس بدوق سماع نامہ تو
غزل پنج و شش بشد منظوم
شام از تو چو صبح روشن باد
اے بتو فخر شام وارمن و روم
سلطان ولد حضرت شمس کو عزت و احترام شاہانہ کے ساتھ قونیہ لائے۔

شمس کی دوبارہ غیبت

حضرت شمس کے قونیہ پہنچنے پر مولانا کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی جن لوگوں سے گستاخیاں سرزد ہوئی تھیں، سب نے آ کر معافی مانگی، ایک مدت تک یہ صحبت بے کدورت اسی طرح برقرار رہی اس اثنا میں شمس کے ساتھ مولانا کا اخلاص و اتحاد پہلے سے زیادہ بڑھتا گیا، مگر اس دورِ ختمی کو زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ پھر آزدگی کے اسباب پیدا ہو گئے، حضرت شمس کا قیام مولانا کے تابخانہ کے قریب ہی دالان "صف" میں ایک طرف تھا، شمس وہاں اپنی اہلیہ کے ساتھ جن سے قونیہ میں عقد ہوا تھا، مقیم تھے، مولانا کے منجھلے صاحبزادہ (چلی علی علاء الدین) جب مولانا کے گھر جاتے تو اسی طرف سے ہو کر گذرتے، مولانا شمس الدین

کو یہ بات ناگوار ہوتی، کسی مرتبہ مشفقانہ طور پر سمجھایا، علاء الدین کو یہ بات شاق گزری، ان کے دل میں کچھ اس بات سے بھی کدورت تھی، کہ حضرت شمس الدین سلطان ولد پر زیادہ نظر عنایت رکھتے ہیں، اس کا چرچا لوگوں سے بھی کیا، جو لوگ اس قسم کے موقع کے منتظر تھے، انھوں نے اور بھی حاشیے چڑھائے اور کہنے لگے کہ یہ بھی خوب ہے کہ ایک بیگانہ نے آ کر مولانا کے مکان پر قبضہ کر لیا ہے، اور فرزند کو گھر میں آنے نہیں دیتا۔

حضرت شمس الدین نے محض لطف و حلم کی وجہ سے مولانا سے اس کا کچھ ذکر نہیں کیا، مگر جب معاملہ حد سے گزر گیا تو سلطان ولد سے برسبیل حکایت یہ فرمایا کہ ان لوگوں کے حرکات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مرتبہ میں اس طرح غائب ہوں گا کہ پھر کسی کو پتہ نہ چلے گا، مولانا کی بعض غزلوں سے مترشح ہوتا ہے کہ مولانا ابھی بالکل اس سے بے خبر نہ تھے، بلکہ ان کو اس کا اندیشہ تھا، اور انھوں نے اشعار میں اس سے باز رہنے کی منت سماجت کی ہے۔

بہر حال لوگوں میں حضرت شمس الدین کے خلاف خیالات پھر عیوش زن ہو گئے تھے، اور آپ خود ہی آزدہ خاطر ہو گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ آپ دفعۃً غائب ہو گئے۔

ناگہان گم شد از میان ہمہ تار و داز دل اندبان ہمہ

مولانا کی بتیابی

مولانا جب صبح کو مدرسہ تشریف لائے، اور شمس کو گھر میں نہ دیکھا تو چیخ اٹھے، اور سلطان ولد

لے بعض لوگوں نے کہا ہے کہ قونیہ میں کچھ لوگوں نے حضرت شمس کو قتل کر دیا، اور مولانا نے فرمایا "بِقَوْلِ اللَّهِ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ مَا يُؤْتِي" لیکن فرزند انفر نے غیبت کی اسی روایت کو ترجیح دی ہے کہ سلطان ولد کے قریب تر اور حالات سے باخبر تھے ان کی روایت اس باب میں سب سے زیادہ قابل اعتماد ہے اس لئے شمس کے قتل کی روایت قابل اعتبار نہیں، اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اگر شمس قتل کر دیے گئے ہوتے، اور مولانا کو اس واقعہ کا علم ہوتا، تو ان کی تلاش میں یہ سرگردانی نہ ہوتی (زندگانی صفحہ ۸۴-۸۳) (مدوی)

کے خلوت خانہ پر جا کر آواز دی "بہا، الدین چہ خفتہ؟ بر خیز و طلب شیخت کن کہ باز شام جان را از فواج

لطف او خالی می یابیم"

دو تین روز ہر طرف جستجو کرتے رہے، مگر کہیں حضرت شمس کا پتہ نہ چلا، اس مرتبہ شمس کی غیبت سے مولانا کا حال پہلے سے بھی زیادہ متغیر ہو گیا۔

شیخ گشت از فراق او مجنون بے سرو پا ز عشق او چو ذوالنون

جو لوگ حضرت شمس کی آزدگی کا باعث ہوئے تھے، مولانا نے ان سب کو قطعاً اپنی صحبت سے خارج کر دیا، لیکن سابق کے برخلاف اس مرتبہ اپنے غزل گوئی اور سماع میں اپنا وقت صرف کرنا شروع کیا، یہ ۱۲۴۵ھ کا واقعہ ہے۔ حضرت شمس کے غائب ہو جانے کے بعد مولانا نے دو روز ہر طرف آپ کی تلاش کی، مگر جب کسی طرح آپ کا کچھ پتہ نہ چلا، تو مولانا کی حالت متغیر ہونا شروع ہوئی، طریقی سماع تو آپ پہلے ہی اختیار کر چکے تھے، اب یہ حالت ہوئی کہ ایک دم سماع کے بغیر نہیں گزارتا تھا، مدرسہ میں ٹہلا کرتے تھے اور آشکار و نہان شور و فریاد کرتے تھے، تمام شہر میں غلغلہ مچ گیا، اسی زمانہ میں مولانا نے حضرت شمس کے فراق میں بہت کثرت سے اور نہایت ہی دل دوز غزلیں کہیں، آپ کی درد انگیز فراقیہ غزلیں زیادہ تر اسی زمانہ کی ہیں۔

اس تمام جان گدازی و بے قراری کے باوجود مولانا کے دل سے یہ خیال محو نہ ہو سکا کہ رومیوں کی خانہ جنگی، مصریوں کی ترک تازی اور تاتاریوں کی تاراجی کے باعث سارا ملک تہ و بالا ہو رہا ہے، معلوم نہیں، اس عالم آشوب میں حضرت شمس پر کیا گزری؟!

شمس الدین کے غائب ہو جانے کے بعد آپ کے اشتیاق میں مولانا کا یہ حال تھا کہ اگر کوئی شخص جھوٹوں بھی کہہ دیتا کہ میں نے حضرت شمس کو فلاں جگہ دیکھا ہے تو مولانا باس تک اتار کر اس کی نذر کر دیتے، شکرانہ دینے، اور بہت کچھ اظہار شکر کرتے۔

سفر شام اور سکون خاطر

اسی جوش و خروش کے عالم میں مولانا نے سفر کا ارادہ کیا، اور شام کی طرف روانہ ہو گئے، آپ کے اصحاب بھی آپ کے ساتھ چل کھڑے ہوئے، اسی طرح دمشق پہنچے، اور وہاں بھی لوگوں کے دلوں میں آتش عشق بھڑکادی، تمام لوگ حیران تھے کہ ایسا عالم و فاضل شخص کیوں اس طرح دیوانہ ہو رہا ہے، شمس تبریزی کیا چیز ہیں، جو کہ ایسا فرد فریدان کے پیچھے یوں مارا مارا پھر رہا ہے، یہ راز کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ جب دمشق میں شمس کا کچھ پتہ نہ چلا، اس وقت مولانا نے فرمایا کہ میں اور شمس دو نہیں ہیں، وہ اگر آفتاب ہیں تو میں ذرہ ہوں، وہ اگر دریا ہیں تو میں قطرہ ہوں، ذرہ کی ہستی آفتاب ہی سے ہے اور قطرہ کی تری دریا ہی سے ہے، بس فرق کیا ہوا، چند روز بعد آپ نے شام سے روم کی جانب مراجعت فرمائی۔

چند برس قونیہ میں قیام فرمایا، مگر پھر عشق نے جوش کیا، اور کچھ لوگوں کو لے کر دمشق کی طرف روانہ ہوئے اور آخر پھر... قونیہ تشریف فرما ہوئے، اور اس مرتبہ یہ خیال لے کر آئے کہ میں خود عین شمس ہوں، شمس کی جستجو کیا تھی، درحقیقت خود اپنی ہی جستجو کر رہا تھا، اس مرتبہ قونیہ اس خیال کے ساتھ واپس آئے کہ شمس میں جو کچھ تھا، وہ خود مجھ میں موجود ہے۔

اس مرتبہ دمشق سے واپس آنے کے بعد مولانا حضرت شمس کے ملنے سے بالکل مایوس ہو گئے تھے، مگر جس کیفیت کو آپ شمس میں ملاحظہ فرماتے تھے، اسے اب خود اپنے میں ملاحظہ فرمانے لگے، سلطان ولد کے الفاظ ہیں کہ "اگرچہ مولانا قدس اللہ سرہ شمس الدین تبریزی و اعظم اللہ ذکرہ بصورت درد عشق نیافت یعنی در خود بیافت زیراں حال کہ شمس الدین را بود حضرتش را ہماں حاصل شد"

شیخ صلاح الدین زرکوب

دمشق سے دوسری مرتبہ واپس آنے کے بعد مولانا کچھ دنوں ساکن رہے، اس کے بعد آپ نے شیخ

صلاح الدین کو اپنا ہمراز و خلیفہ بنایا، ۶۴۴ھ میں آپ نے ان کو اپنا جلیس خاص بنایا، اور حضرت شمس الدین کے بجائے ان کو اپنا معین و مساز قرار دیا۔

شہ صلاح الدین زبجد شمس دین گشت اور اندریں درزش معین
حال و قالش از وجودش می فرود سرباے نادر ازوے می شنود

شیخ صلاح الدین قونیہ کے قریب ایک گاؤں کے رہنے والے تھے، غریب الدین کی اولاد تھے، جو ماہی گیری کیا کرتے تھے، خود شیخ صلاح الدین نے زرکوبی کا پیشہ اختیار کیا، ابتدائے حال سے امانت و دیانت میں مشہور تھے، سید برہان الدین جب قونیہ آئے تو آپ ان کے مرید ہو گئے، اور ان کی نظروں میں اختصاص خاص پیدا کیا، سید کے انتقال کے بعد مولانا سے تجدید بیعت کی، انتقال سے دس برس قبل مولانا سے آپ کو وہ قرب حاصل ہوا، اس دس سالہ مدت میں آپ مولانا کے خلیفہ خاص رہے، شیخ نے یکم محرم ۶۵۷ھ میں انتقال فرمایا۔

لوگوں میں اس قرب اختصاص سے پھر شورش پیدا ہوئی، اب لوگوں کو شکوہ تھا، کہ ان سے تو شمس تبریزی ہی بہتر تھے، وہ بہر حال صاحب علم تھے، یہ صاحب تو ہیں کہ رہنے والے ہیں، سب جانتے ہیں کہ ایک عامی آدمی ہیں، عمر بھر ورق کوٹتے رہے، اب مولانا کے رفیق بنے ہیں، حیرت ہے کہ مولانا اس رتبہ اور پایہ کے باوجود ایسے شخص کی تعظیم و تکریم میں یہ مبالغہ کرتے ہیں، شیخ نے سنا تو فرمایا کہ لوگوں کو ملال اس کا ہے کہ مولانا نے مجھے سب میں مخصوص کر لیا، مگر اصل بات کو نہیں سمجھتے کہ مولانا خود اپنے پر عاشق ہیں، میں تو محض ایک حیلہ ہوں۔

لے فروزا نگر لکھتا ہے "مولانا از دیدار شمس نوید گشت تمامی دل و ہنگی ہمت رفتے در صلاح آورداد را شیخی و خلیفتی" و سر لشکری جنود اللہ منصوب فرمود و یاران را باطاعت سے مامور ساخت "۹۳ (ندوی) لے بدیع الزماں فروزا نگر "زندگانی مولانا جلال الدین" میں لکھتا ہے "مولانا کو جوری چشم منکران خود دیدہ بر صلاح الدین گماشت وہاں عشق و دل بانگ کی کہ با شمس داشت باے بنیاد نہاں و از انجا کہ صلاح الدین مرفے و رام و نرم و جذب و ارشادش بنوع دیگر بود شورش و انقلاب مولانا آرام تر گردید و از بے قراری بقرار باز آمد و برائے لشکستن خمار ہجران شمس از پیمانہ وجود و طلب ہائے سبکی نوشید" ۱۰۲-۱۰۳

دش برس کی خدمت و صحبت کے بعد شیخ ناگہاں بیمار ہوئے اور یکم محرم کو نہایت طمانیت قلب کے ساتھ اس دار غرور سے داسرور کی طرف سفر کیا۔

چلیپی حسام الدین

شیخ صلاح الدین کے انتقال کے بعد مولانا نے چلیپی حسام الدین ابن انخی ترک کو اپنا نائب اور خلیفہ بنایا، چلیپی حسام الدین مولانا کے ممتاز مریدوں میں سے تھے، اور مولانا کے انتقال کے بعد ابرس تک مولانا کی خلافت کے فرائض انجام دیئے، آپ اصلاً ترک اور وطناً ازبوی تھے، اور روم کے مشہور اور ذی اثر خاندان انخی سے تعلق رکھتے تھے۔

حضرت شمس الدین تبریزی اور شیخ صلاح الدین سے بھی آپ کو ارادت تھی، اور ان لوگوں کے فیض سے بھی آپ بیش از بیش متمتع ہوئے تھے۔

حضرت حسام الدین چلیپی نے اپنے تمام ملازموں اور غلاموں کو حکم دے دیا کہ اپنے طور پر کام کریں، آہستہ آہستہ اپنا کل ملوکہ مولانا کی خدمت میں صرف کر دیا، آخر میں غلاموں کو بھی آزاد کر دیا، مولانا کا پاس ادب اس قدر ملحوظ تھا کہ مولانا کے وضو خانہ میں کبھی وضو نہ کرتے، سخت سے سخت سردی ہوتی، برف پڑتی ہوتی، مگر گھر جا کر وضو کر کے آتے، دوسری طرف مولانا بھی آپ سے اس طرح پیش آنے کہ دیکھنے والوں کو گمان ہوتا کہ مرید ہیں۔

لے چلیپی ترکی زبان میں سیدی کا ہم معنی ہے، لے فروزا نگر نے ان کی تاریخ ولادت ۶۲۲ھ لکھی ہے، لے مولانا کو جو کچھ فتوحات ہوئیں سب چلیپی کے پاس بھیج دیتے، صاحبزادہ سلطان ولد نے ایک مرتبہ شکایت کی تو فرمایا کہ واللہ باللہ تامل کر صد ہزار کال زاہرہ حالت مخصوصہ واقع شود، و ہم ہلاکت باشد و مارا گیتانان باشد آن را ہم بجزرت چلیپی فرستیم، مولانا کو ان کے بغیر انبساط و شفقت نہیں ہوتی تھی، جس مجلس میں چلیپی نہ ہوتے، مولانا کی طبیعت میں جوش و گرمی نہ پیدا ہوتی، اور اسرار و معرفت کی باتیں نہ کرتے، جن لوگوں کو یہ حقیقت معلوم تھی، وہ مجلس میں سب سے زیادہ اس کا اہتمام کرتے کہ حضرت چلیپی موجود ہوں، تاکہ دریائے فیض جاری ہو (ملاحظہ ہو زندگانی ص ۱۰۱)۔ ندوی

ثنوی کی تحریک

ثنوی شریف کی تصنیف اسی زمانہ کا کارنامہ ہے اس میں حضرت حسام الدین کی تحریک کو بہت بڑا دخل ہے بلکہ یہ کہنا کچھ بیجا نہ ہوگا "ثنوی شریف کا وجود میں آنا آپ ہی کی وجہ سے ہوا"

رفقاء کے انتخاب کا سبب

مولانا کو کسی نہ کسی رفیق کے بغیر راحت نہیں ملتی تھی، شمس الدین کے بعد صلاح الدین اور صلاح الدین کے

لے فروراز نے لکھا ہے کہ ثنوی کی تالیف چلی حسام الدین کی فرمائش و طلب ہوئی، انھوں نے لکھا ہے کہ چلی دیکھتے تھے کہ مولانا کے اجماع میں شیخ عطار سانی کی تصنیفات و کلام کے مطالعہ میں مصروف رہتے ہیں، مولانا کی غزلیات کا اگرچہ بڑا ذخیرہ ہے، مگر اس میں حقائق تصوف و دقائق سلوک سے زیادہ مولانا کی گرمی طبع و جوش عشق ہے، وہ موقع کے منظر تھے، ایک رات مولانا کو تنہا دیکھ کر انھوں نے عرض کیا کہ کوئی کتاب حدیقہ سانی یا منطق الطیر کے طرز پر لکھی جائے، مولانا نے سنتے ہی اپنے منہ سے ایک کاغذ نکالا جس میں ۸ اشعار لکھے ہوئے تھے، پہلا شعر وہ تھا جس کو ثنوی کا آغاز اور مطلع بنا نصیب ہوا۔

بشنوا ز نے چوں حکایت می کند وز جدائی ہا شکایت می کند

آخری مصرعہ تھا۔

پس سخن کوتاہ باید و السلام

پس یہ ثنوی کی تالیف کا آغاز تھا، مولانا برجستہ اشعار زبان مبارک سے ادا کرتے اور مولانا حسام الدین لکھتے جاتے، لکھ لینے کے بعد

حسام الدین اس کو بلند طور پر خوش آوازی کے ساتھ پڑھتے، بعض مرتبہ پوری پوری رات اسی مشغلہ میں گزار جاتی، اور ثنوی کی تالیف شام سے صبح تک جاری رہتی، ثنوی کی جلد اول مکمل ہوئی تھی کہ حسام الدین کی اہلیہ نے انتقال کیا، اور حسام الدین کی طبیعت پر سخت اثر پڑا، اور وہ عمل ہو گئے،

ان کے اضحلال سے مولانا کی طبیعت بھی رگ گئی، اور دو سال تک ثنوی کا سلسلہ بند رہا، پھر دوبارہ حسام الدین کی تحریک اور تقاضا سے اس کا

سلسلہ شروع ہوا، اور مولانا کی وفات تک جاری رہا، یہ مدت ۱۵ سال کی تھی (زندگانی مولانا جلال الدین محمد ص ۱۱۵-۱۱۶)۔ ندوی

بعد حسام الدین آپ کے ہر ازود ساز رہے، بلکہ سلسلہ خیال کو اور آگے بڑھایا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ سید بہاء الدین ترمذی بھی اسی زمرہ میں داخل تھے، اگرچہ دوسری حیثیت سے تھے، سید موصوف کے انتقال اور شمس کی آمد کے درمیان پانچ برس کا زمانہ مولانا نے اس طرح گزارا، گویا اس دوران میں آپ کچھ کمی محسوس کرتے تھے، اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ مولانا کے باطن میں جو کمالات مخفی تھے، ان کے اظہار کے لئے کسی نہ کسی محرک کی ضرورت تھی، "دیوان و ثنوی" انہی حضرات کی تحریک باطنی کے ثبوت ظاہری ہیں، صرف حسام الدین کی عدم فرصت کی وجہ سے ثنوی شریف کی تصنیف دو برس معلق رہی۔

مولانا نے جن اصحاب کو اپنی ہم نشینی کے لئے منتخب کیا، ان کے انتخاب کی وجہ کشف و کرامت نہیں تھی، آپ کا قول اور مسلک یہ تھا کہ محبت کا سبب جنسیت ہو کرتی ہے، خود مولانا نے سلطان ولد کے سوال پر فرمایا کہ میں مناسبت جنسیت کی وجہ سے ان کو خاص طور پر دوست رکھتا ہوں، فرمایا کہ جو محبت مناسبت کی وجہ سے ہوتی ہے، اس کا نتیجہ پشیمانی نہیں ہوتا، حقیقی محبت اور مناسبت سے دنیا و آخرت کہیں بھی پشیمانی نہیں ہوتی، چنانچہ اہل عرض دوستوں کو آخرت میں یہ تمنا ہوگی کہ "يَا لَيْتَنِي لَمْ آتَخِذْ فُلَانًا خَلِيلًا" "مجان متقی کی صفت یہ ہوگی" "الْاِخْلَاقُ لَيَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِينَ"

خود فرماتے ہیں:-

موجب ایماں نہ باشد معجزات لیک جنسیت بود جذب صفات

مولانا کی وفات

سپہ سالار کا قول ہے کہ مولانا کے انتقال سے قبل قونیہ میں چالیس روز زلزلہ آتا رہا، افلاک کا بیہوش ہونا، اور مولانا ہنوز صاحب فراش تھے کہ سات روز برابر زلزلہ رہا، تمام لوگ عاجز آ گئے، مولانا سے طلب امداد کی، فرمایا زمین بھوکے ہو گئی ہے، لقمہ چرب چاہتی ہے، جلد کامیاب ہو جائے گی، اور یہ زحمت تم لوگوں سے

رفع ہو جائے گی اور اس زمانہ میں یہ غزل ارشاد فرمائی :-

با ایں ہمہ مہر و مہر بانی دل می دہرت کہ خشم رانی
 دین جملہ شیشہ ہائے جان را در ہم شکنی بہ لَن تَرَانی
 چلیپی حسام الدین کی روایت ہے کہ ایک روز شیخ صدر الدین اکابر درویشوں کے ساتھ مولانا کی عبادت کو آئے مولانا کی حالت دیکھ کر رنجیدہ ہوئے اور فرمایا خدا شفا لے عاجل عطا فرمائے، امید ہے کہ صحت کلی حاصل ہو جائے گی، مولانا نے فرمایا اب شفا آپ ہی کو مبارک ہو، عاشق و محشوق میں بال کا پیرا ہن رہ گیا ہے کیا آپ نہیں چاہتے کہ وہ بھی اٹھ جائے اور نور نور میں شامل ہو جائے۔

مرضی ہی میں یہ غزل شروع کی، حسام الدین چلیپی لکھتے جاتے تھے اور روتے جاتے تھے۔

رو سربنہ ببا این تنہا مرا رہا کن ترک من خرابے شب گرد مبتلا کن
 مایم و موج سودا شب تا بروز تنہا خواہی بیا بنجنا خواہی برو جفا کن
 از من گریز تا تو ہم در بلا نیفتی بگزین رہ سلامت ترک رہ بلا کن
 مایم و آب دیدہ در کنج غم خزیدہ بر آب دیدہ ماصد جائے آسیا کن
 خیرہ کشتی است مارا در دو بے چو خارا بکشد کشتش نہ گوید تندہیر خوں بہا کن
 بر شاہ خوب رویان واجب وفا بناشد لے زرد روئے عاشق تو صبر کن وفا کن
 درد لیست غیر مردن کا نراد و ابناشد پس من چگونہ گویم کان درد راد و اکن
 در خواب ددش پیری در کوئے عشق دیدم بادست اشار تم کرد کہ عزم سوئے ما کن

یعنی انتقال کے قریب فرمایا :-

گر مومنی و شیریں ہم مونس مرگت در کافر می و تلخی ہم کافرست مُردن

۵ جمادی الاخریٰ ۶۶۲ھ کو بوقت غروب آفتاب حقائق و معارف بیان فرماتے ہوئے انتقال

فرمایا، انتقال کے وقت مولانا کی عمر ۶۸ برس تین ماہ کی تھی۔

جنازہ کو جب باہر لائے، قیامت کا ازدحام برپا ہوا، ہر قوم و ملت کے لوگ ساتھ تھے اور سب روتے جاتے تھے، یہودی اور عیسائی تو ریت و انجیل پڑھتے جاتے تھے، مسلمان ان کو ہٹاتے، مگر وہ باز نہیں آتے تھے، فساد کا اندیشہ ہوا، جب یہ خبر پروانہ کو پہنچی، تو اس نے راہبوں اور قسیسوں سے پوچھا کہ تمہیں اس امر سے کیا تعلق ہے، انہوں نے کہا کہ ہم نے انبیائے سابقین کی حقیقت کو انہی کے بیان سے سمجھا اور اولیائے اکمل کی روش کو انہی کی روش سے جانا، وہ لوگ اسی طرح تابوت کے ساتھ رہے، ہجوم کی حالت یہ رہی کہ تابوت صبح سویرے مدرسہ سے روانہ ہوا تھا، اور شام کے قریب قبرستان پہنچا، آخر بوقت شب یہ آفتاب فقر و تصوف دیدہ ظاہر سے نہاں ہو گیا۔

اخلاق و خصوصیات

مولانا شبلی مرحوم سوانح مولانا روم میں لکھتے ہیں :-

مولانا جب تک تصوف کے دائرہ میں نہیں آئے آپ کی زندگی عالمانہ جاہ و جلال کی ایک شان کھتی تھی، ان کی سواری جب نکلتی تھی تو علماء اور طلبہ بلکہ امراء کا ایک بڑا گروہ رکاب میں ہوتا تھا سناٹین امراء کے دربار سے بھی ان کو تعلق تھا، لیکن سلوک میں داخل ہونے کے ساتھ یہ حالت بدل گئی، درس و تدریس، افتاء و افادہ کا سلسلہ اب بھی جاری تھا، لیکن وہ پھلی زندگی کی محض ایک یادگار تھی، ورنہ زیادہ ترحمت و معرفت کے نشہ میں سرشار رہتے۔

ریاضت و مجاہدہ

ریاضت و مجاہدہ حد سے بڑھا ہوا تھا، سپہ سالار برسوں ساتھ رہے ہیں، ان کا بیان ہے کہ

لے معین الدین پروانہ حاکم قونیہ۔

میں نے کبھی ان کو شب خوابی کے لباس میں نہیں دیکھا، بچھونا اور تکیہ بالکل نہیں ہوتا تھا، قصداً لیٹتے نہیں تھے، نیند غالب ہوتی تو بیٹھے بیٹھے سو جاتے، ایک غزل میں فرماتے ہیں:-

چہ آساید بہر پہلو کہ خسپد کسے کز خار دارد او نہالین

سماع کے جلسوں میں مریدوں پر جب نیند غالب ہوتی تو ان کے لحاظ سے دیوار سے ٹیک لگا کر زانو پر سر رکھ لیتے کہ وہ لوگ بے تکلف ہو کر سو جائیں، وہ لوگ پڑ کر سو جاتے تو خود اٹھ بیٹھتے، اور ذکر و مشغل میں مصروف ہوتے، ایک غزل میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ہمہ نختند و من دل شدہ را خواب نبرد ہمہ شب دیدہ من بر فلک استارہ شمر د

خوابم از دیدہ چناں رفت کہ ہرگز ناید خواب من ز ہر فراق تو بنوشید و بگرد

روزہ اکثر رکھتے تھے اور مسلسل کئی کئی روز کچھ نہ کھاتے تھے۔

نماز کی کیفیت

نماز کا وقت آتا تو فوراً قبلہ کی طرف مڑ جاتے اور چہرہ کا رنگ بدل جاتا، نماز میں نہایت استغراق ہوتا تھا، سپہ سالار کہتے ہیں کہ بارہا میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اول عشا کے وقت سے نیت باندھی، اور دو رکعتوں میں صبح ہو گئی، مولانا نے ایک غزل میں اپنی نماز کی کیفیت بیان کی ہے، فرماتے ہیں:-

چو نماز شام ہر کس نہد چراغ و خوانے منم و خیال یارے غم و نوحہ و فغانے

چو وضو ز اشک سازم بود آتشیں نماز دے مسجد بسوزد چو درد در سداذانی

عجا نماز مستان تو بگو درست ہست آن کنداند اوزمانے نہ شاندا و مکانے

عجا دور کعت ست این عجا چہارم است عجا چہ سورہ خواندم، چوندا شتم زمانے

در حق چگونہ کویم؟ کہ نہ دست ماندن دل دل دوست چون تو بردی بد لے خدا مانے

بخدا خبر نہ دارم چو نمازی گزارم کہ تمام شدر کوئے کہ امام شد فلانے
ایک دفعہ جاڑوں کے دن تھے، مولانا نماز میں اس قدر روئے کہ تمام چہرہ اور داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی، جاڑے کی شدت کی وجہ سے آنسو جم کر یخ ہو گئے، لیکن وہ اسی طرح نماز میں مشغول رہے۔

زہد و قناعت

مزاج میں انتہا درجہ کا زہد و قناعت تھی، تمام سلاطین و امراء نقدی اور ہر قسم کے تحائف بھیجتے تھے، لیکن مولانا اپنے پاس کچھ نہیں رکھتے تھے، جو چیز آتی، اسی طرح صلاح الدین زرکوب یا چلیپی حسام الدین کے پاس بھجواتے، کبھی کبھی ایسا اتفاق ہوتا کہ گھر میں نہایت تنگی ہوتی اور مولانا کے صاحبزادہ سلطان ولد اصرار کرتے تو کچھ رکھ لیتے، جس دن گھر میں کھانے کا سامان کچھ نہ ہوتا تو بہت خوش ہوتے اور فرماتے کہ آج ہمارے گھر میں درویشی کی بو آتی ہے۔

فیاضی و ایثار

فیاضی و ایثار کا یہ حال تھا کہ کوئی سائل سوال کرتا تو عجا یا کرتا یا جو کچھ بدن پر ہوتا اتار کر دے دیتا، اسی لحاظ سے کرتا عجا کی طرح سامنے سے کھلا ہوتا تھا کہ اتارنے میں زحمت نہ ہو۔

بے نفسی اور فنائیت

ایک دفعہ مریدوں کے ساتھ راہ میں جا رہے تھے، ایک تنگ گلی میں ایک کتا سر راہ سو رہا تھا، جس سے راستہ رک گیا تھا، مولانا وہیں رک گئے، اور دیر تک کھڑے رہے، ادھر سے ایک شخص آ رہا تھا، اس نے کتے کو ہٹا دیا، مولانا نہایت آزرده ہوئے اور فرمایا کہ ناحق اس کو تکلیف دی۔

ایک دفعہ دو شخص سر راہ لڑے تھے، اور ایک دوسرے کو گالیاں دے رہے تھے، ان میں سے ایک نے کہا کہ اوعین! تو ایک کہے گا تو دوسرے گا، اتفاق سے مولانا کا ادھر گزر ہوا، آپ نے اس شخص سے فرمایا کہ بھائی جو کچھ کہنا ہے مجھ کو کہو کہ تم مجھ کو اگر سزا کہو گے تو ایک بھی نہ سونو گے، دونوں مولانا کے پاؤں پر گر پڑے اور آپس میں صلح کر لی۔

کسبِ حلال

معاش کا یہ طریقہ تھا کہ اوقات کی مد سے پندرہ دینار ماہوار روزینہ مقرر تھا، چونکہ مولانا مفت خوری کو نہایت ناپسند کرتے تھے اس لئے اس کے معاوضہ میں فتویٰ لکھا کرتے تھے، مریدوں کو تاکید تھی کہ اگر کوئی فتویٰ لائے تو گو میں کسی حالت میں ہوں، ضرور خبر کرو تا کہ یہ آمدنی مجھ پر حلال ہو۔

ایک دفعہ کسی نے کہا کہ شیخ صدر الدین کو ہزاروں روپیہ کا وظیفہ ہے اور آپ کو کل پندرہ دینار ماہوار ملتے ہیں، مولانا نے کہا کہ شیخ کے مصارف بھی بہت ہیں، اور حق یہ ہے کہ یہ پندرہ دینار بھی انہی کو ملنے چاہئیں۔

اہل دنیا سے کیسوی

مولانا کو باطنی امرا و سلاطین سے نفرت تھی، صرف جن خلق کی وجہ سے ان کی لیتے تھے، ورنہ ان کی صحبتوں سے کسوی دور بھاگتے تھے، ایک دفعہ ایک میر نے معذرت کی کہ اشتغال سے فرصت نہیں ہوتی، اس لئے کم حاضر ہو سکتا ہوں، معاف فرمائیے گا فرمایا۔

”معذرت کی ضرورت نہیں، میں آنے کی نسبت نہ آنے سے زیادہ ممنون ہوتا ہوں!“

ثنوی معنوی اور اس کا علمی و اصلاحی مقام و پیغام

ثنوی معنوی

مولانا کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے پرجوش طبیعت پائی تھی، عشق ان کی فطرت

لے سوانح مولانا روم باختصار و خفیف تغیر۔

میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا، ظاہری علم اور عقلیات کے توغل نے اس آگ کو دبا رکھا تھا، شمس تبریز کی آتشیں صحبت نے ان کی فطرت کو چھیر دیا، اور تربیت و ماحول نے اس پر جو پرنے ڈال دیئے تھے، وہ دفعہ اٹھ گئے، اور وہ سر اپا سوز و ساز بن گئے۔

شعلہا آخر زہر مومیم دمید از رگ اندیشہ ام آتش چکید

اس مقام پر پہونچ کر عارف کے ہر بن موم سے صدا آتی ہے کہ۔

در جہان یارب ندیم من کجاست نخل سینا یم کلیم من کجاست

یہی وجہ تھی کہ ہمد و ہمزاز کے بغیر ان کے لئے جینا محال تھا، شمس تبریز کے بعد جب تک ان کو

صلاح الدین زرکوب اور صلاح الدین زرکوب کے بعد جب تک ان کو حسام الدین چلی نہیں مل گئے،

ان کی بے قرار طبیعت کو سکون نہیں ہوا۔ ع

شمع راتنہا پلیدن سہل نیست

یہی آتش سوزاں تھی جو ان کو کشاں کشاں سماع کی طرف لے جاتی تھی، اور وہ اس سے قوت

اور غذا حاصل کرتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں۔

پس غذائے عاشقاں آمد سماع کہ ازو باشد خیال اجتماع

قوتے گیرد خیالات ضمیر بلکہ صورت گردد از بانگ صغیر

آتش عشق از نو اہا گرد تیز آچنانکہ آتش آن جوز ریز

اسی سوز نے ان کے ساز کو چھیرا اور خاموش رہنا ان کے لئے ناممکن کر دیا اس لئے ان کے بقول

جوش نطق از دل نشان دوستیت بستگی نطق، از بے الفتی است

دل کہ دلبر دید کے ماند ترش بلبل گل دیدہ کے ماند خمخش

لے اقبال در ثنوی اسرار خودی ۱۵۰ ایضاً ۱۵۰ ثنوی ص ۱۹۰۔ نزل کشور اشاعت نہم ۱۵۰ ایضاً ۱۵۰ ایضاً ۱۵۰

اس ساز سے جو نغمے نکلے ان کے مجموعے کا نام ثنوی ہے، یہ ان کے خیالات و حالات و واردات و تاثرات اور مشاہدات و تجربات کا آئینہ ہے، اس میں صاحب کلام کا سوز و درد، جوش و مستی اور ایمان یقین بکھرا ہوا ہے، اور یہی اس کی عالمگیر مقبولیت اور بے نظیر تاثیر کی اصل وجہ ہے۔ ع۔

ہے رگ ساز میں رواں صاحب ساز کا لہو

عقلیت و ظاہر پرستی پر تنقید

مولانا کا علمی نشوونما تمام تر اشاعرہ کے علمی ماحول میں ہوا تھا، وہ خود ایک کامیاب مدرس اور معقولی عالم تھے، توفیق الہی نے جب ان کو معرفت و آگہی کے مقام تک پہنچایا، اور قال سے حال، خبر سے نظر، الفاظ سے معانی، اور اصطلاحات و تعریفات کے لفظی طلسم سے ترقی کر کے حقیقت و معرکتک پہنچے تو ان کو فلسفہ و علم کلام کی کمزوریوں اور استدلال و قیاس کی غلطیوں کا اندازہ ہوا، اور فلاسفہ و حکمیین اور اہل استدلال کی بے بضاعتی اور حقیقت ناشناسی کی حقیقت ان پر منکشف ہو گئی، تو انھوں نے بڑی قوت اور وضاحت کے ساتھ علم کلام پر تنقید کی، وہ چونکہ اس کوچہ کے ذرہ ذرہ سے آشنا ہیں، اس لئے وہ جو کچھ کہتے ہیں، وہ ان کا ذاتی تجربہ و مشاہدہ ہوتا ہے، اور اس کی واقعیت کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔

اس عصر کے فلسفہ و عقلیات کا سب سے زیادہ زور جو اس ظاہری پر تھا، ان جو اس خمسہ کو علم اور حصول یقین کا سب سے زیادہ مستند اور قابل وثوق ذریعہ سمجھا جاتا تھا، اور جو چیز ان کی گرفت میں نہ آسکے، اور ان کے ذریعہ اس کی تصدیق نہ ہو سکے، اس کی نفی اور اس کے انکار کی طرف رجحان روز بروز ترقی کر رہا تھا، معتزلہ اس حسیت کے سب سے بڑے نقیب تھے، اس جو اس پرستی نے ایمان بالغیب کو بہت نقصان پہنچایا تھا، اور شریعت اور وحی کے پیش کئے ہوئے حقائق کی طرف سے ایک طرح کی بے اعتمادی پیدا کر دی

لہ اقبال بال جبریل۔

تھی، مولانا اس جو اس پرستی اور اس کے پر جوش و کیلوں پر تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

چشمِ حسن را ہست مذہبِ اعتزال دیدہ عقل است سنی در وصال
سخرہ حسن انداہلِ اعتزال خویش راستی نمایند از صنلال
ہر کہ در حسن ماند او معترزی است گر چہ گوید ستیم از خامی است
ہر کہ بیرون شد ز حسن سنی و لیت اہل بنیش اہل عقل خویش بیست

انھوں نے جا بجا ثابت کیا ہے کہ ان جو اس ظاہری کے علاوہ انسان کو کچھ جو اس باطنی عطا ہوئے ہیں، یہ جو اس باطنی جو اس ظاہری کے مقابلہ میں کہیں زیادہ وسیع اور وسیع ہیں، فرماتے ہیں:-

پنج حصے ہست جزا میں پنج حصے آن چو زر سرخ و این حصہا چو مس
اندر ان بازار کا اہل محشر اند حسن مس را چوں حسن زر کے خزند
حسن ابدان قوتِ ظلمت می خورد حسن جان از آفتابے می چرد
ان کے نزدیک کسی چیز کے انکار کے لئے یہ ثبوت بالکل کافی نہیں کہ وہ دیکھنے میں نہیں آتی، یا جو اس اس کی تصدیق نہیں کرتے، ان کے نزدیک باطن ظاہر کے پیچھے نہیں اور دو میں فائدہ کی طرح اس میں پنہاں ہے، منکرین باطن کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

حجتِ منکر ہی آمد کہ من غیر ازین ظاہر نمی بینم وطن
بسیج نندیشد کہ ہر جا ظاہر است آن ز حکمت ہائے پنہاں فجرست
فائدہ ہر ظاہرے خود باطنیت ہیچو نفع اندر دوا ہا مضمحلست

ان کا کہنا ہے کہ منکرین اپنی اس ظاہر بینی اور کوتاہ نظری کی عادت کی وجہ سے ان حقائق باطنی کی دید سے محجوب اور اصل غایت و مقصد سے محروم ہیں:-

لہ ثنوی ص ۱۰۱ ۲۵ ایضاً ۳۶۵ ایضاً ص ۳۶۵

چونکہ ظاہر ہاگر فقند احمقاں آں دقالتی شد از ایشان بس نہاں
 لاجرم محبوب گشتند از عرض کہ دقیقه فوت شد در مفترض^۱
 سو اس سے آگے بڑھ کر وہ عقل پر بھی تنقید کرتے ہیں کہ عالم غیب کے حقائق اور انبیاء کے علوم و معارف
 کے بارہ میں عقل بھی کوتاہ اور نارسا ہے اس کے پاس قیاس کی کوئی بنیاد نہیں اور وہ اس عالم کا کوئی
 تجربہ نہیں رکھتی، دریاے شور کا رہنے والا آب شیرین کا کیا اندازہ کر سکتا ہے؟
 اے کہ اندر چشمہ شور است جات تو چہ دانی شط و جیون و فرات^۲
 وہ اس عقل کو جو محسوسات اور مقدمات کی پابند ہو عقل جزوی کے نام سے یاد کرتے ہیں، ان کے
 نزدیک اوہام و شکوک اس کا ثمرہ، عالم ظلمات اس کا وطن ہے، وہ عقل کے لئے باعث بدنامی اور انسان
 کے لئے سبب ناکامی ہے، اس عقل جزوی سے دیوانگی اچھی!

عقل جزوی آفتش وہم ست وطن زانکہ در ظلمات شد اورا وطن^۳
 عقل جزوی عقل را بد نام کرد کام دنیا مرد را بے کام کرد^۴
 زیں خرد جاہل ہمی باید شدن دست در دیوانگی باید زدن^۵
 وہ کہتے ہیں کہ میں نے خود اس عقل دورانیش کا تجربہ کیا ہے، اور اس نتیجہ تک پہنچا ہوں۔
 آزمودم عقل دورانیش را بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را^۶
 پھر وہ ایک سیدھی اور عام فہم بات کہتے ہیں کہ اگر عقل دینی حقائق و معارف کے ادراک کے لئے
 کافی ہوتی تو اہل منطق و استدلال اور ائمہ کلام سب سے بڑے عارف اور دین کے محرم اسرار ہوتے۔
 اندریں بحث از خرد رہیں بدے فخر رازی را ز دار دین بدے^۷
 ان کے نزدیک انسانوں کے ساختہ پر داختہ علوم، علم حقیقی کے لئے حجاب اور سالک کے لئے

انتشار و اضطراب کا موجب ہیں اس لئے یقین و معرفت کے لئے ان میں اضافہ و ترقی کے بجائے کمی اور
 ان سے گلو خلاصی کی ضرورت ہے، فرماتے ہیں:-
 گر تو خواہی کت شقاوت کم شود جہد کن تا از تو حکمت کم شود
 حکمتے کر طبع آید و ز خیال حکمتے بے فیض نور ذوا بجمال
 حکمتے دنیا فزاید ظن و شک حکمتے دینی برد فوق فلک^۱
 ان کے خیال میں استدلال مقدمات کی ترتیب اور نتیجہ کا استخراج ایک مصنوعی طریقہ ہے اور اس سے
 بہت محدود اور ناقص نتائج حاصل کئے جاسکتے ہیں اس سے دینی حقائق کا ثابت کرنا ایسا ہی مشکل ہے،
 جیسے لکڑی کے مصنوعی پاؤں کے ذریعہ آزادانہ چلنا پھرنا اور سفر طے کرنا، ان کی تمثیل ضرب المثل کا درجہ
 رکھتی ہے اور زبان زد خاص و عام ہے کہ:-

پائے استدلالیان چو ہیں بود پائے چو ہیں سخت بے تمکین بود^۲
 ان کے نزدیک علم کلام اور متکلمانہ بحث و استدلال سے یقین کی کیفیت اور صلوات ایمانی حاصل
 نہیں ہوتی، اس لئے کہ منکلم جو تقلیداً متقدمین کے دلائل و براہین کو نقل کر دیتا ہے اور آموختہ سانس دیتا
 ہے، خود بے روح، اور ذوق و کیفیات یقین سے محروم ہے۔
 آن مقلد صد دلیل و صد بیان بر زبان آرد ندارد ہیچ جان
 چونکہ گویندہ ندارد جان و فر گفت اورا کے بود برگ و شمر^۳
 وہ اس عقل جزوی کے بجائے جو محسوسات و معلومات اور تجربات کی پابند اور دنیا کے اندر محدود
 ہے، اس عقل ایمانی کے قائل ہیں، جو خود عقل کے لئے رہنما اور اس کے لئے چراغ راہ ہے اور جو اس سے وہ نسبت
 رکھتی ہے، جو عقل جزوی جسم کے ساتھ اور جس کے بغیر عقل عقل کہلانے کی مستحق نہیں، اس لئے اس کو عقل عقل

کہہ سکتے ہیں، عقل عقل ان لوگوں کا حصہ ہے، جو نور ایمان اور دولت یقین سے بہرہ ور ہیں۔

بند معقولات آمد فلسفی شہسوار عقل عقل آمد صفی

عقل جزوی سے انسان کے دفتر کے دفتر سیاہ ہیں، عقل عقل سے عالم مطلع انوار ہے۔

عقل دفتر ہاگند یکسر سیاہ عقل عقل آفاق دارد پُر زماہ

از سیاہی و سپیدی فارغ است نور ماہش بردل و جان بانغ است

عقل ایمانی شہر کے لئے پاسبان کا حکم رکھتی ہے، عقل جزوی کا تقاضا خوف و ہراس اور دنیا کے

اندیشے ہیں، عقل ایمانی کا تقاضا اطمینان و سکون اور خواہشات نفس سے حفاظت ہے۔

عقل ایمانی چو شخہ عادل است پاسبان و حاکم شہر دل است

عقل در تن حاکم ایمان بود کہ ز ہمیش نفس در زندان بود

ان کے نزدیک جس طرح جو اس عقل کے تابع اور محکوم ہیں، اسی طرح عقل پر روح کو تفوق اور حکومت

حاصل ہے، روح ایک اشارہ میں عقل کی سیکڑوں گرہیں کھول دیتی ہے، اور چکیوں میں اس کی مشکل آسان کر دیتی ہے۔

حس اسیر عقل باشد اے فلاں عقل اسیر روح باشد ہم بدان

دست بستہ عقل راجان باز کرد کار ہائے بستہ راہم ساز کرد

فلسفی ادنی معقولات اور ابتدائی معلومات کی منزل سے آگے نہیں بڑھتا، اس کی عقل نے

ابھی دروازہ سے باہر قدم ہی نہیں نکالا ہے۔

فلسفی گوید ز معقولات دون عقل از دلہیزی ناید برون

فلسفی خود اپنی عقل و فکر کا مارا ہوا ہے، وہ ایسا بد قسمت مسافر ہے کہ اس کی پشت منزل کی طرف

اور رخ صحرای کی طرف ہے، اس لئے وہ جس قدر تیز قدم بڑھاتا ہے، منزل مقصود سے دور ہو جاتا ہے۔

فلسفی خود را از اندیشہ بکشت کو بد و کور اسوے گنج است پشت

کو بد و چنداں کہ افزوں می دود از مراد دل جدا ترمی شود

فلسفی دنیا کے علوم سے باخبر، بڑا وسیع النظر، صد با چیزوں سے آشنا، مگر اپنے سے نا آشنا ہے،

حالانکہ سب سے بڑا علم خود شناسی ہے۔

صد ہزاراں فضل دارد از علوم جان خود را می نداند این ظلوم

داند او خاصیت ہر جو ہرے در بیان جو ہر خود چون خرے

قیمت ہر کالہ می دانی کہ چلیست قیمت خود را ندانی ز احمقیست

جان جملہ علمہا این ست این کہ بدانی من کیم در یوم دین

وہ اپنے زمانہ کے عالم و مکالم کو حکمت یونانی سے حکمت ایمانی کی طرف ہجرت کی دعوت دیتے ہیں،

جو حقیقی علم اور حکمت ہے۔

چند چند از حکمت یونانیان حکمت ایمانی را ہم بخوان

وہ کہتے ہیں کہ تزکیہ نفس سے صحیح معرفت نفس حاصل ہوگی، لوح دل خلتی صاف ہوگی، حکمت

ایمانی کے نقوش اتنے ہی روشن اور اجاگر ہوں گے، اس وقت بغیر کتاب و استاد کے انبیاء علیہم السلام

کے علوم و معارف وارد ہوں گے، اور حکمت کے دہانے کھل جائیں گے۔

خویش را صافی کن ز او صاف خود تا بہ بینی ذات پاک و صاف خود

بینی اندر دل علوم انبیاء، بے کتاب و بے معید و اوستا

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

آئینہ دل چون شود صافی و پاک نقشہا بینی برون از آب و خاک

آن کلامت می رہاند از کلام وان سقامت می جهاندا از سقام^۱
بیماری بھی ایسی بیماری ہے کہ ہزار صحتیں اس پر قربان، اس کی کلفت ایسی کلفت ہے کہ ہزاروں
راحتیں اس پر نثار۔

پس مقام عشق جانِ صحت است رنجہایش حسرت ہر راحت است^۲
یہ عشق پاکباز اگر گناہ ہے تو ایسا گناہ ہے کہ طاعتیں اس کے سامنے بیچ ہیں، اس سے ایک گھڑی
میں جو ترقی حاصل ہوتی ہے، وہ ساہا سال کی ریاضت سے میسر نہیں۔

زین گنہ بہتر نباشد طاعتے ساہا نسبت بدین دم ساعتے^۳
راہ عشق میں جو خون بہے وہ کسی پانی سے کم پاک نہیں، شہید عشق کو ہمارے غسل و وضو کی ضرورت نہیں۔
خون شہیدان راز آب ولی تراست این خطا از صد صواب اولی تراست^۴
عاشق وہ جگر سوختہ و دل باختہ ہیں کہ ان پر عام انسانوں کے قوانین جاری نہیں کئے جاسکتے، جو
گاؤں سراسر ویران ہو گیا ہو اس پر خرچ کیسا؟

عاشقان را ہر نفس سوزید نیست برده ویران را خرچ و عشر نیست^۵
عشق آدم کی میراث اور زیر کی و چالا کی شیطان کا سرمایہ ہے۔

داند آن کو نیک بخت و محرم است زیر کی زابلیس و عشق از آدم است^۶
زیر کی و چالا کی میں اپنے دست و بازو (عقل و خرد) پر اعتماد ہوتا ہے، عشق میں کسی کے دامن سے
وابستگی ہوتی ہے، اور سپردگی، زیر کی و چالا کی، شناوری، (پیرا کی) کافن ہے، "عشق" کشتی نوح، زیر کی و
چالاک کو اس طوفان میں بچنے اور ساحل تک پہنچنے اور صاحبِ عشق کو غرق ہونے کب دیکھا گیا ہے؟
زیر کی بساچی آمد در بحار کم زہد، غرق است او پایان کار

عشق چون کشتی شود بہر خواص کم بود آفت، بود اغلب خلاص^۱
عقل کی ہوشمندی، عشق کی حیرانی پر قربان کر دینے کے قابل ہے، وہ ہوشمندی محض ظن و قیاس
ہے، اور یہ حیرانی مشاہدہ و عرفان۔

زیر کی بفروش و حیرانی بجز زیر کی ظنیست، حیرانی نظر^۲
مولانا عشق کی تلقین کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ محبوب بننا تو ہر ایک کے بس میں نہیں، لیکن عاشق
بننا ممکن ہے، اگر خدانے تم کو محبوب نہیں بنایا ہے تو تم عاشق بن کر زندگی کا لطف حاصل کرو۔

تو کہ یوسف نیستی، یعقوب باش ہچو او باگریہ و آشوب باش^۳
تو کہ شیریں نیستی فرہاد باش چوں نیی لیلیٰ تو مجنوں گرد فاش^۴
وہ ایک قدم آگے بڑھاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ عاشق بننے میں جو مزہ ہے، اور ترقی ہے، وہ محبوب
بننے میں کہاں؟ اگر محبوبان عالم کو اس دولتِ سرمد کا پتہ چل جائے، محبوبوں کی صفت سے نکل کر "عشق"
کی صفت میں شامل ہو جائیں۔

ترک کن معشوقی و کن عاشقی لے گمان برودہ کہ خوب و فائق^۵
لیکن "عشق" کی یہ دولت بیدار کسی مردہ و ناپائیدار محبوب کے لائق نہیں، عشق خود زندہ ہے،
اسے ایک زندہ و پائندہ محبوب چاہئے۔

عشق بر مردہ نباشد پائدار عشق را بر حے جان افزایے دار^۶
اسی زندہ و پائندہ حی و قیوم محبوب سے عشق جاوداں کی تشفی و استواری ہے، اسی سے اس کی
تازگی اور آبیاری ہے۔

عشق زندہ در رواں و در لبہر ہر دے باشد ز غنچہ تازہ تر

عشق آن زندہ گزین کو باقیست وز شراب جانفزایت ساقیست
عشق آن بگزین کہ جملہ انبیاء یافتند از عشق او کار دکیست
حسن کی اس بارگاہ عالی میں عشق کو اپنی نارسائی کا شکوہ نہیں ہونا چاہئے کہ حسن ازل سدا
عشق نواز اور دوست طلب ہے۔

تو لگو مارا بدن شہ باز نیست باکریاں کار ہا دشوار نیست
یہ عشق دیکھنے میں ایک بیماری ہے جو دل کی شکستگی سے پیدا ہوتی ہے، یہ بیماری بڑی جان لیوا
ہے، لیکن آدمی اگر اس کو برداشت کر لے جائے تو اس کا نتیجہ معرفت حقیقی اور حیات ابدی ہے۔

عاشقی پیدا است از زاری دل نیست بیماری چوں بیماری دل
علت عاشق ز علت ہا جداست عشق اضطراب اسرار خداست

یہ بیماری سب بیماریوں کی دو اور قسم کے نفسانی و اخلاقی امراض کے لئے شفا ہے جن روحانی
امراض کے علاج سے طبیب مایوس اور معالج و مصلح دست بردار ہو چکے ہوں، اور کوئی تذبذب کارگرنہ ہوتی
ہو، عشق ایک نگاہ میں اس کو اچھا کر سکتا ہے، برسوں کا مرض جب عشق کے ہاتھوں اپنے روحانی امراض
کہنے سے شفا پاتا ہے، تو سرور و بیخودی کے عالم میں پکاراٹھتا ہے۔

شاد باش اے عشق خوش سوائے ما اے طبیب جملہ علتہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموس ما اے تو افلاطون و جالینوس ما
عشق ایک شعلہ ہے جو خس و خاشاک کو جلا کر خاک کر دیتا ہے، اور محبوب کے سوا کسی کار و ادار
نہیں، وہ بڑا موحد بڑا غیور ہے۔

عشق آن شعلہ است کو چوں برفروخت ہرچہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

تیغ لاد رقتل غیر حق براند در نگرزاں پس کہ بعد از لاپہ ماند
ماند آلا اللہ باقی جملہ رفت شاد باش اے عشق شکر ت سوز رفت

یہ عشق الہی ایک بحر ناپیدا کنار ہے، اس کی داستان ختم ہونے والی نہیں، زمانہ کی وسعت بھی اس کے
لئے تنگ اور دنیا کی عمر بھی اس کی داستان سرائی کے لئے کوتاہ ہے، یہ اس حسن ازلی کا قصہ ہے، جس کا
نہ اول ہے نہ آخر، اس لئے یہاں خاموشی ہی بہتر اور اعترافِ عجز ہی مناسب ہے۔

شرح عشق از من گویم بردوام صد قیامت بگزرد و ان ناتمام
زانکہ تاریخ قیامت را خداست حد کجا آنجا کہ وصفت این خداست

جہان دل

لیکن یہ عشق جس کی دعوت مولانا اس جوش و خروش سے دیتے ہیں، دل کی زندگی اور بیداری اور
دل کی گرمی کے بغیر ممکن نہیں، ہر زمانہ کی طرح مولانا کے زمانہ میں بھی دل کی طاقتوں اور وسعتوں سے غفلت اور
ناواقفیت بڑھتی جا رہی تھی، اور دماغ کی عظمت کا سکہ دلوں پر بٹھیتا جا رہا تھا، دماغ روشن اور دل سرد
ہوتے جا رہے تھے، معدہ زندگی میں مرکزی مقام حاصل کرتا جا رہا تھا، مولانا نے دل کی عظمت و وسعت کی
طرف متوجہ کیا، اور اس کے عجائبات و فتوحات بیان کئے، اور یاد دلایا کہ انسان اپنے اس جسم خاکی میں
کیسا سدا بہار باغ رکھتا ہے، اور اس کے پہلو میں کیسی دنیا آباد ہے، جس میں ملک کے ملک گم ہو جائیں،
جس کو کسی دشمن کا خطرہ اور کسی رہزن کا اندیشہ نہیں۔

ایمن آباد است دل لے مردماں حصن محکم موضع امن و امان
گلشن خرم بکام دوستان چشمہا و گلستان در گلستان

انہوں نے بتلایا کہ دنیا کے باغات چند دنوں کے مہمان، لیکن نخل دل سدا جوان اور باغ دل بہار بے خزاں ہے، جسم کا باغ برسوں میں لگتا ہے، اور دم میں اجر جاتا ہے، دلوں کے باغ لگنے میں دیر نہیں لگتی، مگر اس کی رعنائی اور تازگی میں کبھی فرق نہیں آتا۔

گلشنے کر: نقل رویدیکم است
گلشنے کر: عقل روید خرم است

گلشنے کر: تن دید گرد تباه
گلشنے کر: دل دید وافرحتاہ

وہ تلقین کرتے ہیں کہ جسم کو جوان بنانے کی سعی حاصل اور سکندر کی طرح "چشمہ جوان" کی ناکام تلاش کے بجائے عشق کے آب حیات کا ایک جرعه نوش جان اور دل کی زندگی کا سامان کرنے کی ضرورت ہے تاکہ صحیح معنی میں زندہ دلی اور نشاطِ روح حاصل ہو اور ہر دور زندگی میں توانائی و رعنائی محسوس ہو۔

دل بجز تاداما باشی جوان
از تجلی چہرہ ات چوں ارغوان

طالب دل شو کہ تاباشی چو مل
تاشوی شادان و خندان ہچو گل

لیکن دل کے لفظ سے دھوکہ نہ ہو، دل وہ نہیں ہے جو سینہ میں دھڑکتا ہے اور خواہشاتِ نفس اور لہو الہوسی کی آماجگاہ ہے، جو محبت کی لذت سے نا آشنا، یقین کی دولت سے محروم، ذوق و شوق سے خالی ہے، جس کی کلی کبھی کھلتی نہیں اور جس کی قسمت کبھی حکمتی نہیں، یہ دل نہیں، پتھر کی ایک سیل ہے۔

تنگ و تاریک است چون جان بہو
مینوا از ذوق سلطان و دود

نے دران دل تاب نور آفتاب
نے کشاد عرصہ نے فتح باب

یہ دل اپنی ساخت اور اپنی صورت شکل، جسامت کے لحاظ سے ویسا ہی ایک دل ہے، جیسے اہل دل کا بیدار و بیتاب دل، لیکن حقیقت کے لحاظ سے دیکھئے تو سوالی لفظی اشتراک و جسمانی مشابہت کے دونوں میں کوئی مناسبت نہیں، وہ بھی پانی ہے، جو چشمہ صافی میں رواں ہے اور وہ بھی پانی ہے، جو کسی دلدل

یا کچھ کے اندر ہے، لیکن پہلا پانی خالص پانی ہے جس سے پیاس بھی بجھائی جاسکتی ہے، اور ہاتھ بھی صاف ہو سکتے ہیں، دوسرا پانی میں مٹی کا اتنا جڑ ہے کہ اسے پانی کا کام لینا مشکل ہے، یہی فرق دل اور دل میں ہے، ایک دل مادہ پرست اور لہو الہوس، ایک بے حس و مردہ دل انسان کا ہے، ایک لہو انبیا و اولیاء کا ہے، جس کی بلندگی سامنے آسمان بھی پست اور جس کی وسعت آگے سارے عالم کی وسعت گرد ہے، اس سوچ سمجھ کر کہو کہ ہمارے پہلو میں بھی دل ہے

تو بھی کوئی مراد دل نیز ہست
دل فراز عرش! شد نہ پست

در گل تیرہ یقین ہم آب ہست
لیک ازاں آبت نیاید آبدست

زانکہ گر آب است مغلوب گل است
پس دل خود را گموا کین ہم دل است

آن دے کر آسمانہا برتر است
آن دل ابدال یا پیغمبر است

لیکن پھر تسلی دیتے ہیں کہ دل بہر حال دل ہے، اور خدا کے یہاں کوئی دل مردود نہیں، وہ ہر دل کا خریدار ہے، اس لئے کہ خریداری سے اس کو کوئی فائدہ مقصود نہیں۔

کالہ کہ بیچ خلقش ننگرید
از خلافت آن کریم آن را خرید

بیچ قلبے پیش او مردود نیست
زانکہ قصدش از خریدن نمود نیست

پھر وہ فرماتے ہیں کہ معدہ کے قفس زریں کو چھوڑ کر دل کی آزادستی کی سیر کرو، اور خدا کی قدرت کا تماشا دیکھو، تمہارے اور خالق کے درمیان بڑا حجاب ہی معدہ اور شکم پرستی ہے، تم اس حجاب سے نکلے کہ تم کو اس بارگاہ عالی سے سلام پہنچے۔

معدہ را بگذار سوئے دل خرام
تا کہ بے پردہ ز حق آید سلام

مقام انسانیّت

مستبد شخصی سلطنتوں کے اثرات اور پیم مظالم، مسلسل جنگوں کے نتیجے میں عام انسانوں میں

زندگی سے بیزاری اپنے مستقبل سے یا یوسی اور احساس کہتری پیدا ہو گیا تھا، اور انسان خود اپنی نگاہ میں ذلیل ہو گیا تھا، عجمی تصوف نے فنائیت انکار ذات اور خود شکنی کی تلقین اتنے جوش اور قوت کی تھی کہ خود نگری اور خود شناسی جس پر حرکت، جدوجہد اور کشمکش موقوف ہے، ایک اخلاقی جرم اور مانع ترقی سمجھی جانے لگی تھی، انسانوں کے سامنے ملکوتی صفات کے حصول اور لوازم بشریت سے انسلاخ، تجرد و تفرید کی تبلیغ، اس انداز میں ہوئی تھی کہ انسان کو اپنی انسانیت سے شرم آنے لگی تھی، اور وہ اپنی ترقی انسانیت میں نہیں بلکہ ترک انسانیت میں سمجھنے لگا تھا، عام طور پر مقام انسانیت سے غفلت اور انسان کی رفعت و شرافت سے ذہول پیدا ہو گیا تھا، اور اس وقت کی ادبیات اور شعر و شاعری میں تحقیر انسانیت کی روح سرایت کر گئی تھی، اس کا نفسیاتی اثر یہ تھا کہ لوگوں میں عام طور پر اپنے بارہ میں بے اعتمادی، ناامیدی، افسردگی اور شکستہ دلی پائی جاتی تھی، اور انسان کبھی کبھی حیوانات اور جمادات پر رشک کرنے لگتا تھا، وہ جوہر انسانیت سے ناواقف اور اپنی عظمتوں اور ترقیات سے غافل تھا، مولانا نے اپنے مخصوص انداز میں اس پہلو کو ابھارا اور انسان کی بلندی کا ترانہ اس جوش سے بلند کیا کہ اس کی سوئی ہوئی خودی بیدار ہو گئی، اور وہ اپنے مقام سے آگاہ ہو گیا، مولانا کی اس رجز خوانی کا پوری اسلامی ادبیات پر اثر پڑا اور اس نے شعر و شاعری اور تصوف میں ایک نیا رجحان پیدا کر دیا۔

مولانا انسان کو اپنی انسانی خلقت کی طرف توجہ دلاتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جا بجا "أَحْسَنَ تَقْوِيمٍ" کے خطاب سے یاد فرمایا ہے، یہ لباس موزوں خاص طور پر اسی کے لئے قطع کیا گیا ہے، اور اس کی قامت پر راست آتا ہے۔

"أَحْسَنَ التَّقْوِيمِ دَرَجَاتِیْنَ" بخوان
کہ گرامی گوہر است اے دوست جان
"أَحْسَنَ التَّقْوِيمِ" از عرشش فزون ہے

وہ فرماتے ہیں کہ انسان کے سوا اور کس کے سر پر کرامت کا تاج رکھا گیا ہے اور "كَمُنَّا" اور "أَعْطَيْنَاكَ" کے خطاب سے مشرف کیا گیا ہے؟!

ایچ کر مَنَّا شنید ایں آسمان کہ شنید ایں آدمی پُر غمان ہے
تاج کر مَنَّا ست برفرقِ سرت طوقِ اَعْطَيْنَاكَ آویزِ برت ہے

وہ فرماتے ہیں کہ انسان خلاصہ کائنات اور مجموعہ اوصاف عالم ہے، انسان کیا ہے، ایک کوزہ میں دریا بند ہے، اور ایک مختصر سے وجود میں پورا عالم پنہاں ہے۔

آفتابے دریکے ذرہ نہان ناگہاں آں ذرہ بکشاید بان
ذرہ ذرہ گردد افلاک و زمین پیش آں خورشید چوں حسبت از کمین ہے
بحرِ علمے در نمی پنہاں شدہ درسہ گزرتن عالمے پنہاں شدہ ہے

انسان آفرینش عالم کا مقصود اور تمام کائنات کا محسود ہے، اسی سے اس عالم کا رنگ و بو اور زندگی کی آبرو ہے، اس کی طاعت تمام موجودات پر فرض ہے۔

ہر شرا بے بندہ آں متدوخذ جملہ مستان را بود بر تو حسد
ایچ محتاج مے گلگون نے ترک کن گلگونہ تو گلگونے
جوہر است انسان و چرخ اور اعرض جملہ فرع و سایہ اند تو عرض
علم جوئی از کتب ہائے فسوس ذوق جوش تو ز حلوائے سبوس
خدمتت بر جملہ ہستی مفترضن جوہرے چون عجز دارد با عرض

یہی نہیں بلکہ انسان منظر صفات الہی ہے، وہی ایک ایسا آئینہ ہے جس میں تجلیات و آیات کا عکس نظر آتا ہے۔

آدم اصطراب اوصاف علوست
وصف آدم منظر آیات اوست
ہرچہ دروے می نماید عکس اوست
ہرچہ عکس ماہ اندر آبجوست
خلق را چون آب دان صفا و زلال
و ندر و تابان صفات ذواجلال
علم شان و عدل شان و لطف شان
چوں ستارہ چرخ در آب روان^۱

اس سب کے فرمانے کے بعد وہ محسوس کرتے ہیں کہ انسان کی تعریف اور اس کی قدر و قیمت کا بیان اب بھی مکمل نہیں اور سچ پوچھے تو کسی میں اس کے سننے کی تاب بھی نہیں۔

گر گویم قیمت آن ممتنع
من بسوزم، ہم بسوزد مستمع^۲

اس رفعت و بلندی کے بعد خدا کے سوا انسان کا کون خریدار ہو سکتا ہے اور کون اس کی قیمت لگا سکتا ہے، حیف ہے کہ انسان خود اپنی قیمت نہ جانے اور ہر قیمت پر ہر ایک کے ہاتھ بک جانے کے لئے تیار ہو، وہ بڑی دل سوزی سے فرماتے ہیں۔

اے غلامت عقل و تدبیرات و ہوش
تو چرائی خویش را از زان فروش^۳

پھر فرماتے ہیں کہ انسان کا سودا ہو چکا ہے، اللہ اس کا خریدار ہے اور وہی انسان کا سچا قدر دان ہے

مشریٰ ماست اللہ اشتری
از غم ہر مشتری ہین بر تر آ

مشریٰ جو کہ جو یان تو است
عالم آغاز و پایان تو است^۴

لیکن یہ سب ان انسانوں کا تذکرہ ہے جو جوہر انسانیت سے آراستہ اور حقیقت انسانیت سے آشاہیں، ان انسان نما آدمیوں کا ذکر نہیں جو انسانیت کا خول اور صورت ہی صورت ہیں، جو اپنے نفس کے مائے ہوئے اور خواہشات نفس کے قلیل ہیں، یہ آدمی نہیں ہیں، آدمی کی بے جان تصویریں ہیں۔

ایں نہ مردانند اینہا صورت اند
مردہ نان اند و کشتہ شہوت اند^۵

۱۔ یعنی ۵۱۲ ۲۔ ایضاً ۵۱۵ ۳۔ ایضاً ۵۱۷ ۴۔ ایضاً ۵۱۹ ۵۔ ایضاً ۵۲۱

ہر زمانہ کی طرح مولانا کے زمانہ میں بھی حقیقی انسان کیباب اور عنقا صفت تھا، عام طور سے وہی انسان ملتے تھے، جو چوپایوں اور درندوں کے اخلاق رکھتے تھے، مولانا ان بہائم صفت اور درندہ خصلت انسانوں سے اکتا گئے تھے اور ان کو "انسان" کی تلاش تھی، اپنی تلاش تھی، اپنی تلاش کا واقعہ ایک دلچسپ مکالمہ کی شکل میں بیان فرماتے ہیں۔

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر
کز وام و دو ملوم و انسا تم آرزوست
زین ہمرہان سست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و ستم و ستا تم آرزوست
گفتم کہ یافت می نہ شود جسته ایم ما
گفت آن کہ یافت می نشود آتم آرزوست^۱

دعوتِ عمل

مولانا کا تصوف اور ان کی تلقین، تعطل، بے عملی اور رہبانیت کی مبلغ نہیں، وہ عمل، جدوجہد، کسب اور اجتماعی زندگی کے داعی اور مبلغ ہیں، رہبانیت اور ترک دنیا کو اسلام کی روح کے منافی اور تعلیمات نبوت کا مخالف سمجھتے ہیں، ان کے نزدیک اگر اجتماعی زندگی مطلوب نہ ہوتی تو جمعہ و جماعت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تاکید کیوں ہوتی، فرماتے ہیں۔

مرغ گفتش نواجہ در خلوت مایست
دین احمد را تر تہب نیک نیست

از تر تہب نہی فرمود آن رسول
بدعتے چوں در گرفتے اے فضول

جموعہ بشرط است و جماعت در نماز
امر معروف و ز منکر احتر از

در میان امت مرحوم باش
سنت احمد مہمل محکوم باش^۲

ان کے زمانہ میں توکل تعطل محض کا مراد بن کر رہ گیا تھا، کسی قسم کی احتیاط و انتظام توکل

۱۔ ایضاً ۵۲۵ ۲۔ ایضاً ۵۲۷

کے منافی سمجھا جاتا تھا، اور بری نظر سے دیکھا جاتا تھا، مولانا نے توکل کا شرعی مفہوم بیان کیا، اور کسب کی ترغیب دی، اور اس کی تفصیلت بیان کی "اعقلها و توکل علی اللہ" کا مضمون حدیث بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:-

گفت پیغمبر باواز بلند با توکل زانویے اشتربہ بند
رمز انکاسب حبیب اللہ شنو از توکل در کسب کاہل مشو
رُو توکل کن تو با کسب لے عمو جہد می کن کسب می کن موبو
جہد کن جدے نہاتا و ارہی در تو از جہدش بہانی ابلہی

انہوں نے کمزور جانوروں کی زبان سے توکل و تعطل کے وہ تمام دلائل نقل کر دیئے ہیں جو عام طور پر ضعیف الہمت اشخاص پیش کیا کرتے ہیں، یہ دلائل بڑے معقول اور روزنی معلوم ہوتے ہیں، پھر ان کا تفصیل سے جواب دیا ہے، شیر کا جواب مولانا کے اصلی خیالات کا آئینہ ہے۔

شیر کی زبان سے وہ فرماتے ہیں کہ انسانوں کو جو اعضا و جوارح اور جو صلاحیتیں اور طاقتیں دی گئی ہیں ان سے خود ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے کوشش اور جہد و جہد مطلوب ہے، اگر کوئی شخص اپنے غلام کے ہاتھ میں کدال یا پھاوڑا دے دے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس سے وہ زمین کھودے، یا چٹان توڑے اس کے لئے زبان سے کہنے کی کچھ ضرورت نہیں، اسی طرح جب ہم کو ہاتھ پاؤں اور کام کرنے کی قدرت دی گئی ہے تو اس کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ ہم اپنے ہاتھ پاؤں اور جسمانی قوت سے کام لیں، اور اپنے ارادہ و اختیار کو عمل میں لائیں، اس بنا پر سعی و عمل اور کسب و جہد عین خدا کی مرضی اور فطرت کا اشارہ ہے، اور تعطل اور ترک عمل منشاء الہی کے خلاف اور کفرانِ نعمت ہے، صحیح توکل یہ ہے کہ کوشش میں کمی نہ کی جائے، اور نتیجہ کے باسے میں خدا پر پھر و رسہ کیا جائے، کیونکہ کامیابی خدا کے ہاتھ میں ہے، فرماتے ہیں:-

گفت شیر آری دے رب العباد نرد بانے پیش پائے ما نہاد
پایہ پایہ رفت باید سوئے بام ہست جبری بودن اینجا طمع خام
پائے داری چوں کنی خود را تو لنگ دست داری چوں کنی پہناں تو چنگ
خواجہ چوں بیلے دست بندہ داد بے زبان معلوم شد اور امراد
چوں اشارتہاں را بر جان نہی در وفائے آن اشارت جان دہی
پس اشارت ہاں اسرار ت دہد بار بردار و ز تو کارت دہد
سعی شکر نعمت قدرت بود جبر تو انکار آن نعمت بود
شکر نعمت نعمت افزون کند کفر نعمت از کفایت بیرون کند
ہاں محسپ اے جبری بے اعتبار جز بزییر آن درخت میوہ دار
تا کہ شاخ افشاں کند ہر بخت باد برس خفتہ بریز و نقل و زاد
گر تو کل می کنی دو کار کن کسب کن پس تکیہ بر جبار کن

پھر شیر کی زبان سے وہ اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ جہد و جہد اور سعی و عمل سنت انبیاء اور طریق اولیاء ہے، پھر وہ یہ نکتہ بیان کرتے ہیں کہ مال و اولاد دنیا نہیں ہے، جس کی شریعت میں مذمت ہے، اور جو خدا کی رحمت سے دور ہے وہ غفلت کی زندگی ہے، وہ فرماتے ہیں:-

شیر گفت آئے و لیکن ہم بسیں جہد ہائے انبیاء و مرسلین
حق تعالیٰ جہدشان را راست کرد انچہ دیدند از جفا و گرم و سرد
جہد می کن تا توانی اے کیا در طریق انبیاء و اولیاء
چسیت دنیا از خدا غافل بدن نے قماش و نقرہ فرزند وزن

مال را گر بہر دین باشی حمول
نعم مال صاِح گفت آن رسول
بہد حق است و دوا حق است درد
منکر اندر نفی جہدش جہد کرد

وہ صرف اپنے زمانہ کے عوام ہی پر تنقید نہیں کرتے، اور صرف ان غلطیوں ہی پر نہیں ٹوکتے، جن کا تعلق علمی اور دینی حلقوں سے ہے، بلکہ وہ پوری جرأت کے ساتھ اس طبقہ کی بھی تنقید کرتے ہیں، جن کے ہاتھ میں زمام حکومت تھی، وہ بر ملا اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں کہ حکومت نا اہلوں کے ہاتھ میں آگئی ہے اور بازیچہ اطفال بن گئی ہے، مطلق العنان شخصی سلطنت کے زمانہ میں یہ تنقید بڑے خطرناک نتائج پیدا کر سکتی ہے، مگر مولانا کی حق گو زبان خاموش نہیں رہتی، وہ فرماتے ہیں:-

حکم چوں بردست زنداں اوقناد
لاجرم ذوالنون بزندان اوقناد

چوں قلم دردست غدارے بود
لاجرم منصور بردارے بود

چوں سفیہاں را بود کار و کیا
لازم آمد یثیثون الانبیاء

حکومت کے غلط ہاتھوں میں ہونے کا نتیجہ بیان کرتے ہوئے اپنے زمانہ کی شکایت فرماتے ہیں:-

حکم چوں دردست گمراہے بود
جاہ پندارید و در چاہے قتاد

احتمال سردرشدستند وز بیم
عاقلاں سر با کشیدہ در گلیم

عقائد و علم کلام

مولانا نے عقلیات و حیات پر صرف تنقید اور اپنے زمانہ کے علم کلام کی بے اعتدالی، ظاہر پرستی اور لفظی معرکہ آرائی پر گرفت ہی نہیں کی، اور صرف باطنی احساسات و وجدان اور روح سے کام لینے اور عشق کی دعوت دینے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ کلامی مسائل و مشکلات کو اپنے مخصوص انداز سے حل کرنے

اور اپنے مخصوص پیرایہ میں بیان کرنے اور دل نشیں کرنے کی کوشش بھی کی ہے، گویا مولانا کی دعوت اور ان کا فلسفہ صرف سلبی اور ناقذانہ ہی نہیں ہے، بلکہ ایجابی اور عملی بھی ہے، جن مسائل کے حل کرنے میں علم کلام کے بازو شل ہو کر رہ گئے ہیں، اور جن گتھیوں کے سلجھانے کی کوشش میں اور بے شمار گتھیاں پڑ گئی ہیں، مولانا ان مسائل کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ گویا ان میں کوئی پیچیدگی ہی نہیں تھی، اور وہ بدیہی حقائق اور روزمرہ کی زندگی کی باتیں اور واقعات ہیں، مولانا کا خاص طرز یہ ہے کہ وہ دماغ کو شکست دینے کی اور مخاطب کو لاجواب کرنے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ اپنی بات کو اس کی خوشی اور رضامندی سے دل میں بٹھانے اور ذہن میں اتارنے کی کوشش کرتے ہیں، اور مخاطب کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ بات پہلے سے اس کے دل میں تھی، اور مولانا نے اس کی ترجمانی کی ہے، اس طرز کلام کا نتیجہ یہ ہے کہ مثنوی سے دینی اصول و عقائد اور متکلمانہ مسائل و مباحث کے بارہ میں ایسا اذعان، شرح صدر اور اطمینان قلب پیدا ہوتا ہے، جو علم کلام کے پورے کتب خانہ سے نہیں پیدا ہوتا اس کے ساتھ ساتھ ایک ذوق و سرور بھی پیدا ہوتا ہے، جو ایک صاحب یقین اور صاحب عشق ہی کے کلام سے پیدا ہو سکتا ہے۔

مولانا اگرچہ اشعری مکتب خیال کے ایک کہنہ مشوق استاد اور تبحر عالم ہیں، مگر وہ اپنے ذاتی تجربہ اور موہبت ربانی سے عقائد و کلام میں مجتہد کا درجہ رکھتے ہیں، اور ایک نئے علم کلام کے بانی ہیں ان کی روش عام متکلمین اور علمائے عقائد سے بالکل علیحدہ ہے، اور نسبتاً قرآن مجید کے طرز استدلال اور فطرت سلیم سے زیادہ قریب ہے۔

وجود باری

وجود باری کا مسئلہ علم کلام اور تمام مذاہب کا معرکہ الآرا اور بنیادی مسئلہ ہے، قدیم علم کلام نے

اس کے جو دلائل دیئے ہیں، وہ محض منطقی ہیں، ان سے اذعان اور یقین کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی، زیادہ سے

زیادہ آدمی لاجواب ہو کر رہ جاتا ہے، قرآن مجید کا طرز یہ ہے کہ وہ اس بارہ میں انسان کی فطرتِ سلیم کو اسکا تا ہے اور اس پر اظہارِ اعتماد کر کے اس کے سوئے ہوئے احساس کو بیدار کر دیتا ہے، وہ پیغمبر کی زبان سے بے ساختہ کہلو اتا ہے۔

اِنِّیْ اٰتٰی اللّٰهَ شَکُّ فَا طَرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
بھلا اللہ کے بارہ میں بھی شک ہو سکتا ہے جو آسمان

(ابراہیم - ۱۰) زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔

اس بیساختگی اور استعجاب سے انسان کی فطرت چونک پڑتی ہے اور وہ اپنا صحیح کام کرنے لگتی ہے، پھر زمین و آسمان کی پیدائش سے پیدا کرنے والے مصنوعات سے صالح اور آثار سے موثر کی طرف دفعۃً رہبری ہو جاتی ہے، سائے قرآن مجید میں یہی طرز استدلال ملے گا کہ اللہ کی نشانیاں دیکھو، اور مخلوقات سے خالق اور مصنوعات سے صالح تک پہنچو، قرآن کے نزدیک خدا کی معرفت کا یہی یقینی، مختصر اور بے خطر راستہ ہے۔

سَنُرٰیہُمْ اَیَّ اٰیٰتِنَا فِی الْاَفَاقِ وَفِیْ اَنْفُسِہُمْ
حَتّٰی یَتَّبِعُوْنَ لَہُمْ اٰیٰۃً الْمَعٰتُ ذٰوْلَہُمْ یَلْفُ
بِرَبِّکَ اِنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ ۝

(ہم السجدہ ۵۳) ان پر کہ یہ ٹھیک ہے، کیا تیرا رب تھوڑا ہے ہر چیز پر گواہ ہونے کے لئے۔

مولانا نے بھی ثنوی میں یہی طرز استدلال اختیار کیا ہے، وہ جا بجا کائنات سے خالق کائنات کے وجود پر استدلال کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں بہت کچھ ہوتا ہوا نظر آتا ہے، لیکن کرنے والا ان ظاہری آنکھوں سے نظر نہیں آتا، مگر جو کچھ ہو رہا ہے، یہ خود اس کی دلیل ہے کہ اس پردہ کے پیچھے کوئی کرنے والا ہے، لیکن فعل ظاہر اور فاعل مخفی ہے۔

دست پہنان و قلم بین خط گزار
اسپ در جولان و ناپید اسوار

تیر پیدا میں و ناپید امکان
جانہا پیدا و پنہاں جان جان
لیکن حرکت خود محرک کے وجود کی دلیل ہے، اگر کہیں ہو اکی سنسا ہٹ ہے تو سمجھ لو کہ ہو ا کا چلانے والا بھی ہے۔

باد را دیدی کہ می جنبد بدان
باد جنبنا نیست اینجا با دران
پس یقین در عقل ہر دانندہ ہست
اس کہ با جنبیدہ جنبانندہ ہست

اگر تھیں موثر نظر نہیں آتا تو آثار تو نظر آتے ہیں ان آثار سے سمجھ لو کہ موثر ضرور ہے جسم میں حرکت و زندگی روح سے ہے، روح اگر یہ نظر نہیں آتی، مگر جسم کی حرکت اس کا ثبوت ہے۔

گر تو اور امی نہ بینی در نظر
فہم کن آں را با ظہار اثر
تن بجان جنبد نمی بینی تو جان
لیک از جنبیدن تن جان بدان

موثر کے لئے اس کے آثار اور صالح کے لئے اس کے مصنوعات سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے؟
آفتاب کے وجود کے لئے اس کی روشنی سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہے؟

خود نباشد آفتابے را دلیل
جز کہ نور آفتاب مستطیل

پھر کائنات صرف موجود ہی نہیں ہے، بلکہ منظم، باقاعدہ اور مرتب ہے، ہر چیز اپنے چوکھٹے میں جڑی ہوئی ہے، سیاروں کی گردش کا ایک نظام ہے، آفتاب و ماہتاب کے لئے بھی اصول و ضوابط ہیں، ابر و باد بھی سپیل بے زنجیر نہیں کہ جدھر کو چاہیں، اُدھر کو چل دیں، ان کے لئے بھی تازیانہ مقرر ہے، اگر ذرا سرتابی کریں، فوراً گوشمالی کی جائے، یہ نظام و ترتیب صاف اس بات کا ثبوت ہے کہ کائنات کے اوپر کائنات کا خالق اور مدبر ہے، اور وہ حکیم و علیم بھی ہے، اور کائنات اس کے اختیار و انتظام سے کسی وقت خارج نہیں۔

لہ ثنوی ۳۰۵ ۳۰۶ ایضاً ۳۰۷ ایضاً ۳۰۸ ایضاً

گرمی یعنی تو تدبیر تدر
در عناصر، گردش و جوشش نگر
آفتاب و ماہ دو گاہ و خراس
گردمی گردندومی دارند پاس
اختران ہم خانہ خانہ می روند
مرکب ہر نفس و سعدے می شوند
ابراہم تازیانہ آتشیس
می زند کہ ہاں چنین رونے چنین
برفلان وادی بارایں سو بار
گو شمش می دہد کہ گوش دار

پھر وہ فرماتے ہیں کہ اس کائنات کو خالق کائنات نے اپنے فائدہ کے لئے نہیں پیدا کیا، بلکہ انسان کے فائدہ اور اس کی ترقیات کے لئے پیدا کیا ہے، اس طرح وہ خلق عالم کی مصلحت کو جس میں فلاسفہ و متکلمین سرگرداں ہیں، بڑے دل نشین پیرایہ میں بیان کرتے ہیں، اس میں بھی ان کا البیلاپن اور سروسستی موجود ہے۔

گفت پیغمبر کہ حق فرمودہ ست
قصد من از خلق احسان بودہ ست
آفریدم تا ز من سو دے کنند
تا ز شہدم دست آو دے کنند
نے برائے آن کہ من سو دے کنم
در برہنہ من قبائے برکم
من نہ کردم خلق تا سو دے کنم
بلکہ تا بر بندگاں جو دے کنم

نبوت اور انبیاء

انبیاء علیہم السلام کا تعارف وہ خود ان کی زبان سے کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ وہ طیبیان الہی اور معالجین قلوب ہیں، طیب نبض سے دل تک پہنچتے ہیں، انبیاء براہ راست دل تک پہنچ جاتے ہیں، طیبیوں نے صحت جسمانی کے بقا، اور انبیاء دلوں کی شفا اور اخلاق و اعمال کی اصلاح اور اعتدال پر توجہ دی ہے،
ما طیبیا نیم شاگردان حق بحر قلزم دید مارا فانطلق

آن طیبیان طبیعت دیگر اند
کہ بدل از نبضے بنگرند
مابدل بیواسطہ خوش بنگریم
کز فراست ما بہ اعلیٰ منظریم
آن طیبیان غذا نیند و شمار
جان حیوانی بدیشاں استوار
آن طیبیان فعالیم و مقال
ملہم ما پر تو نور جلال
کایں چنین فعلے ترانافع بود
واں چناں فعلے زرہ قاطع شود
ایں چنین قولے ترا پیش آورد
واں چناں قولے ترانیش آورد
آن چناں وایں چنان از نیک بد
پیش تو بنیم و بنمایم جد
آن طیبیان را بود بوسے دلیل
وین دلیل ما بود و حی جلیصل

دلائل نبوت میں بھی وہ عقلی دلائل و مقدمات سے استدلال کرنے کے بجائے عموماً ذوقی اور وجدانی دلائل سے استدلال کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر کی ہر ادب تلماتی ہے کہ وہ پیغمبر ہے، وہ سرتاپا اعجاز ہوتا ہے دیکھنے والوں کے لئے (بشرطیکہ ان میں عناد اور تکبر نہ ہو) وہ خود اپنی نبوت کا دلیل ہوتا ہے، یہی وہ چیز ہے کہ عبداللہ بن سلام نے جمال جہان آرا پر نظر پڑتے ہی بے ساختہ فرمایا تھا:۔

وَ اِنَّ هٰذَا لَیْسَ بِوَجْہِ کَذٰبٍ
بجدا یہ کسی دروغ گو کا چہرہ نہیں ہو سکتا۔

در دل ہر کس کہ دانش رامزہ است
رود آواز پیغمبر معجزہ است

وہ فرماتے ہیں کہ پیغمبر اور امت کے ضمیر میں ایک ایسی مناسبت ہوتی ہے کہ پیغمبر جو کچھ کہتا ہے، امت کا ضمیر اس پر آمنا و صدقاً ہی پکارتا ہے، امت کا ضمیر پیغمبر کی ہر صدا پر وجد کر تلے اس لئے کہ وہ صدایسی دلکش، ایسی معصوم اور دنیا میں ایسی انوکھی اور نرالی ہے کہ اس میں اور کسی صدا اور دعوت میں کوئی مناسبت اور کسی اشتباہ کا موقع نہیں، فرماتے ہیں:۔

چوں پیمبر از بروں بانگے زند جان امت در دروں سجدہ کند
 زانکہ جنس بانگ او اندر جہان از کسے نشیندہ باشد گوش جان
 آن عزیز از ذوق آواز عزیز از زبان حق شنود اتی قریبے
 وہ کہتے ہیں کہ سننے والوں کو پیغمبر کی صداقت کے لئے کسی خارجی دلیل کی ضرورت نہیں ان کا کہنا
 دعویٰ بھی ہے اور دلیل بھی اور نظام عالم اسی پر قائم ہے پیاسے کو (بشرطیکہ سچی پیاس ہو) پانی کی دعویٰ
 دی جاتی ہے تو وہ پانی کا ثبوت نہیں مانگتا، بچہ کو ماں دودھ پلانا چاہتی ہے تو وہ دلیل کا انتظار نہیں کرتا
 طلب اور محبت اعتماد اور پیش قدمی کے لئے کافی ہے۔

تشنہ را چوں بگوئی تو تشاب در قرح آب است بستان زود آب
 ہیچ گوید تشنہ کس دعویٰ است رد از برم اے مدعی! مہجور شو،
 یا بطفل شیر مادر بانگ زد کہ بیامں مادر مہاں اے ولد
 طفل گوید مادر حاجت بیار تاکہ با شیرت بگیرم من قرار

ان کے نزدیک معجزہ موجب ایمان نہیں ہے یعنی ضروری نہیں کہ معجزہ دیکھنے والا ایمان
 لے ہی آئے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ معجزہ دیکھ کر ایمان لانے والوں کے نام سیرت میں مشکل سے
 ملیں گے، مشاہیر صحابہ وہی ہیں جو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر ایمان لائے تھے اور اصل
 ایمان ان ہی کا ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ معجزات تو مغلوب اور لاجواب کرنے کے لئے ہیں اور جو
 مغلوب و لاجواب ہوتا ہے وہ مشکل سے یارِ غار اور جان نثار بنتا ہے، اصل کشش اور تسخیر کی
 چیز جنسیت اور مناسبت ہے۔

موجب ایمان نباشد معجزات بولے جنسیت کند جذب صفت

معجزات از بہر قہر دشمن است بولے جنسیت سوے دل بردن است
 قہر گردد دشمن آنا دوست نے دوست کے گرد رہے بستہ گردنے
 انبیاء کے تذکرہ میں وہ فرماتے ہیں کہ وہ بڑے غیور اور خود دار ہوتے ہیں ان سے استفادہ کے لئے
 ادب اور نیاز مندی شرط ہے، وہ سلطان مزاج ہیں ان کا منصب یہ ہے کہ وہ فرمائیں اور دوسرے
 سنیں، معارضہ اور مجادلہ محرومی کا باعث اور حجاب اکبر ہے۔

گر ہزاراں طالب اندو یک ملول از رسالت بازمی ماند رسول
 این رسولان ضمیر را ز گو مستمع خواہند اسرافیل خو
 نخوتے دازند و کبرے چون شہان چاکری خواہند از اہل جہان
 تا ادبہا شان بجاگ نادری از رسالت شان چگونہ بر خوری
 فرماتے ہیں کہ اور ایسا کیوں نہ ہو یہ بھی تو دیکھو کہ وہ کہاں سے آئے ہیں اور کس کا پیام لائے ہیں۔
 ہر ادب شان کے ہی آید پسند کا مدد نشان ز ایوان بلند

معاد

مولانا کے نزدیک موت حقیقی زندگی کا پیش خیمہ اور انسان کی ترقی کا زمینہ ہے، آبادی ویرانی
 کے بغیر ممکن نہیں، خزانہ جب ہی دستیاب ہوتا ہے جب زمین کھودی جاتی ہے، جب بنے ہوئے مکان
 کو ویران کیا جا رہا ہو تو سمجھ لو کہ دوبارہ آباد کرنے کا سامان کیا جا رہا ہے۔

شاہ جان جسم را ویران کند بعد ویرایش آبادان کند
 کرد ویران خانہ بہر گنج وزر وزہان گنجش کند معمور ترا

اس جسم خاکی کی شکست ایک بڑی تعمیر کی علامت ہے، کلی کے چٹکنے سے سمجھ لینا چاہئے کہ پھل

آنے والے ہیں۔

چون شگوفہ ریخت میوہ سر کند چونکہ تن بشکست جان سر بر کند

وہ جو اذمطلق، وہ فیاض برحق، جان جیسی دولت دے کر کیسے بالکل چھین لے گا، اس لئے سمجھنا

چاہئے کہ وہ زار و نزار جان لے کر زندگی جاوداں عطا فرمانا چاہتا ہے، وہ اس خاکدان سے نکال کر

وہ نعمتیں عطا فرمانا چاہتا ہے، جو وہم و خیال میں بھی نہیں: مَا لَآعِينَ رَأَتْ وَلَا آذَنٍ سَمِعَتْ، وَلَا

خَطَرَ عَلَى قَلْبٍ بَشَرٍ

آں کے اکثر کہ چیں شاہے کشد سوائے تخت و بہترین جاہے کشد

نیم جان بتاند و صد جان دہد انچہ درد ہمت نیاید آن دہد

ترقی کے مدارج عالیہ کے لئے فنا اور نیستی ضروری ہے، کبھی کسی نے اگلی تختی دھوئے اور پرانے

نقش مٹائے بغیر تختی لکھی ہے؟ کبھی مٹی نکالے بغیر زمین کے اندر سے پانی نکلا ہے؟ لکھنے کے لئے آدمی

سادہ کاغذ اور بونے کے لئے آدمی خالی زمین ڈھونڈتا ہے۔

لوح را اول بشوید بے وقوف آنگہ بروے نو سید او حروف

وقت شستن لوح را باید شناخت کہ مرآن را دفترے خواہند ساخت

چون اساس خانہ، تو افگند اولین بنیاد را بر می کنند

گل بر آرد اول از قعر زمین تا باخر بر کشی مار معین

کاغذے جوید کہ آن بنوشند نیست تم کار د موضع کہ کشته نیست

نیستی ہی ہستی کا استحقاق پیدا کرتی ہے، اور خالق کی رحمت کو جوش میں لاتی ہے، منعم

ہمیشہ فیروں ہی پر سخاوت کرتے ہیں۔

ہستی اندر نیستی بتواں نمود مالداران بر فقیر آرنند جود

تم خود اپنی حالت پر غور کرو، تم برابر ارتقا کے منازل طے کرتے آئے ہو، اور لوٹ پھوٹ، کا

سلسلہ برابر جاری رہا ہے، تم نے ایک جامہ ہستی اتارا، دوسرا پہنا، ایک فنا سے تم نے بقا حاصل

کیا، اگر تم پہلی حالت پر رہتے، تو تم کو یہ ترقی و کمال کہاں سے حاصل ہوتا، اور تم آب و گل میں مقید رہتے،

اب آخری ترقی سے کیوں گھبراتے ہو، اور تمہارا طائر روح قفسِ عنصری سے نکلتے ہوئے کیوں ڈرتا ہے۔

تو ازان روزے کہ در ہست آدمی آتشی یا خاک، یا بادے بدی

گر بدان حالت ترا بودے بقا کہ رسیدے مرتزا این ارتقا

از مبدل ہستی، اول نمناند ہستی دیگر بجائے اوفشانند

این بقا ہا از فنا ہا یافتی از فنایش روچرا بر تافتی

این فنا ہا چہ زیان بودت کہ تا بر بقا چسبیدہ اے بے نوا

اس لئے دراصل موت، موت نہیں زندگی کی تہید ہے، اور مرنے کا دن مومن کے لئے شامِ غم

نہیں صبحِ عید ہے۔

آزمودم مرگ من در زندگی است چون رہم زین زندگی پابند گیت

عارفوں کی موت کو عامیوں کی موت پر قیاس نہیں کرنا چاہئے، ان کو اس جہانِ فانی سے

چھوٹنے کا غم نہیں ہوتا، موت ان کے لئے مژدہ جانفزا، اور موت کا جھونکا ان کے حق میں بادِ بہاری

بن کر آتا ہے، قومِ عاد پر جو ہوا چلائی گئی تھی، وہ حضرت ہود اور ان کے ساتھیوں کے لئے نسیم بن گئی تھی۔

ہود گرد مومناں خطے کشید نرم می شد باد کا نجامی رسید

ہمچنین باد اجل با عارفان نرم و خوش ہجو نسیم بوستان

جبر و اختیار

جبر و اختیار کی بحث علم کلام کی مشکل ترین بحثوں میں سے ہے، ایک فرقہ اختیار کا منکر اور جبر محض کا قائل ہے، اور عقائد و فرق کی تاریخ میں جبر یہ کے لقب سے مشہور ہے، مولانا فرماتے ہیں کہ اگر انسان مجبور محض ہوتا، تو وہ خدا کی طرف سے امر و نہی کا مخاطب کیوں بنتا، اور شریعت کے احکام اس کی طرف کیوں متوجہ ہوتے، کیا کسی نے کسی پتھر کو بھی حکم دیتے سنا ہے۔

جبر لاشیٰ گوید کہ امر و نہی راست اختیار سے نیست دین جملہ خطا است
جملہ قرآن امر و نہی است و عید امر کردن سنگ مرمر را کہ دید

فرماتے ہیں کہ اختیار کا عقیدہ انسان کی فطرت میں داخل ہے اور وہ روزمرہ کی زندگی میں اس عقیدہ کا اقرار اور جبر کا انکار کرتا رہتا ہے، کسی پرچھت کی لکڑی گر جاتی ہے تو اس کو چھت پر غصہ نہیں آتا، سیلاب سامان بہا لے جاتا ہے، تو کسی کو اس پر غصہ اتارتے نہیں دیکھا گیا، ہوا کسی کی پگڑی اڑا لے جاتی ہے، تو کوئی ہوا سے نہیں لڑتا، سب جانتے ہیں کہ یہ مجبور و بے قصور ہیں، البتہ انسان کے ساتھ انسان کا یہ معاملہ نہیں، گویا صرف وہی صاحب اختیار ہے۔

گر ز سقف خانہ چوبے بشکند بر تو افتد سخت مجروح است کند
ہیچ خشم آیدت بر چوب سقف ہیچ اندر کین او باشی تو وقت
کہ چرا بر من زد و دستم شکست با چرا بر من فتاد کرد پست
واں کہ قصد عورت تو می کند صد ہزاراں خشم از تو سرزند

در بیاید سیل رخت تو برد ہیچ با سیل آورد گیتی خورد
گر بیاید باد و دستارت ر بود کے ترا بباد، دل خستہ نمود
خشم در تو شد بیان اختیار تانہ گوی جبر یا نہ اعتذار

وہ ایک قدم آگے بڑھا کر فرماتے ہیں کہ جانور تک جبر و قدر کے مسئلہ سے فطری طور پر واقف ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آلات و جمادات کا کچھ قصور نہیں، کتے کو بھی اگر پتھر مارا جائے، تو وہ پتھر پر نہیں لپکتا، بلکہ انسان کے پیچھے دوڑتا ہے، شتر بان اونٹ کو مارتا ہے، تو اونٹ کو لکڑی پر غصہ نہیں آتا، شتر بان سے انتقام لینا چاہتا ہے، جب حیوان تک اس حقیقت سے واقف ہیں، تو انسان کو جبری بننے سے شرم آنی چاہئے۔

ہمچنین گر برسگے سنگے زنی بر تو آرد رود گردد منثنی
گر شتر بان اشترے رامی زند آن شتر قصد زندہ می کند
خشم اشتر نیست با آن چوبابو پس ز مختاری، شتر بردہ است بو
عقل حیوانی چو دانست اختیار این گواے عقل انسان شرم دار
روشن است این لیک ز طعم سحر آن خوردند چشم بر بند ز نور
چونکہ کلی میل آن نان خورد نیست روبہ تاریکی کند کہ روز نیست

علت و معلول

اسباب و علل کے بارہ میں اسلامی فرقوں میں بڑی افراط و تفریط تھی، حکما کے نزدیک کائنات میں علت و معلول کا سلسلہ قائم ہے، اور طول کبھی علت، سبب کبھی سبب سے مختلف نہیں ہو سکتا، معتزلہ بھی اس رائے سے بڑی حد تک متاثر نہیں، ان کا بھی رجحان یہی ہے کہ جو چیز جس کی علت مان لی گئی، جس شے کا

جو خاصہ اور اثر تسلیم کریا گیا، اس میں تغیر و انقلاب کا بہت کم امکان ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ بڑی مشکل سے خرق عادت کا وجود تسلیم کرتے ہیں، اور کسی شئی کے اپنے خاصہ کے خلاف وقوع پذیر ہونے اور کسی حادثہ کے بغیر سبب کے وجود میں آنے کو بہت بعید سمجھتے ہیں، اشاعرہ دوسرے سرے پر ہیں، ان کے نزدیک کوئی چیز کسی چیز کی علت نہیں، نہ کسی شئی میں کوئی خاصہ اور تاثیر ہے، اس بے اعتدالی اور انتہا پسندی سے بھی نقصان پہنچا، اور ہر شخص کو ہر بات کہنے اور اسباب کے انکار و ترک کا بہانہ مل گیا، اور اس کے ایک بے نظمی اور تعطل پیدا ہوا۔

مولانا کا مسلک ان دونوں سروں کے درمیان ہے، وہ اعتراف کرتے ہیں کہ اسباب کی ایک حقیقت ہے، اور علل و معلومات اسباب و مسببات کا ایک سلسلہ ہے، جس کا انکار نہ ممکن ہے، نہ معقول، عام سنتہ الشریعی ہے کہ مسببات اسباب کے تابع ہوں، اور اشیاء سے ان کے خواص برآمد ہوں، البتہ خرق عادت ممکن ہے، اور کبھی کبھی اس کا وقوع ہوتا ہے، فرماتے ہیں:-

بیشتر احوال بر سنت رود گاہ قدرت خارق سنت شود

سنت و عادت نہادہ بامزہ باز کردہ خرق عادت معجزہ

بے سبب گریز بہ موصول نیست قدرت از عزل سبب معزول نیست

عام لوگ نہی اسباب کو دیکھتے ہیں، اور معذور ہیں کہ ان کو کچھ اور نظر نہیں آتا:-

حاصل آنکہ در سبب پیچیدہ لیک معذوری ہمیں را دیدہ

فرماتے ہیں کہ بیشک قطع اسباب مناسب نہیں، اسباب کی ایک حقیقت ہے، لیکن سبب الاسباب سے بھی بالاتر حقیقت ہے، وہ سبب الاسباب رب الاسباب اور قادر مطلق ہے، اس طرح اسباب پرستی نہ کرنے لگو کہ قادر مطلق کو بالکل معزول و معطل سمجھنے لگو۔

اے گرفتار سبب بروں میرے لیک عزل آن مسبب ظن میرے
ہرچہ خواہد آن مسبب آورد قدرت مطلق سببہا بردرد

یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ اسباب صرف وہی نہیں ہیں جو ہمارے علم اور مشاہدہ میں ہیں، بلکہ ان اسباب ظاہری سے اور کچھ اسباب اور ہیں، جو ہماری نظر سے اوجھل ہیں، یہ اسباب باطنی ان اسباب ظاہری کے لئے اس طرح سے سبب اور محرک ہیں، جس طرح یہ اسباب ظاہری مسببات و نتائج کے لئے سبب حقیقی اسباب ظاہری کو کبھی متحرک و عامل کر دیتا ہے، اور کبھی بیکار و معطل کر کے رکھ دیتا ہے، سبب اعلیٰ اور اصل سبب ارادہ الہی اور امر الہی ہے:-

سنگ بر آہن زنی آتش جہد ہم با مرتق قدم بیروں نہد

سنگ و آہن خود سبب آمد و لیک تو بالاتر نگر اے مرد نیک

کایں سبب را آن سبب آرد پیش بے سبب کے شد سبب ہرگز بخوش

این سبب را آن سبب عامل کند باز گاہے بے پردہ عامل کند

ہم جس طرح ان اسباب ظاہری کو جانتے پہچانتے ہیں، انبیاء کرام ان اسباب حقیقی کو دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں:-

واں سبب ہا کا بنیاد را بر است آن سببہا زین سببہا برتر است

این سبب را محرم آمد عقل ما واں سببہا راست محرم انبیاء

وہ اسباب حقیقی اسباب ظاہری کے حاکم اور ان پر غالب ہیں:-

ہست بر اسباب اسباب دگر در سبب منگرد را ان فکرن نظر

یہ اسباب ظاہری اسباب حقیقی کے سامنے بہت حقیر و ضعیف ہیں، معاملہ حقیقی اسباب ہی سے وابستہ ہے۔

این سبب ہجو مرین است و علیل
شب چراغت را فقیلے تو تباب
این سبب ہجو چراغ است و قنیل
پاک دان زینہا چراغ آفتاب

انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں چونکہ ساری دنیا اسباب ظاہری میں ابھی ہوتی ہے اور اسباب پرستی اپنے پورے عروج پر ہوتی ہے، خالق اسباب اور اس کی قدرت مطلقہ بالکل نگاہوں سے اوجھل اور دعاگوں سے محو ہو چکی ہوتی ہے اور عالم کا عالم منکر اور ظواہر و مظاہر پرستی میں گرفتار ہوتا ہے، اس لئے انبیاء علیہم السلام اسباب پر ضرب لگاتے ہیں اور اسباب کے بجائے سبب اور قادر مطلق کی طرف متوجہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ بھی ان کے ہاتھوں سے سلسلہ اسباب کے بالکل خلاف واقعات ظاہر کر کے اور معجزات دکھا کر اسباب کی بے حقیقتی اور کمزوری ظاہر کرتا ہے۔

انبیاء در قطع اسباب آمدند
بے سبب بر بحر را بشکا فتنند
معجزات خویش بر کیوان زدند
بے زراعت چاش گندم یافتند
ریگہا ہم آرد شد از سعی شان
پشتم برابر شتم آمد کشکشان
جملہ قرآن است در قطع سبب
عز و درویش و ہلاک بولہبے

لیکن اللہ تعالیٰ کی عمومی عادت اور سنت جاریہ اسباب سے مسببات کا وجود ہے اور اس سے بندوں کو سعی و تعلیم مقصود ہے۔

لیک غلب بر سبب راند نفاذ
تا بد اند طالے جستن مراد

اسی انداز پر مولانا ان تمام کلامی مسائل اور مذہب کے اصول و عقائد کی تشریح اور تلقین کرتے چلے جاتے ہیں جن کو منکلمین و اشاعرہ کے مناظرانہ طرز استدلال اور فلاسفہ کی طلسم آرائی نے چیتان او نہایت خشک اور محدود موضوع بحث بنا دیا تھا، مولانا نے ان مباحث و حقائق کو علم کلام اور فلسفہ

کے تنگ کوچہ سے نکال کر عام فہم اور عقل سلیم کے وسیع آفاق میں لے جا کر بحث کی، اور دل نشین مثالوں، عام فہم نکتوں اور سادہ و موثر طرز بیان سے ان کو روزمرہ کی حقیقت اور زندگی کا واقعہ بنا دیا۔

تنوی کا اثر

تنوی نے عالم اسلام کے افکار و ادبیات پر بڑا گہرا اور دیر پا اثر ڈالا اسلامی ادب میں ایسی شاذ و نادر کتابیں ملیں گی جنہوں نے عالم اسلام کے اتنے وسیع حلقہ کو اتنی طویل مدت تک متاثر رکھا ہے، چھ صدیوں سے مسلسل دنیا کے عقلی، علمی، ادبی حلقے، اس کے لغتوں سے گونج رہے ہیں، اور وہ دماغ کو نئی روشنی اور دلوں کو نئی حرارت بخش رہی ہے، اس سے ہر دور میں شاعروں کو نئے مضامین، نئی زبان، نیا اسلوب ملتا رہا، اور وہ ان کے قوائے فکر اور ادبی صلاحیتوں کو ابھارتی رہی، معلمین و منکلمین کو اپنے زمانہ کے سوالات و شہات کو حل کرنے کے لئے اس سے نئے دلائل، دل نشین مثالیں، دلائل و برہکائیں، اور جواب کی نئی نئی راہیں ملتی رہیں، اور وہ اس کے سہارے اپنے زمانہ کی بے چین طبیعتوں اور ذہین نوجوانوں کو مطمئن کرتے رہے، اہل سلوک و معرفت کو اس سے عارفانہ مضامین، دقیق و عمیق علوم اور سب سے بڑھ کر محبت کا پیغام اور سوز و گداز اور جذب و مستی کا سامان ملتا رہا، اور وہ ان کی خلوتوں اور انجمنوں کو صدیوں تڑپاتی، اور گرماتی رہی، اس لئے ہر دور کے اہل محبت اور اہل معرفت نے اس کو شمع محفل اور ترجمان دل بنا کر رکھا۔

اس کے مضامین کیسے تنقید سے بالاتر اور ہر قسم کی لغزش اور خطا سے مبرا نہیں، بہت سے فاسد العقیدہ صوفیوں اور اہل ہوی نے اس سے کبھی کبھی غلط فائدہ بھی اٹھایا ہے، وحدت وجود کے قائلین کو اب بھی اس سے اپنے مسلک کے لئے دلائل و شواہد مل جاتے ہیں، وہ بہر حال ایک

انسان کا کلام ہے، جو محصوم نہ تھا، اور جس کے مضامین میں اس کے قلبی واردات اور خارجی "تاثرات" کو بھی دخل ہے، اس سب کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اپنے وقت کا ایک بڑا علمی کارنامہ اور اسلام کی عقلی برتری اور اس کی غیر فانی زندگی کا ثبوت ہے، اس نے عالم اسلام کے فکری تعطل، علمی و ادبی جمود، اور تقلیدی ادب و علم کلام پر کاری ضرب لگائی، اور اسلام کے کاروان فکر کو جو ساتویں صدی میں آمادہ قیام اور مائل بہ آرام تھا، دوبارہ متحرک و سرگرم سفر کر دیا۔

اس کا ایک اہم کارنامہ یہ ہے کہ بیسویں صدی عیسوی میں جب عالم اسلام پر دوبارہ مادیت و حسیت کا حملہ ہوا، اور یورپ کے نئے فلسفہ اور سائنس نے قلوب میں شکوک و شبہات کی تخم ریزی کی، اور ایمانیات و غیبیات کی طرف سے ایک عام بے اعتمادی پیدا ہونے لگی، اس کا رجحان بڑھنے لگا کہ ہر وہ چیز جو مشاہدہ و تجربہ کے ماتحت نہ آسکے، اور جو اس ظاہری اس کی گرفت نہ کر سکیں، وہ موجود نہیں، عقائد کی قدیم کتابوں اور قدیم طرز استدلال و علم کلام نے اس کا مقابلہ کرنے سے معذوری ظاہر کی تو ثنوی نے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کا (جو یورپ کی مادی و سیاسی فتوحات سے کم خطرناک نہ تھا) کامیاب مقابلہ کیا، اور دلوں میں دوبارہ دینی و غیبی حقائق کی وقعت، علوم انبیاء کی عظمت، عالم غیب کی وسعت، اور قلب و روح، ایمان و وجدان کی اہمیت کا نقش قائم کر دیا، اور فلسفہ و مادیت کے صد ہا زخم خوردہ نوجوانوں اور فاضلوں کو جو احاد و ارتداد کے دروازہ پر کھڑے تھے، یا ایمان و اسلام کی سرحد عبور کر چکے تھے، دوبارہ ایمان و یقین کی دولت عطا کی، ہندوستان میں ان اہل علم کی ایک بڑی تعداد ہے، جو اس حقیقت کا صاف اعتراف کرتے ہیں کہ ان کو ثنوی کی بدولت دوبارہ دولت اسلام نصیب ہوئی، اور وہ اس کے فیض سے مسلمان اور صاحب ایمان ہیں، بیسویں صدی کے سب سے بڑے مسلمان فلسفی اور فکر (ڈاکٹر سر محمد اقبال)

نے شیخ رومی کے فیض و ارشاد اور اپنے تلمذ و استر شاہ کا جا بجا اعتراف کیا ہے، اور اس کا بڑا اظہار کیا ہے کہ ثنوی نے ان کو ایک نئی روح اور ایک نیا جذبہ عطا کیا ایک جگہ فرماتے ہیں:-

پیر رومی مرشد روشن ضمیر کاروان عشق و مستی را امیر
منزلش برتر ز ماہ و آفتاب خمیر را از کہکشان ساز و طناب
نور قرآن در میان سینہ اش جام جم شرمندہ از آئینہ اش
از نئے آن نے نواز پاک زاد باز شورے در نہاد من قنادر
دوسری جگہ فرماتے ہیں:-

رومی آن عشق و محبت را دلیل تشنہ کا مان را کلامش سلسبیل

لیکن اس کے ساتھ وہ شکایت اور احتجاج کرتے ہیں کہ ایک طبقہ نے اپنی نظر اس کے الفاظ اور ظاہری مطالب میں محدود رکھی، اور اس کو جاں گدازی اور دل سوزی کے بجائے رقص و وجد کا ذریعہ بنایا۔

شرح او کردند اور اکس ندید معنی او چوں غزال از ما رسید
رقص تن از حرف او آموختند چشم را از رقص جان برد و خند

لیکن یہ نقص ہمارا ہے، ثنوی کا نہیں، ثنوی اس دور انقلاب میں بھی رفیقِ راہ بن سکتے ہیں، اس مادہ پرست دور کی سب سے زیادہ نایاب جنس سوز و گداز اور محبت پاک باز ہے:-

دل سوز سے خالی ہے نگہ پاک نہیں ہے پھر اس میں عجب کیا کہ تو بیاک نہیں ہے
وہ آنکھ کہ ہے سرمہ افرنگ سے روشن پر کار و سخن ساز ہے نمناک نہیں ہے

یہ دولت بیدار ثنوی سے حاصل کی جاسکتی ہے، عصر حاضر کے نوجوانوں کو وصیت کرتے ہوئے

INDEX

اشٹاریک

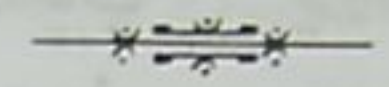
(انڈیکس: "ناریخ دعوت و عزیمت" حصہ اول)

محمد غیاث الدین ندوی

مترجم

فرماتے ہیں:-

پیر رومی را رفیقِ راه ساز
زانکہ رومی مغز را داند ز پوست
تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
پائے او محکم فتد در کوی دوست



APPROVED
By WWW.ATTABLIG.COM at 8:59 am, Oct 26, 2010

شخصیات

۹۹	ابراہیم بن مصعب	۳۰، ۲۰، ۱۸	سیدنا و نبینا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
۹۵	ابراہیم بن ہدی	۹۷، ۷۵، ۷۴، ۶۵، ۵۴، ۴۵، ۳۲، ۲۰، ۱۳، ۹، ۳، ۲، ۱	
۹۲	ابراہیم الحربی	۱۸۱، ۱۷۳، ۱۷۲، ۱۳۹، ۱۲۵، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۹۸	
۹۹، ۹۷، ۸۵	ابن ابی داؤد	۲۶۶، ۲۶۱، ۲۳۸، ۲۲۳، ۲۱۹، ۲۱۷، ۲۱۱، ۱۸۵	
۳۱۶-۳۱۳، ۲۵۸، ۲۵۶، ۷۱، ۵۲	ابن اثیر	۳۸۸، ۳۴۳، ۳۲۶، ۳۲۴، ۲۷۶، ۲۶۷	
۷۴	ابن اسحاق		(الف)
۶۳	ابن الاثعث	۲۷، ۲۱۳	سیدنا حضرت آدم علیہ السلام
۳۳۰	ابن بطوطہ	۱۳۶، ۱۲۶	سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام
۲۲۷، ۲۰۱، ۱۸۳، ۱۸۲، ۱۴۵، ۱۱۹، ۱۱۵	(شیخ الاسلام) ابن تیمیہ	۳۳۸، ۱۰۱	(حضرت) ابوبکر صدیقؓ
۷۴	ابن جریر کئی	۵۵	(ام المؤمنین حضرت) ام سلمہؓ
۱۲۸، ۸۸، ۶۰، ۵۲، ۵۱، ۳۳	(عبد الرحمن) ابن ابی حوزی	۳۴	(حضرت) ام عاصمہؓ
۲۴۰، ۲۳۳، ۲۲۵-۲۷، ۱۹۷، ۱۹۶، ۱۹۰، ۱۸۳، ۱۴۷		۹۷	(حضرت) ابن عباسؓ
۲۵۷، ۲۵۰، ۲۴۷		۲۶۱	(حضرت) ابویوب انصاریؓ
۷۵	ابن حیوان	۱۰۵	(حضرت) ابوموسیٰ اشعریؓ
۷۱، ۶۹	ابن خلدون	۲۴۷	ابراہیم بن ادہم
۲۲۴، ۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۱، ۱۰۶، ۷۱، ۶۷، ۳۳	ابن خلکان	۶۸	ابراہیم بن عبداللہ

۲۱۶	ابن المرجم الظالم	۲۸۷	ابن دقیق العید
۸۸	ابن المسیب	۱۱۳	ابن الراوندی
۲۴۹	ابن المقفع	۲۰۱-۳، ۱۹۸	ابن رجب
۲۲۵	ابن ناصر (محدث)	۱۳۵	ابن رشد
۲۲۷، ۲۲۳، ۲۰۰	ابن نجار	۳۰۲، ۲۹۹، ۲۹۷، ۲۹۵، ۲۸۸	ابن السبکی
۱۱۶، ۱۰۸	ابو اسحاق اسفرائینی	۶۳، ۵۲	ابن سعد
۱۹۵، ۱۱۶	ابو اسحاق شیرازی	۲۰۲	ابن السمعانی
۱۸۹	ابوبکر ابن العربی	۲۸۵	ابن سینا
۱۱۲	ابوبکر اسماعیلی	۷۴	ابن شہاب زہری
۱۸۵، ۱۸۴، ۱۱۶، ۱۰۸	ابوبکر باقلانی	۴۵	ابن عبدالحکم
۴۰، ۳۹، ۳۶	ابوبکر بن حزم	۱۸۹، ۱۰۵	ابن عساکر دمشقی
۸۷	ابوبکر بن عیاش	۳۱۸، ۳۰۹، ۳۰۸	ابن العلقمی (مؤید الدین ابوطالب محمد)
۱۱۲	ابوبکر بن صیرفی	۲۲۷	ابن الفارسی
۸۲	ابوبکر خلیل	۱۹۸، ۱۸۲	ابن قدامہ
۳۴۴	ابوبکر سلمہ بات	۲۷۸	ابن قرہ ارسلان
۷۹، ۶۵	ابوبکر فریبانی	۲۸۵	ابن قسیم
۲۸۱	ابوبکر محمد بن الطیب	۳۰۷، ۳۰۵، ۲۱۵، ۲۰۷، ۱۹۷، ۱۸۸	ابن کثیر
۲۷۳	ابو جعفر	۳۳۰، ۳۲۱، ۳۲۰، ۳۱۸، ۳۰۸	
۲۲۸	ابو حازم	۸۰	ابن ماجہ

۲۱	اریسٹ ڈی ہنس (ERUSET DE BUNSEN)	۱۲۱	ابونصر فارابی
۷۶	اسپرنگر	۲۴۷۱۷۲۱۳۰	ابونعمین اصبہانی
۲۱	اشیفن	۱۹۷۱۱۹۵	ابوالوفان بن العقیل
۹۵، ۹۳، ۹۲	اسحاق بن ابراہیم	۲۱۶	ابوالوفان یحییٰ بن سعید
۱۰۵	اسماعیل اشعری	۸۷، ۸۲، ۳۷	(امام) ابویوسف
۴۹	اسماعیل بن عبد اللہ	۳۲۸	اتابک بہار الدین
۸۲	اشہب بن عبدالعزیز	۱۰۱	احمد بن ابراہیم دورق
۲۳	ایشوراٹوپا	۷۹	احمد بن جعفر
۱۳۲	افلاطون	۸۶-۹۳، ۸۴، ۸۲، ۸۱، ۶۲	(امام) احمد بن حنبل
۳۵۵، ۳۳۵	افلاکی	۲۳۷، ۲۳۳، ۲۰۲، ۱۹۸، ۱۵۴، ۱۱۰، ۱۰۳، ۹۵-۱۰۱	
۳۹۸، ۳۶۹، ۳۶۱	(علامہ) اقبال	۱۱۳	احمد بن علی فقیہ
۲۸	اکبر	۱۸۸، ۱۸۷	احمد بن نظام الملک
۱۱۶	اپ ارسلان — سلجوق	۱۳۰	احمد الراذکانی
۳۰۶	امیر الشراہ	۱۹۰	احمد الغزالی
۳۱۹	امین	۳۲	اخطل
۳۱۳	انیل جن	۱۲۵	(سیدنا) ادیس (باطنی امام)
۳۳۲	اوصد الدین کرمانی	۱۳۵، ۱۳۲، ۱۲۱، ۱۲۰	ارسطو
۳۳۳	اوگتائی خان	۳۲۹، ۳۲۴	ارغوزاں
۳۲۳	ایل خان	۳۳۳، ۳۳۲، ۳۳۱، ۳۲۶، ۳۲۵، ۳۲۳	آرنلڈ

۱۰۰	ابوالعباس رقی	۷۵	ابوالحاکم رازی
۹۷	ابوعبدالرحمن شافعی	۱۳۱، ۱۱۹، ۱۱۱-۱۶، ۱۰۳-۹	(امام) ابوالحسن اشعری
۱۰۷	ابوعبدالشہر بن خنیف	۳۳۶، ۱۸۵، ۱۸۳	
۱۹۹	ابوعبدالشہر محمد بن یوسف البرزالی	۱۰۸	ابوالحسن باہلی
۲۸، ۲۷، ۲۵	ابوالعرفان ندوی	۱۸۹	ابوالحسن بصری
۲۰۱، ۱۰۵	ابوعلی جبائی	۱۰۵	ابوالحسن اجمائی
۱۹۱	ابوعلی فارمدی	۳۱۰	ابوالحسن خزرہی
۵۶	ابوعمر بن اعلیٰ	۲۹۹	ابوالحسن شاذلی
۳۱	ابوالفرج اصبہانی	۱۶، ۱۰	ابوالحسن علی ندوی
۱۹۵	ابوالقاسم ہروی	۱۱۳	ابوالحسن ہروی
۲۸۷	ابومحمد القاسم ابن عساکر	۱۵۵، ۱۵۴، ۸۲، ۸۱، ۶۸	(امام) ابوحنیفہ
۲۳۰، ۷۹	ابومسلم خراسانی	۵۷	ابویحییٰ التوحیدی
۲۲۷	ابوالمنظف	۱۹۸	ابوالخیر حماد
۱۳۰، ۱۱۷، ۱۱۶	(امام اکبرین) ابوالعالی عبدالملک جوینی	۸۰	(امام) ابوداؤد سجستانی
۲۲۳، ۱۸۹، ۱۳۷		۱۹۷، ۱۹۵	ابودکر یا تبریزی
۱۱۵، ۱۱۳	ابومنصور ماتریدی	۲۳۹	ابوسید جبائی
۲۲۳	ابوالنجیب ہروردی	۱۹۸	ابوسید مخزومی (مبارک بن علی)
۱۳۰	ابونصر اسماعیلی	۲۰۳	ابوسلیمان خطابی
۱۶۳	ابونصرتار	۱۳۴	ابوطالب مکی

۳۳۱-۳۳	جمال الدین	۸۰	(امام) ترمذی
۲۸۸	جمال الدین حاجب	۱۳۱	ترکان خاتون
۱۷	جنید بغدادی	۳۳۱-۳۳	تغلق تیمور خاں
۱۳۳	جنید شبلی	۲۷۷	تقی الدین
۲۳	جو اہر لال نہرو	۳۲۹، ۳۲۶	تگودار خاں
۳۲۵	جو جی خاں	۳۳۷	تلمذ حسین گورکھ پوری
۲۲	جے، بسمولنگر (J. BASSMULLINGER)	۲۶۸	تکلیف
	(ج)	۲۹۸	(الملك المعظم) توران شاہ
۲۶۵	چائیلون	۳۳۰	(امیر) توزون (نوروز بیگ)
۳۳۰-۳۲	چغتائی خاں	۳۳۷	توکل حسین
۳۱۱، ۳۵۹، ۳۵۶، ۳۵۴، ۳۵۳، ۳۱۹	چلی حسام الدین	۵۷	ثابت بن قرہ
۳۳۸	چلی علاء الدین		(ج)
۳۳۳، ۳۳۲، ۳۳۱-۲۶۱، ۳۱۷، ۳۱۶، ۳۱۳، ۳۱۲	چنگیز خاں	۷۰	جاخا
	(ح)	۱۲۶	جبرئیل
۱۹۷	(حضرت) حسن	۸۸	جریر بن عبد الحمید (محدث)
۶۸، ۳۳	(حضرت) حسین	۹۵	جسر بن ولید
۲۱۳	(حضرت) حوا	۳۳۳	جلال الدین حسن
۱۳۳	حارث محاسبی	۳۳۸، ۳۳۶، ۳۳۵، ۱۷۷	(مولانا) جلال الدین رومی
۲۸۵	حاکم باشر	۳۹۹، ۳۵۷، ۳۳۲، ۳۳۹	

۲۹	بلاذری	۲۶۱	الویب نجم الدین
۱۱۳	بندار بن حسین		(ب)
۲۳-۲۵	بودھ	۱۲۷	باب (بانی مذہب بانی)
۱۲۱	بو علی ابن سینا	۳۲۶	باقا خاں
۸۲	بویطی (شافعی)	۲۳۱، ۱۳۴	بازید بسطامی
۲۶۷، ۲۶۶، ۲۶۲-۶۳	(قاضی) بہار الدین ابن شداد	۲۹۸	(قاضی القضاة) بن جامع
۳۳۲، ۲۷۷-۸۱، ۲۷۴، ۲۷۳		۱۰۱، ۹۳، ۷۹، ۷۸، ۷۵	(امام) بخاری
۳۵۵	(سید) بہار الدین ترمذی	۳۳۱	بدر الدین گوہر تاش
۲۲۳	(شیخ) بہار الدین ذکریا المتانی	۳۳۵، ۳۳۴، ۳۳۳، ۳۳۹	بدیع الزماں فروزانفر
۳۳۹	(سید) بہار الدین رازی	۳۵۲-۵۳، ۳۳۹، ۳۳۱	براق خاں
۳۲۹، ۳۲۵، ۳۲۱، ۳۳۹	(سلطان) بہار الدین ولد	۳۲۶، ۳۳۵	برک خاں
۳۵۹، ۳۵۵، ۳۵۴، ۳۵۰		۳۵۲	(سید) برہان الدین
	(پ)	۳۳۱، ۳۳۸	برہان الدین محقق ترمذی
۳۱۱، ۲۷۰	پاپائے روم	۶۸	بزار
۲۵۲	پطرس (راہب)	۳۱۴، ۵۷، ۵۶	بتانی
	(ت) (ث)	۱۶۵، ۱۶۴	بشر بن حارث
۳۲۵	تاتاری خاں	۲۳۷، ۲۳۱، ۲۳۱، ۱۷۲	بشر خانی
۳۱۸	تاج الدین بکی	۱۴۲	بقراط
۲۹۸	(قاضی القضاة) تاج الدین	۱۱۳	بلال بن ابی بردہ

۳۸۷	سیف الدین آدمی	۳۲۴	زین الدین سنجاسی	۷۶	حبیب الرحمن خاں شروانی
۲۱۲۲	سینٹ پال	۱۸۸۱/۱۸۳۰/۱۳۷	زین الدین عراقی	۶۳۱۵۶	سجاد بن یوسف
۲۹۹۲۲۸۸	سیوطی	(س)	(س)	۱۹۹	ترادہ
	(ش)	۳۳	سالم بن عبداللہ	۲۲۷۱۶۵-۶۷۱۶۳۱۵۵-۵۷۱۵۳۱۵۱	حسن اصریٰ
۱۵۵/۱۵۴/۱۹۷۱۸۸۱۸۷۱۸۲۱۸۱	(امام) شافعی	۳۰۵	سالم حسین	۷۰	حسن بن سہل
۳۵۷/۱۹۱/۱۶۷/۱۳۷/۱۸۲/۱۷۱	شبلی نعمانی	۳۵۸/۳۵۷/۳۵۵/۳۳۷/۳۳۵/۳۳۲	سپہ سالار	۳۳۳	حسن بن صباح اسماعیلی
۲۲۸	(شیخ) شبلی	۹۵	سجادہ	۶۸	حسن بن قحطیبہ
۲۹۴	شرف الدین عبداللطیف	۳۳۲	سعد الدین جموی	۳۳	حسن المثنیٰ
۲۲۲	شرف الدین عیسیٰ	۳۱۹	(شیخ) سعدی	۲۴۹	حلاج
۲۳۵	(قاضی) شریح	۷۴	سعید بن ابی عوف مدنی	۲۳۲/۳۲۹	رشید الدین
۲۳۸	(قاضی) شریح	۵۵	سعید بن جبیر	۳۲۶/۳۲۵	رکن الدین بیرس
۵۵	(امام) شعبی	۳۳	سعید بن المسیب	۳۲۴	رکن الدین سنجاسی
۱۹۸	(امام) شحرانی	۲۳۷/۱۵۴/۱۷۱	سفیان ثوری	(مولانا) روم دیکھیے جلال الدین	۳۱
۳۶۱/۳۵۵/۳۵۴/۳۳۳-۵۲	شمس الدین تبریزی	۱۳۲	سقراط	(مسنز) ریس ڈائس (RHYS DAYIS)	۲۴
۳۶۱/۲۶۱/۲۵	شکر آچاریہ	۳۷۴	سکندر	۲۶۶/۲۶۵/۲۵۷	ریجنالڈ وائی گرک
۳۰۵/۲۸۸	شہاب الدین البوشامہ	۲۲۸/۱۵۳/۵۰-۳۳-۳۶	سلیمان بن عبدالملک	(س)	(حضرت) زید بن ثابت
۲۹۹/۲۲۴	شہاب الدین بہروردی	۷۶	(سید) سلیمان ندوی	۵۵	(امام) زفر
۲۶۹	شیردل	۲۰۷/۱۸۸/۱۸۷/۱۶۱/۱۶۰	(سلطان) سنجر	۸۲	(امام) زہری
۲۶۱	شیرکوہ اسد الدین	۳۲۵	سیرادادرا	۸۸	زید بن علی

۳۸۷	سیف الدین آدمی	۳۲۴	زین الدین سنجاسی	۷۶	حبیب الرحمن خاں شروانی
۲۱۲۲	سینٹ پال	۱۸۸۱/۱۸۳۰/۱۳۷	زین الدین عراقی	۶۳۱۵۶	سجاد بن یوسف
۲۹۹۲۲۸۸	سیوطی	(س)	(س)	۱۹۹	ترادہ
	(ش)	۳۳	سالم بن عبداللہ	۲۲۷۱۶۵-۶۷۱۶۳۱۵۵-۵۷۱۵۳۱۵۱	حسن اصریٰ
۱۵۵/۱۵۴/۱۹۷۱۸۸۱۸۷۱۸۲۱۸۱	(امام) شافعی	۳۰۵	سالم حسین	۷۰	حسن بن سہل
۳۵۷/۱۹۱/۱۶۷/۱۳۷/۱۸۲/۱۷۱	شبلی نعمانی	۳۵۸/۳۵۷/۳۵۵/۳۳۷/۳۳۵/۳۳۲	سپہ سالار	۳۳۳	حسن بن صباح اسماعیلی
۲۲۸	(شیخ) شبلی	۹۵	سجادہ	۶۸	حسن بن قحطیبہ
۲۹۴	شرف الدین عبداللطیف	۳۳۲	سعد الدین جموی	۳۳	حسن المثنیٰ
۲۲۲	شرف الدین عیسیٰ	۳۱۹	(شیخ) سعدی	۲۴۹	حلاج
۲۳۵	(قاضی) شریح	۷۴	سعید بن ابی عوف مدنی	۲۳۲/۳۲۹	رشید الدین
۲۳۸	(قاضی) شریح	۵۵	سعید بن جبیر	۳۲۶/۳۲۵	رکن الدین بیرس
۵۵	(امام) شعبی	۳۳	سعید بن المسیب	۳۲۴	رکن الدین سنجاسی
۱۹۸	(امام) شحرانی	۲۳۷/۱۵۴/۱۷۱	سفیان ثوری	(مولانا) روم دیکھیے جلال الدین	۳۱
۳۶۱/۳۵۵/۳۵۴/۳۳۳-۵۲	شمس الدین تبریزی	۱۳۲	سقراط	(مسنز) ریس ڈائس (RHYS DAYIS)	۲۴
۳۶۱/۲۶۱/۲۵	شکر آچاریہ	۳۷۴	سکندر	۲۶۶/۲۶۵/۲۵۷	ریجنالڈ وائی گرک
۳۰۵/۲۸۸	شہاب الدین البوشامہ	۲۲۸/۱۵۳/۵۰-۳۳-۳۶	سلیمان بن عبدالملک	(س)	(حضرت) زید بن ثابت
۲۹۹/۲۲۴	شہاب الدین بہروردی	۷۶	(سید) سلیمان ندوی	۵۵	(امام) زفر
۲۶۹	شیردل	۲۰۷/۱۸۸/۱۸۷/۱۶۱/۱۶۰	(سلطان) سنجر	۸۲	(امام) زہری
۲۶۱	شیرکوہ اسد الدین	۳۲۵	سیرادادرا	۸۸	زید بن علی

شیطان

۳۷۰۱۲۵۱۲۳۸۱۲۳۷۱۱۳۸

ص ص

سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام

۱۲۷۲۱

صالح اسماعیل

۲۹۲۱۲۹۱

(حضرت) عمر

۳۵۱۳۴

صالح بن امام احمد

۹۳

(حضرت) علی

۳۳۸۱۲۳۸۱۲۶۱۸۵

صدرالدین

۱۸۸

(ام المؤمنین حضرت) عائشہ

۲۱۲

صدرالدین قنوی

۳۶۱۳۵۶۱۳۴۲

(حضرت) عبدالشکر بن مسعود

۱۶۴

صدیق حسن خان

۲۲۴۱۸۳

عازم ابولیمان

۹۱۹۰

صلاح الدین الیوبی

۲۲۵۷۲۲۶۱-۶۲۱۲۵۶۱۲۵۲

عاصم بن علی

۷۹

۳۴۲۱۳۰۷۰۳۰۴۲۹۸۱۲۸۵-۸۷۱۲۸۳۱۲۸۲

عاصم بن عمر

۳۴

صلاح الدین زرکوب

۳۶۱۳۵۹۱۳۵۱-۵۴۱۳۴۵

عاصد لدین الشکر

۲۸۳

صنحاک بن عبدالرحمن

۴۱

عالمگیر اعظم

۳۰۴

ط

(شیخ) عبدالجبار

۲۲۳

طاہر

۳۱۹

(قاضی) عبدالجبار

۲۸۱

(امام) طحاوی

۱۱۵

عبدالرحمن بن اسحاق

۹۷

ط مشرف خان

۳۳۱

عبدالرحمن بن قاسم

۸۲

طیفور

۹۵

عبدالرحمن بن ہدی

۸۷

ظ

(شیخ) عبدالرزاق

۲۲۲

(الملك) الظاہر بیریس

۳۲۲۱۳۰۲۲۹۸

عبدالرزاق بن ہمام

۸۸

(الملك) الظاہر لاعزاز دین الشکر

۳۰۶۱۲۸۲۱۲۷۶

عبدالعزیز

۲۲۳

عبدالعزیز بن سلیمان

۲۴۸

عثمان رومی

۳۴۲

عبدالعظیم المنذری

۲۸۸

عجیبت

۹۹

عبدالغافر فارسی

۱۳۷۱۳۱

عروہ بن زبیر

۳۳

عبدالغنی بن فخر فراش

۳۰۶

(شیخ الاسلام) عزالدین بن عبدالسلام

۲۸۷۱۲۰۱

(شیخ) عبدالقادر جیلانی

۲۰۳۱۲۰۱۱۹۹۱۱۹۷۱۱۹۶

۲۰۳۱۲۰۲۱۲۹۷-۹۹۱۲۹۲-۹۴۱۲۸۸

عبدالقادر حسنی

۲۲۰۱۲۰۷۱۲۰۶

عکرمہ

۳۲۱۳۱

عبدالقادر جرجانی

۱۳۷

علاء الدین البطرسی الظاہری

۳۰۶

عبدالشکر بن امام احمد

۹۳

علاء الدین کتیباد

۳۴۱۳۴۰

عبدالشکر بن زبیر

۲۴

علاء الدین محمد خوارزم شاہ

۳۳۹۱۳۱۰-۱۳۱۳۰۳

عبدالشکر بن سلام

۲۸۷

علی بن حسین (زین العابدین)

۳۳۱۳۲

عبدالشکر بن عبدالحکم

۸۲

علی بن مدینی

۱۰۱

عبدالشکر بن مبارک

۱۵۶۱۷۱

علی بن یوسف تاشقین

۱۹۱-۹۳

عبدالشکر بن وہب

۸۲

عماد الدین زنگی

۲۶۱۱۲۵۴

عبدالشکر المحض

۳۳

عماد الدین اکاتب

۲۷۸

عبدالشکر بن مروان

۳۲

عمر بن ابی الحسن رواسی

۱۸۹

(شیخ) عبدالوہاب

۲۲۲

(حضرت) عمر بن عبدالعزیز

۳۹۱۳۴-۳۶۱۳۱

عبد المؤمن

۱۹۳

۲۵۸۱۲۳۸۱۲۳۷۱۱۹۷۱۱۹۸-۵۳۱۳۱۰۴

عمر کیسانی

۲۰۱

عبد العزیز

۲۸۱

عمرہ بنت عبدالرحمن

۴۰

۲۲۳، ۲۳۱، ۲۳۱۰	عنایت اللہ	فریابی	دیکھیے	البکر
۶۶	عوام بن حوشب	فریبیری		۷۹
(ع)		فرید البوجدید		۲۶۲
۳۳۰	غازان	فرید الزماں		۱۸۸
۱۳۷، ۱۲۹-۳۲، ۱۵۷	(امام ابو حامد محمد) الغزالی	فریدرک		۲۶۹-۷۱
۱۵۵-۵۸، ۱۵۳، ۱۵۱، ۱۴۵-۴۹، ۱۴۰-۴۲		فضل بن عیاض		۷۱
(ق)				
۱۸۴، ۱۸۳، ۱۷۷، ۱۶۸، ۱۶۷، ۱۶۱، ۱۶۰		قآن		۳۲۶
۲۴۸، ۱۹۷، ۱۹۵، ۱۹۴، ۱۹۲، ۱۸۶-۹۰		قاسم بن محمد		۴۰، ۳۳
۳۳۶، ۳۰۲، ۲۸۸		قنادہ حسینی		۳۰۵
۳۳۱	(سلطان) غیاث الدین	قنقبہ		۱۰۰
(ف)		قرمطی		۲۴۹
۲۸۲، ۲۴۸	(حضرت) فاطمہ	قطب الدین شیرازی		۳۲۸
۲۷۵	(قاضی) فاضل	قواری		۹۵
۲۸۳	الفارزدین اللہ	قوام الدین		۱۸۸
۲۹۴، ۲۹۳	فخر الدین عثمان	قوبلانی خاں		۳۳۳، ۳۱۷
۱۸۷، ۱۶۱، ۱۲۸	فخر الملک طوسی	قیصر		۲۶۹-۷۱، ۳۵
۳۳	فرزدق	(ک)		
۱۷۴	فرعون	کاشلین		۲۷۲
بدیع الزماں	فرزاد نفر	دیکھیے		

۱۹۸، ۱۹۵، ۱۹۴، ۱۹۲، ۱۸۵، ۱۷۷، ۱۶۹	امون	۸۲	(شمس الامم) کردی
۳۱۹			
۲۳۱	متنبی	۳۳۳	گرگز
۱۱۹، ۱۰۳، ۹۳، ۹۲	متوکل باللہ	۳۵	کسری
۲۶۱	مجاہد الدین ہرروز	۳۴۲	کمال الدین ابن العظیم
۳۰۶	مجاہد الدین ایبک الدویدار	(گ)	
۱۶۲	مجاہد الدین	۲۶	گاندھی جی
۸۲	(امام) محمد	۲۶۶، ۲۶۵	گانی
۳۲۶	(سلطان) محمد (احمد)	۳۱۷	گبن
۱۱۵، ۸۹	محمد البوزہرا	۲۶۸	گودہرے
۱۲۵، ۹۹	محمد بن اسماعیل	۳۲۴	گیوگ خاقان
۱۹۷	محمد بن حسن باقلانی	۲۸۱، ۲۶۲-۶۴، ۲۵۲-۵۵	(اسٹینلے) لین پول
۱۲۶	محمد بن حسن دہلی یانی	(م)	
۵۵	محمد بن سیرین	۲۳۶، ۱۲۶	سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام
۳۶	محمد بن عبدالحکم	۸۶	(حضرت) ثمنی بن عارثہ
۱۹۱-۹۳	محمد بن عبد اللہ تومرت	۲۸۲	(حضرت) معاویہ
۱۸۷، ۱۶۱	محمد بن ملک شاہ	۳۱۵	ماہوج
۹۴، ۹۱، ۶۲	محمد بن نصر مروزی	۲۱	مارٹن لوتھر (M. LUTHER)
۹۵	محمد بن نوح	۲۸۲، ۱۵۴، ۱۸۰-۸۲، ۶۸	(امام) مالک
۳۳۸	محمد بہاء الدین	۲۳۷	مالک بن دینار

۲۶۱۲۰۴۱۲۰۶	(سلطان) سعود	۳۳۰	محمد خدا بنده (نکوس)
۴۴	سعودی	۶۸	محمد ذوالنفس الزکیه
۸۰	(امام) مسلم	۲۰۶۱۲۰۵	محمد عالم کاکوروی
۴۴	(امام) معاذ بن معاذ	۱۱۵	محمد عبده
۳۱۹۱۱-۳۱۹۵-۹۹۱۹۲۱۴۹	معتصم باشتر	۱۲۴	محمد علی
۳۱۹	معتضد	۱۳۴	محمد گازرونی
۲۴۴۱۲۳۱۴۴۲	معروف کرخی	۱۳۵۱۱۲۲	محمد لطفی جمعه
۱۲۵	میرالدین الشرفاظمی	۲۵۰	محمد یوسف لونی
۴۴	معمربینی	۱۶۸	محمد یوسف موسی
۳۵۴	معین الدین پروانه	۲۵۵	(سلطان) محمود سلجوقی
۱۳۱۱۱۱۵	مقتدی باشتر	۳۳۲	محمی الدین ابن العربی
۲۰۶	المقتضی لامر الشتر	۲۰۰	محمی الدین ابو عبد الشتر بندادی
۲۸۴۱۲۸۳۱۲۸۱	مقدسی	۱۲۴	مرزا (غلام احمد)
۲۸۳۱۲۸۲	مقریزی	۸۲	مرزنی (شافعی)
۲۹۹۱۲۹۱۱۲۸۹	الملك الاشراف	۲۰۶	مستر شند
۳۰۵	الملك الافضل	۲۴۸۱۲۰۶۱۱۳۱	مستظهر باشتر
۲۵۳۱۸۴۱۶۱۱۶۰۱۳۱۱۱۴۱۱۵	ملك شاه سلجوقی	۳۱۹۱۳۱۸۱۳۰۹۱۳۰۸۱۲۹۸	مستعصم باشتر
۲۹۴۱۲۹۳۱۲۹۱	الملك الصالح نجم الدین الیوب	۳۰۸۱۲۹۸۱۲۸۳	مستنصر باشتر
۲۹۸			المستغنی باشتر
۲۹۰۱۲۸۸	الملك الكافل	۲۰۶	

۳۱۹۱۳۱۸	نصیر الدین طوسی	۳۳۱	الملك المنظر سیف الدین قطر
۱۸۴۱۱۳۱۱۱۳۰۱۱۲۸۱۱۱۴۱۱۶ ۱۸۸	نظام الملك طوسی	۲۹۲	الملك المنصور
۱۲۶	نمرد	۳۳۸	ملکه جهان
۲۸۶۱۲۸۵۱۲۶۴۱۲۵۵-۶۱۰۲۵۲	نورالدین زنگی	۶۸	مناظر احسن گیلانی
۲۸۸	(امام) نودی	۳۱۹	مختصر باشتر
۵		۴۸۱۴۶۱۴۵	منصور بن غالب
۱۰۳۰۹۲	والثقی	۳۱۹۱۳۱۸	منکوقاآن
۲۲۹۱۲۲۶	وصاف	۲۳۳	منکوخاں
۴۴	(امام) وکیح	۲۲۳۱۲۲۲	(شیخ) موسی
۵۰۱۳۳	ولید	۳۰۵۱۲۸۹	موسی بن الملك العادل
۳۰۲۱۸۰۱۶۵	(شاه) ولی الشتر	۱۱۳	مهبتر
۱۱۴	ویننگ (WENSINCK)	۲۲۹	موفق عبد اللطیف
۴			(ن)
۱۲۶	سیدنا حضرت نوح علیه السلام	۱۲۶	سیدنا حضرت نوح علیه السلام
۳۹۱	سیدنا حضرت یحیی علیه السلام	۳۱۰۱۳۰۴	ناجی معروف
۹۸۱۸۴۱۸۵۱۸۲۱۷۱۱۶۹	بارون رشید	۳۱۰۱۳۰۸۱۳۰۴	الناصر لدین الشتر
۶۸۱۳۳	پشام بن عبد الملك	۳۲۵	نجم الدین مختار ظاهری
۳۲۶۱۳۲۵۱۳۱۹۱۳۱۸۱۳۱۳	بلکوخاں	۸۰	(امام) نسائی
۲۶۵	بمفری	۲۶۱	نصرة الدین امیر ایران

۱۵۹، ۱۵۸، ۱-۹، ۸، ۵۵	تا بعین	۲۹	اہل مغرب
۱۱۷، ۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۱۲، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۹، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳، ۱۰۲، ۱۰۱، ۱۰۰، ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	تاریخ تازی ۹۹، ۹۸، ۹۷، ۹۶، ۹۵، ۹۴، ۹۳، ۹۲، ۹۱، ۹۰، ۸۹، ۸۸، ۸۷، ۸۶، ۸۵، ۸۴، ۸۳، ۸۲، ۸۱، ۸۰، ۷۹، ۷۸، ۷۷، ۷۶، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	۵۷	اہل مکہ
۳۵، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	۲۲	۱۳۳	اہل منطق
۳۵، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱	ترک	۷۳	ایرانی
۲۷۱	ترکمان	۳۳، ۳۲، ۲۹	ایلیخانیہ
۲۹۱	ثقیف	۱۳۸، ۱۳۳، ۱۳۱، ۱۲۸، ۱۲۷	باطنی
۲۹۲	جبرہ	۳۲۹، ۲۱، ۲۰	پورہ
۲۸۹، ۱۸۵، ۱۱۱، ۱۱۰، ۱۰۸، ۱۰۷، ۱۰۶، ۱۰۵، ۱۰۴، ۱۰۳	خالبہ	۴۹	بربر
۲۸۴	خاندان اتابک	۳۰۳	بنی اسرائیل
۲۵۳	خاندان انخی	۶۸، ۵۱، ۴۱، ۳۶، ۳۴، ۳۲، ۳۱	بنی امیہ - اموی
۲۴	خاندان مروان	۱۵۳، ۱۸۶	
۲۷۳، ۲۵۸، ۱۸۵	خلفاء راشدین	۳-۷، ۲۶۱	بنی ایوب - ایوبی
۲۳۸، ۳۱۰	خوارزم	۶۸	بنی حسن
۲۷-۲۶۹	داوید (عیسائی فرقہ)	۳۱۹، ۲۵۴، ۱۵۴، ۱۵۳، ۱۸۶، ۶۸	بنی عباس - عباسی
۱۱۳	دہریہ	۲۸۶، ۲۸۵، ۲۸۳، ۲۸۲	بنی عبید - عبیدی (فاطمی)
۲۸۵	ذی	۴۹	بنی مخزوم
۳۵۷، ۲۱	راہب - قیس	۸۶، ۷۰	بنی ہاشم - خاندان ہاشم
۱۱۵	روافض	۱۲۷	بہائی
۳۵، ۷۳	روی	۲۷-۲۶۹	البیطار (عیسائی فرقہ)

۹۰، ۱۸۸	یحییٰ بن یعین	۱۲۷	(موسیو) ہوارث
۸۲	یحییٰ بن یحییٰ لیشی	۸۷	ہیشم بن بشر
۵۱	یزید بن عوشب	۸۷	ہیشم بن حبیل
۶۳	یزید بن عبد الملک	۳۱۰-۱۳	ہیر لولیمب
۶۳	یزید بن المہلب		(۷)
۷۹	یزید بن ہارون	۲۳۴	سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام
۵۵	یسار	۳۱۵	یا جوج
۱۲۱	یعقوب کنڈی	۸۵	یحییٰ بن اکثم
		۵۰	یحییٰ بن سعید

اقوام و قبائل - طبقات و ملتیں

۸۶، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲	اہل بیت کرام خاندان نبوت	۸۶	ارباب کلیسا
۱۱۶، ۱۱۵، ۱۱۲، ۱۱۰، ۱۰۶، ۱۰۵، ۸۱	اہل سنت - سنی	۳۱	آرتھوڈوکس سنی
۳-۸، ۲۸۴، ۲۷۷، ۲۰۲، ۱۳۶، ۱۱۹		۳۵۳	ارموی
۱۲۶	اہل ظاہر	۲۸۹، ۱۸۳-۸۶، ۱۱۹، ۱۱۵-۱۷	اشعری اشاعہ
۳۱۰، ۱۳۶	اہل عراق	۲۹۶، ۲۹۴، ۲۸۳، ۲۶۲، ۲۳۵	
۶۸	اہل مدینہ	۲۸۵، ۲۶۷، ۲۵۱، ۲۰۸، ۱۷۷، ۱۲۸، ۲۹۱، ۲۹۰	انبیاء
۲۸۲، ۲۷۱	اہل مصر - مصری	۳۹۸، ۳۹۶، ۳۹۵، ۳۸۶، ۳۶۷، ۳۶۴	
۲۴، ۳۱	اہل مصر - مصر	۱۳۳	اہل استدلال
		۳-۷، ۲۶۹، ۲۳۹، ۸۷	اہل بغداد

۲۵	بجگوت گیتا	اسلام آرٹو کرسچیانٹی (ISLAM OR TRUE -
	(ت)	CARISTIANITY)
۱۸۳	التاج المکمل	اشارات (ابن سینا) ۲۸۵
۲۷۸۱۰۲۷۹۷۴۲۳۳	تاریخ ابن خلکان	الاشعری البواکسن ۱۱۳، ۱۱۳
۳۲۲، ۳۲۱	تاریخ الخلفاء للسيوطی	الاصابه فی احوال الصحابه ۷۶
۱۶۸	تاریخ الاخلاق	الأغانی ۷۰، ۳۲، ۳۰
۱۰۲، ۹۸-۱۰۰، ۹۳، ۹۱، ۸۷	تاریخ الاسلام للذہبی	(رساله) الأتلام ۳۱-۱۳۰۷
۴۰	تاریخ اصبهان	اجام العوام عن علم الکلام ۱۸۷، ۱۸۶
۳۱۷	تاریخ انخراط وسقوط روما	الفیه ۱۸۳، ۱۳۷
۱۰۱، ۹۵، ۷۲	تاریخ بغداد	امام ابو حنیفہ کی سیاسی زندگی ۶۸
۹	تاریخ دعوت و عزیمت	انجیل ۳۵۷، ۲۱
۹۴	تاریخ صغیر	انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ۲۵۳، ۲۵۲، ۲۴۸، ۲۲۲
۹۵، ۷۰	تاریخ طبری	انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا اینڈ اٹھلس ۲۵
۳۱۷	تاریخ عہد وسطی	ایضاح البرہان ۱۱۳
۱۳۵، ۱۲۲	تاریخ فلاسفۃ الاسلام	(ب)
۳۱۶، ۳۱۴، ۳۱۳، ۳۰۸، ۲۵۶-۶۱، ۶۸	تاریخ الکامل	بال جبریل ۳۹۹، ۳۶۹
۹۴	تاریخ کبیر	البدایہ والنہایہ ۳۰۶، ۳۰۵، ۲۰۶، ۱۹۷
۱۱۵	تاویلات القرآن	۳۳۰، ۳۲۱، ۳۱۸، ۳۱۳
۱۱۳	التبیین عن اصول الدین	ابرهان ۱۸۹

۱۳۶	جواہر القرآن	تبیین کذب المفتری ۱۸۹، ۱۱۴، ۱۱۳، ۱۰۵-۸
۳۱۷، ۳۱۵، ۳۱۰-۱۲	چنگیز خاں (کتاب)	تثبت النبوة ۲۸۱
	(ح)	تذکرۃ الحفاظ ۷۹، ۳۳
۱۲۷	حاضر العالم الاسلامی	تذکرہ دولت شاہ ۳۴۵
۱۳۶	حجۃ الحق	الترغیب والترہیب ۲۸۸
۳۰، ۲، ۱۸۰	حجۃ اللہ البالغہ	تعریف الأعیان بفضائل الأعیان ۱۳۷
۳۵۴	جدیقہ انسانی	تفسیر مولوی محمد علی ۱۲۷
۶۰	احسن البصری	تقصار جود الاحرار ۲۲۴
۲۹۹، ۲۹۸، ۲۸۸	حسن المحاضرہ	التکلمہ رموز الغیب ۲۲۳
۲۴۷، ۱۹۰-۱۸۹، ۷۲	حلیۃ الاولیاء	تلاش ہند (DISCOVERY OF INDIA) ۲۵۱، ۲۴
۲۸۱	حمار	تبلیس الملبس ۲۳۶، ۲۳۹، ۲۳۸، ۲۳۴-۴۶
۳۷، ۳۰۶	احوادث الجامعہ	تلقیح فہوم اہل الأثر فی عیون التاریخ والسیر ۲۵۰
	(خ)	توریت ۳۵۷
۱۱۳	خبر الواحد	تہافت الفلاسفہ ۱۴۲-۴۵
۷۷، ۷۶	خطبات مدراس	(ج) (ج)
	(ی)	جامع ترمذی ۸۰
۳۱۴، ۱۹۷، ۱۶۶، ۱۵۷، ۱۵۶	دائرة المعارف للبستانی	الجامع العلوم ۸۲
۳۲۲، ۳۲۰، ۳۱۹، ۳۲۳-۲۵	دعوت اسلام (آرٹیکل)	جاوید نامہ ۴۰۰، ۱۳۹۹
۳۰۲	الدلائل المتعلقہ بالملائکۃ والانس	جلال العینین ۲۰۱

دی گبن	۳۲۴	سیرت عمر بن عبدالعزیز ^{رض} ۳۶-۳۷-۳۸-۳۹-۴۰-۴۱-۴۲-۴۳-۴۴-۴۵-۴۶-۴۷-۴۸-۴۹-۵۰-۵۱
دیوان مولانا روم	۳۴۹/۳۵۵	سیرة النعمان ۸۲
(ذ)	(۵)	(مش)
ذیل طبقات الخنابلہ	۲۰۳/۲۰۲/۱۹۸	اشال ۲۴۸
ذیل المرأة	۳۲۱	شجرة المعارف ۳۰۲
(س)		شذرات الذهب فی اخبار من ذهب ۸۲
الرد علی المنطقیین	۱۱۹	شرح احیاء العلوم وکیفیه - امتحان السادة
رسائل اخوان الصفا	۲۸۵/۱۲۲	الشرح والتفصیل فی الرد علی اهل الافک التخلیل ۱۱۳
رموز الغیب	۲۱۴/۲۱۲/۲۱۰/۲۰۹/۲۰۶/۲۰۵	شفاء (ابن سینا) ۲۸۵
رنات الثالث	۳۲	(ص) (ض)
(ن)		صاحب المتنوی ۳۴۵/۳۳۴
زاویہ غزالیہ	۲۸۸	صحاح ستہ ۷۹
زندگانی مولانا جلال الدین	۳۴۹/۳۴۵/۳۴۳/۳۳۹	صحف مقدسہ ۲۱
(س)		صحیح بخاری ۱۸۹/۱۸۰-۱۷۹/۱۷۰
سلطان صلاح الدین (لین پول) ۵۶-۲۶۲	۲۶۲/۲۵۴-۵۶	صحیح مسلم ۱۸۹/۱۸۰
	۲۸۱/۲۷۳/۲۷۰-۲۶۵/۲۶۳	صحیحین ۸۰
سفن ابی داؤد	۸۰	صفة الصفوة ۲۴۷/۲۵۱/۲۳۳
سوانح مولانا روم	۳۶۰	صفة النفاق و ذم المنافقین ۶۵
		صلاح الدین الیوبی (محمد فرید) ۲۶۱

الصواعق المرسله	۲۸۶/۲۸۵	افتح الربانی ۲۱۰-۲۰۸
صید الخاطر ۲۹	۲۴۱-۲۳۳/۲۳۹/۲۳۳/۲۳۲/۲۳۲/۲۳۲	افتح القسی فی الفتح القدسی ۲۷۸
صحی الاسلام	۲۵۰/۲۴۵-۲۴۸	فتوح البلدان ۴۹
(ط)		فتوح الغیب ۲۰۹/۲۰۸/۲۰۶/۲۰۵
طبقات ابن سعد	۶۵	فجر الاسلام ۸۱
طبقات ابن السبکی	۲۹۵/۹۲	فریح انسانی کلویٹی یا ان اسلام ۱۲۷
طبقات الشافعیۃ الکبریٰ	۲۹۳/۲۸۸/۱۳۱/۱۱۶	فضائح الالباحیۃ ۱۳۶
۳۱۹/۳۰۲/۳۰۰/۲۹۹/۲۹۷/۲۹۵		فلسفۃ الاخلاق و صلواتہا یا فلسفۃ الافرغیۃ ۱۶۸
طبقات الکبریٰ للشعرانی	۲۰۳/۲۰۲/۱۹۹	فوز الکبیر ۶۵
(ع) (غ)		فیصل التفرقة بین الاسلام والزندقة ۱۸۶/۱۸۵
عاصمۃ نفوس المتدین وقاصمۃ ظہور المعتدین ۱۲۵		فیوض یزدانی ۲۱۸/۲۱۷/۲۱۵/۲۱۱/۲۱۰
الحسب المسبوک	۳۰۶	(ق)
عقائد عضدیہ	۱۱۵	قاصم الباطنیۃ ۱۳۶
علماء سلف	۷۹/۷۶	قلائد الجواهر ۲۱۶/۱۹۹-۲۰۲
عوارف المعارف	۲۲۴	قلائد العقود العقیان ۸۲
الغزالی	۱۹۳/۱۸۹/۱۶۷/۱۱۷	قواعد عقائد آل محمد ۱۲۶
(ن)		القواعد الکبریٰ ۳۰۲
فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ	۱۸۳/۱۸۲	قوت القلوب ۱۳۴
		قیام اللیل ۶۲

رقم	عنوان	صفحة	ملاحظات
٤١	المأمون	١١٠، ١٠٩	كتاب الابازة عن اصول الديانة
٣٦٢، ٣٦٠، ٣٥٥، ٣٥٢، ٣٣٤	ثنوى معنوى	١١٣	كتاب الاجتهاد
٣٩٨، ٣٩٤، ٣٨٢-٨٤، ٣٦٣-٤٨		٨٢	كتاب الام
٣٠٢	مجاز القرآن	٤٠	كتاب الحيوان
٢٦٢	المحاسن اليوسفيه	٨٢، ٣٤	كتاب الخراج
٨٢	المدونه	٢٨٣، ٢٨٢	كتاب النخط والآثار
٣١٦	مرصاد العباد	٢٨٦، ٢٨٢، ٢٨٣	كتاب الروضتين في اجار الدولتين
٢٢٢	مرآة الجنان لليافعي	٢٨٨	كتاب العبر
٣٠٥	مرآة الزمان	١١٣	كتاب العمدة
٣٣٤	مرآة المثنوى	١١٣	كتاب الطمع
١٨٩	المستصفي	١١٣	كتاب الفصول
١٥٨، ١٥٦، ١٣٢	مستظهير	١١٣	كتاب القياس
١١٢	مسلم كريد (MUSLIM CREED)	١١٣	كتاب الموجز
١٠١	مسند امام احمد	٢٨١	الكشف عن اسرار الباطنية
١٨٩	المعتمد	٢٨١	كشف ما كان عليه بنو عبید
١٩٨، ١٨٢	المتغنى	٣٢٠	كليات سعدى
١٣٦	مفصل الخلاف		
٣٠٢	مقاصد الصلاة	٢٣٣، ٢٢٦	لغة الكبد في نصيحة الولد

ك

م

ل

رقم	عنوان	صفحة	ملاحظات
٢٨٢، ٢٨٠	موطا	١٣٢، ١٣١	مقاصد الفلاسفة
١٢٨	نظام الملك طوسي	١١٢، ١١٣	مقالات اسلاميين
١٦١	نصيحة الملوك	٦٩	مقدمه ابن خلدون
٣٣٤	نقد المثنوى	٤٩، ٤٨	مقدمه فتح الباري
٢٦٤، ٢٦٢، ٢٦٢	النوادر السلطانية	٣٢٦	مقرئى قوم
٢٤٨-٨١، ٢٤٦		١٦١	مكتوبات امام غزالي
		٩٢، ٨٤	مناقب ابن الجوزي
		٨١، ٦٨	مناقب ابى حنيفة
٢٢٢	وفيات الاعيان	٩٢	مناقب حافظ ذهبي
٣٣٣، ٣٣٠	وهوسن	٣٣٣	مناقب العارفين
		٣٨	مناقب عمر بن عبدالعزيز
٣٢٢، ٣٢٣	هويرته	١٨٢، ١٨٣	المنتظم في تاريخ الملوك والامم
٢٢	هندو ستاني تمدن	٢٥٤، ٢٢٩، ١٩٤	
٣٢٦	هيويم	١٣٦، ١٣١، ١٣١	المتقدم من الضلال
		٣٥٢	منطق الطير
٢٣٦	يوسف زليخا	١٨٢، ١٨٢، ١٣٤	منهاج القاصدين
		١٣٦	مواهب الباطنية

ن

و

ه

ي

۳۲۲، ۳۲۱	عین جالوت	۲۷۲	صور
	(ف)	۲۹۱	صیدا
۲۶۹-۷۱	فرانس		(ط)
۲۷۰	فلاڈرز	۱۸۹، ۱۱۳۰	طابریان
۲۷۰، ۲۶۳-۶۵، ۲۵۶، ۲۵۲-۵۴	فلسطین	۲۵۶، ۲۵۴، ۲۵۳	طرابلس الشرق
	(ق)	۹۵	طرطوس
۲۲۵، ۲۸۵	قاہرہ	۷۶	طنجہ
۲۵۴	قدس	۱۸۸، ۱۸۷، ۱۶۲، ۱۳۰	طوس
۲۱۳	قراقرم	۳۱۸	طہران
۲۱۴	قزوین	(ع)	
۲۷۲	قسنطنیہ	عالم اسلام	۸۸، ۸۷، ۷۷، ۷۵، ۷۴، ۷۳، ۷۲، ۷۱، ۷۰، ۶۹، ۶۸، ۶۷، ۶۶، ۶۵، ۶۴، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۶۰، ۵۹، ۵۸، ۵۷، ۵۶، ۵۵، ۵۴، ۵۳، ۵۲، ۵۱، ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰، ۳۹، ۳۸، ۳۷، ۳۶، ۳۵، ۳۴، ۳۳، ۳۲، ۳۱، ۳۰، ۲۹، ۲۸، ۲۷، ۲۶، ۲۵، ۲۴، ۲۳، ۲۲، ۲۱، ۲۰، ۱۹، ۱۸، ۱۷، ۱۶، ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، ۱۱، ۱۰، ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱
۲۹۰	قصیرہ	۱۲۹، ۱۲۸، ۱۲۳، ۱۲۱، ۱۱۹، ۱۱۸، ۱۱۴-۱۶، ۹۱	
۲۵۷، ۲۵۵، ۲۵۲، ۲۵۱، ۲۴۷-۴۹، ۴۴۰-۴۲	قونیہ	۲۵۲، ۲۲۱، ۲۱۷، ۲۰۱، ۱۹۴-۹۶، ۱۸۸، ۱۳۷	
۲۴۴	قیصریہ	۳۱۲، ۳۱۰، ۲۹۵، ۲۸۷، ۲۸۶، ۲۷۳، ۲۶۲، ۲۵۵	
	(ک) (ل)	۲۶۸، ۲۶۷، ۲۳۵-۳۷، ۳۲۲، ۳۱۹، ۳۱۴-۱۷	
۳۳۳، ۳۳۱	کاشغر	۳۹۸، ۳۹۷	
۳۳۳	کانشوا	۱۹۷، ۱۷۵	عم
۲۷۲	کردستان	۲۷۱، ۳۴	عرب
۲۹۳	کرک	۲۸۱، ۲۷۲، ۲۷۱، ۲۵۳	عک

۳۲۴، ۳۱۳	زنجان		(خ)
	(س)	۳۲۰، ۳۳۸، ۳۲۹، ۱۶۰، ۱۸۶، ۷۶، ۷۱، ۴۹	خراسان
۸۶	سرخس	۳۱۱	خلیج عجم
۲۲۱	ساٹرا	۳۱۴	خوارزم
۳۱۴، ۱۱۵	سمرقند		(د)
۳۴۴	سنجاس	۱۶، ۱۰	دائرہ شاہ علم الشرع
۳۱۷	سویدن	۳۲، ۲۹۱-۹۳، ۲۸۸، ۲۸۷، ۱۳۶، ۶۷	دشق
۷۶	سویز	۲۵۱، ۳۴۷، ۳۴۴، ۳۲۲، ۳۴۰	
۳۲۵	سیرادادرا	۳۰۶، ۲۵۶	دیپا
	(ش)	۲۶۱	دوین
۲۷۱، ۲۶۷، ۲۶۱، ۲۵۸، ۲۵۲-۵۶، ۱۸۷، ۱۸۰	شام		(س) (ش)
۳۲۲، ۳۲۱، ۳۱۸، ۳۱۰، ۳۰۵، ۲۸۹، ۲۸۴-۸۶		۱۶، ۱۰	رائے بریلی
۳۵۱، ۳۴۸، ۳۲۵		۲۵۵، ۲۵۳	الرحا
۱۰۷	شیراز	۷۹	رجب غسان
	(ص)	۱۰۰، ۹۶، ۹۵، ۷۱	لرقہ
۲۷۲	صحراء نوبہ	۲۷۶، ۲۷۰	رملہ
۱۳۶	صخرہ	۳۱۷	روس
۲۷۰، ۲۶۹	صقلیہ	۳۵۴، ۳۵۱، ۳۴۸، ۳۴۴، ۳۲۲، ۳۰۵، ۹۱	روم
۸۸	صغاء	۳۱۶، ۳۱۴، ۱۸۸	رے

۳۲۰	کر معطرہ	۲۴۳	انکلاہ
۲۹۵	ملاطیہ	۷۶	کلکتہ
۲۴۱، ۲۵۸، ۲۵۵	منصورہ	۶۸، ۱۵۷	کوفہ
۲۵۲	موصل	۳۱۷	کیمبرج
۱۹۲	مولد مسیح (بیت اللحم)	۳۳۰	لارنڈا
۳۰۵	مہدیہ	۱۱	کھنؤ
۳۱۳، ۱۸۷، ۱۳۹، ۱۳۰، ۱۱۷، ۱۱۶	(ن)		(م)
۳۳۹	نابلس	۱۹۷	مازندان
۳۱۶، ۳۱۴	نیشاپور	۱۱۴، ۳۹	ماوراء النہر
۲۲۴، ۲۲۱، ۱۲۷، ۱۳۹، ۲۳۰، ۲۶، ۱۵، ۱۹	(۳)	۲۵۴، ۱۱۳، ۶۸، ۶۴، ۳۶، ۳۴، ۳۲	مدینہ منورہ
۳۹۸، ۳۱۰، ۳۰۴، ۲۵۰	ہرات	۳۰۵، ۲۶۶	
۲۲۱، ۱۸۸، ۷۶، ۷۴، ۳۸	ہمدان	۱۹۲	مراکش
۲۶۸-۷۱، ۲۶۶، ۲۶۴، ۲۵۶، ۲۵۳	ہندوستان	۳۱۳، ۱۸۶	مرو
۲۶۹، ۲۵۴، ۲۵۲، ۱۹۳، ۷۶، ۷۳، ۳۸، ۲۲	(۵)	۱۱۴	مشرع الزوایا (بغداد)
۲۶۸-۷۱، ۲۶۶، ۲۶۴، ۲۵۶، ۲۵۳	یانا	۲۶۱، ۲۵۸، ۲۵۶، ۱۹۲، ۱۱۵، ۸۲، ۸۰، ۷۵	مصر
۲۶۸-۷۱، ۲۶۶، ۲۶۴، ۲۵۶، ۲۵۳	یمن	۲۸۸، ۲۸۵، ۲۸۳، ۲۸۲، ۲۷۱، ۲۶۷، ۲۶۲	
۲۶۸-۷۱، ۲۶۶، ۲۶۴، ۲۵۶، ۲۵۳	یروشلم	۳۲۶، ۳۲۵، ۳۲۱، ۳۱۰، ۳۰۶، ۳۰۵، ۲۹۰-۹۹	
۲۶۹، ۲۵۴، ۲۵۲، ۱۹۳، ۷۶، ۷۳، ۳۸، ۲۲	یورپ	۲۸۵، ۱۹۲، ۱۳۵، ۲۹	مغرب
۳۹۸		۱۸۸	مقام خلیل

منتقرات

قلعہ نہرودریا:

۲۵۶، ۲۵۵، ۲۵۳، ۱۳۶	بیت المقدس - مسجد اقصیٰ		
۲۹۲، ۲۸۶، ۲۷۶، ۲۷۵، ۲۷۰، ۲۶۹، ۲۶۷، ۲۶۲		۳۲۱	قلعہ الیسیان
۲۸۸	جامع اموی	۲۶۱، ۲۵۶	قلعہ بانیاں
۱۳۶	جامع مسجد دمشق	۲۶۱	قلعہ بعلبک
۲۵۱	جامع منصور بغداد	۲۶۱، ۲۵۶	قلعہ حارم
۲۵۳	مسجد عمر	۲۵۹	قلعہ حصن الکراد
۱۲۶	باب کعبہ	۷۶	بحر احمر
۲۵۴	روضہ اظہر	۳۱۰	بحر خوارزم (آرال)
۲۰۳	مطاف	۱۹۷	بحر قزوین
۲۲	چرچ	۲۴	بحر الکابل
۲۲	کلیسا	۲۴	بحر ہند
	درس گاہیں، اداکے اور مطابح:	۳۱۰	خلیج عجم
۲۵	الفنن کالج بمبئی	۳۰۶	دجلہ
۱۶۸	جامعہ القاہرہ	۳۰۶، ۲۵۵	فرات
۳۱۸	ظہران یونیورسٹی	۲۳۶	کوہ طور
۳۲۲	مدرسہ حلاویہ - حلب		مساجد و مقدس مقامات و معبد:
۳۲۱	مدرسہ خداوندگار	۳۰۷، ۲۰۳، ۱۱۲۶	بیت اللہ شریف (کعبہ)

۱۲۶/۱۲۴	جنت	۳۲۹	مذہب شانان
۹۱	جہاد	۳۲۳، ۲۰-۲۳، ۱۱۰	مذہب عیسائی-مسیحیت
۱۶۸/۱۳۷، ۱۲۶، ۱۲۴، ۱۸۸، ۳۶	حج و زیارت	۲۶-۲۸	(عقیدہ) وحدۃ الوجود
۸۱، ۸۴، ۷۸-۸۱، ۷۳-۷۵، ۴۰، ۲۹	حدیث	۲۲-۲۵، ۱۰	ہندومت-ہندو مذہب
۱۸۴، ۱۸۳، ۱۷۷، ۱۳۹، ۱۳۳، ۱۲۵، ۱۸۹			مذہبی، اسلامی اور اصطلاحی الفاظ:
۱۵۹، ۱۲۴	حرام	۱۳۳	اجماع
۱۵۷، ۱۲۴، ۱۹۰	حلال	۱۳۸، ۱۳۵، ۱۲۶	آخرت
۱۵۷، ۱۳۷، ۱۳۸	خراج	۴۳	اسلام
۱۲۷	ختم نبوت	۷۳، ۱۵۳	اسلامی معاشرہ
۱۵۳، ۱۳۱، ۶۷، ۵۱، ۴۰، ۳۹، ۳۵، ۲۹، ۱۸۹	خلافت	۱۵۵، ۱۵۴	بحث و مناظرہ
۱۲۷	دجال	۱۹۱، ۱۸۱	بیعت
۱۲۶، ۱۲۴	دوزخ-جہنم	۱۵۵	تذکیر
۱۲۴	رسالت	۱۳۷، ۱۳۶	تزکیہ
۴۱	رسم حلف-محالفت	۲۲۴، ۱۹۱، ۱۶۳، ۱۴۷، ۱۳۶، ۱۳۸	تصوف
۱۵۷	رشوت	۸۵	تقدیر
۱۲۶، ۱۲۴	روزہ-صیام	۱۵۵، ۲۵	توحید
۱۵۱	ری	۴۱، ۳۲، ۳۱	جاہلیت
۸۵	رویت باری	۸۵	جبر و اختیار
۱۲۶، ۱۲۴، ۱۵۰	زکوٰۃ	۲۷، ۱۳۷	جزئیہ
۱۵۱	سبق		

۲۸۶، ۲۸۳	اسماعیلیت	۲۹۳	مدرسہ صالحیہ
۲۸۸، ۱۱۸، ۱۱۷	اشعریت-اشعری عقائد	۳۴۱	مدرسہ قونیہ
۲۸۳	امامیہ	۳۴۲	مدرسہ مقدسیہ-دمشق
۱۲۶، ۱۲۴، ۱۲۳، ۱۱۹، ۱۹	باطنیت-مذہب باطنی	۳۰۶	مدرسہ مستنصریہ
۳۰۷، ۲۸۵، ۲۰۷، ۱۳۶، ۱۳۵، ۱۳۱		۱۸۷، ۱۳۶، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۱۶-۱۸	مدرسہ نظامیہ
۲۵، ۲۴	برہمنیت	۳۱۶	کتب خانہ ندوۃ العلماء
۳۳۳، ۳۲۹، ۲۵، ۲۴	بودھ مت	۳۳۷	دارالمصنفین اعظم گڑھ
۲۷	جہمیت	۲۵۰، ۱۱۰	دائرۃ المعارف حیدرآباد
۱۰۳، ۱۰۱، ۹۶، ۹۵، ۸۶، ۲۷	(عقیدہ) خلق قرآن	۳۲۲	مطبع السعادیہ-مصر
۲۸	دین الہی (اکبر)	۳۰۴	مطبع صدیقی
۲۸۳	شیعیت	۱۴۳	مطبع علامیہ-مصر
۱۲۸، ۱۲۷	قادیانیت	۶۵	مطبع محمدی-دہلی
۲۷	قدریت	۲۲۴	النہضۃ المصریۃ
۲۷	مادیت		مذہب و ادیان، عقائد و فلسفہ:
۱۱۵، ۱۰۹، ۱۰۴، ۱۰۳، ۸۶، ۸۵، ۲۷	مذہب اعتزال	۴۵، ۴۰-۴۳، ۲۷، ۲۶، ۲۰، ۱۱-۱۳، ۹	اسلام
۱۲۳		۱۹۱، ۸۸، ۸۲، ۸۰، ۷۷، ۷۳، ۶۳، ۶۲، ۶۱، ۵۹	
۲۱	مذہب ایسانی (ESSENIO)	۱۹۳، ۱۴۱، ۱۳۶-۲۸، ۱۳۴، ۱۳۶-۲۹، ۱۲۴، ۱۲۳، ۱۰۴	
۱۲۷	مذہب بابی	۳۳، ۲۸۶، ۲۸۴، ۲۶۳، ۲۶۱، ۲۵۲-۵۵، ۲۲، ۲۱، ۱۹، ۱۳	
۲۰۲، ۹۶	مذہب حنبلی	۷۳۷-۳۰۳، ۲۲۵، ۲۲۱-۲۲، ۳۱، ۲۱، ۱۲، ۱۲، ۹، ۳، ۷	
۲۷، ۲۰۲	مذہب شافعی	۳۹۸، ۳۷۸، ۳۳۹، ۳۳۳-۳۵	

حکومت امویہ - خلافت امویہ ۶۹، ۶۷، ۵۸، ۳۴	۸۲	فقہ اسلامی
خلافت راشدہ ۳۵، ۳۱	۱۶۷، ۱۳، ۸۲	فقہ شافعی
خلافت عباسیہ - سلطنت عباسیہ ۱۸۸، ۸۵، ۶۹، ۶۷، ۳۱، ۲۱، ۱۸، ۱۳، ۷	۸۲	فقہ مالکی
خوارزمی سلطنت ۳۰، ۸	۱۲۸، ۱۲۸، ۱۲۵، ۱۲۳، ۱۱۹، ۲۱، ۱۱۱، ۸۴، ۲۹، ۲۵	فلسفہ ۲۵، ۲۹، ۸۴، ۱۱۱، ۲۱، ۱۱۹، ۱۲۳، ۱۲۵، ۱۲۸، ۱۲۸
دولت المغانیہ ۳۲۶	۳۹۷، ۳۳۵، ۱۸۲، ۱۵۶، ۱۴۴، ۲۶، ۱۳۲، ۱۳۱، ۱۳۸، ۳۹۸	
دولت مغلیہ ۳۳۳، ۳۲۹	۱۶۸	فلسفہ اخلاق
خقانیہ سلطنت ۳۳۳، ۳۳۲	۱۳۴، ۱۳۳، ۱۲۸، ۱۲۰، ۲۲، ۸۴، ۱۳۲، ۱۳۱، ۱۳۱	فلسفہ الہیات - الہیات ۸۴، ۲۲، ۱۳۲، ۱۳۱، ۱۳۱
سلجوقی سلطنت ۳۱۰، ۲۵۴، ۲۵۲	۷۶	فن اسما الرجال
عبیدی سلطنت (فاطمی) ۲۸۳، ۳۸۲	۸۵	مسئلہ عدل
لاطینی سلطنت ۲۵۵	۱۴۵	معقولات
ولایت انطاکیہ ۲۵۳	۱۴۲، ۱۴۱، ۱۳۳	منطقیات
عہد و ادوار:	۱۲۲، ۱۲۰، ۱۸۵، ۱۸۴	یونانی فلسفہ
زمانہ صحابہ ۸۰		زبان:
عہد اموی ۸۶، ۴۱، ۳۱-۳۳	۱۲۰، ۱۸۴	سریانی
عہد رسالت - عہد نبوت ۱۳۸، ۱۸، ۱۶۵، ۶۴	۱۲۰، ۱۲۶، ۱۲۵	سنکرت
عہد صدیقی ۸۶	۱۲۰، ۱۳۳	عربی
عہد عباسی ۳۰، ۶، ۲۰، ۶	۱۲۰	فارسی
سکے:	۱۲۰	یونانی
اشرفی	۳۳۳	سلطنتیں و حکومتیں:
		تاریخ سلطنت

۱۲۶، ۱۲۳، ۱۱۱، ۱۸۹، ۶۵	وحي	سنت ۱۰۴، ۱۰۲، ۹۸، ۹۴، ۹۲، ۱۸۹، ۳۹، ۳۱، ۲۹
۱۲۷	وضو	۳۰، ۵، ۲۸، ۵، ۲۸، ۳، ۲۳، ۲۳، ۲۳، ۲۳، ۲۳، ۲۳، ۱۱
	علوم و فنون:	۱۲۴
۱۳۳	اخلاقیات	۱۲۶، ۱۲۴
۱۰۸	اصول فقہ	۱۵۱
۱۴۲، ۱۳۳، ۱۲۲	ریاضیات	۶۹
۳۹۸	سائنس	۶۹
۲۶	سنکرت	۱۲۸
۱۳۳	سیاسیات	۱۲۷، ۱۲۴
۱۴۲، ۱۴۱، ۱۳۴، ۱۳۳، ۱۲۸، ۱۲۲	طبیعیات	۶۲
۱۲۰	علم الاضنام	۱۵۱
۱۳۶	علم تصوف	۱۲۴
۱۲۸، ۱۲۷، ۱۱۸، ۱۱۵، ۱۱۳، ۱۰۸، ۲۹، ۲۸	علم الکلام	۸۵
۱۸۶، ۱۸۴، ۱۶۳، ۱۵۵، ۱۵۴، ۱۴۵، ۱۴۱، ۱۳۳		۱۲۷
۳۸۲، ۳۶۸، ۳۶۵، ۳۶۴، ۳۶۲، ۳۳۵، ۱۸۷، ۳۹۸، ۳۹۲، ۳۸۳		۱۲۶، ۱۲۴، ۱۲۳
۱۲۸	علم ہیئت	۱۸۴، ۱۷۷، ۱۷۷، ۱۳۴
۲۸۷	علوم شرعیہ	۱۵۹، ۱۲۶، ۱۳۴
۱۸۹، ۱۳۲، ۱۲۸، ۱۲۲، ۱۱۳	علوم عقلیہ - عقلیات	۱۲۴، ۱۲۳، ۱۱۱، ۸۹، ۵۷، ۵۴، ۵۳، ۳۹، ۳۷، ۱۳۸، ۱۲۷، ۱۲۶
۱۹۱	علوم نقلیہ	۱۲۷
۱۹۰، ۱۸۹، ۱۲۸		نزول مسیح
۱۵۵، ۷۴، ۷۳، ۲۹	فقہ	۶۳-۶۶
		نفاق

۲۵۴	واقعہ ارتداد
۲۵۹	واقعہ حصن الکراد
۶۸	واقعہ کربلا
۲۶۴	جنگ حطین
۳۲۷	جنگ خارا
۲۵۹	معرکہ بقیعہ
دیگر متفرقات:	

۲۴-۲۶	بت - مورت
۲۸۴	جرم
۱۸۱	چقماق
۳۳	حجر اسود
۱۷۷	زقوم
۱۷۵	شترنج
۲۸۸	صلاة الرغائب
۳۲-۳۲	صلیب
۲۰۸	صنوبر
۷۰	عنبر
۷۵	فرسخ
۷۰	مشک
۲۸۲	ملوخیہ
۹۱	منجیق

۳۳۱	چاندی
۷۷، ۶۹، ۳۶	دینار
۶۹	روپیہ
۳۳۱، ۳۲	سونا
۶۹	قنطار
۷۷	گنی
نحرکات و سلاسل طرق:	

۲۸۵، ۱۲۲، ۱۲۱	اخوان الصفا
۱۱	جماعت اصلاح و تبلیغ لکھنؤ
۱۲۱	فری مشن
۲۲۱	سلسلہ قادریہ
۲۲۴	طریقہ سہروردیہ
اہم واقعات و معرکے:	

۱۴۶	آتش نمرود
۱۲۶	ذبح ابراہیمؑ
۱۲۶	طوفان نوحؑ
۱۲۶	عصائے موسیٰؑ
۱۰۳	فتنہ اعتراض ال
۱۲۳	فتنہ باطنیت
۳۰۳، ۱۹	فتنہ تاتار
۹۵، ۹۴، ۹۱، ۹۰، ۱۸۴	فتنہ خلق قرآن